مقالہ پلاٹینم جوبلی مجلس خدام الاحمدیہ

مذاہب عالم میں مرد و زن کے حقوق
اور
اسلامی تعلیمات کے امتیازات

مقالہ نگار

محمد کاشف خالد
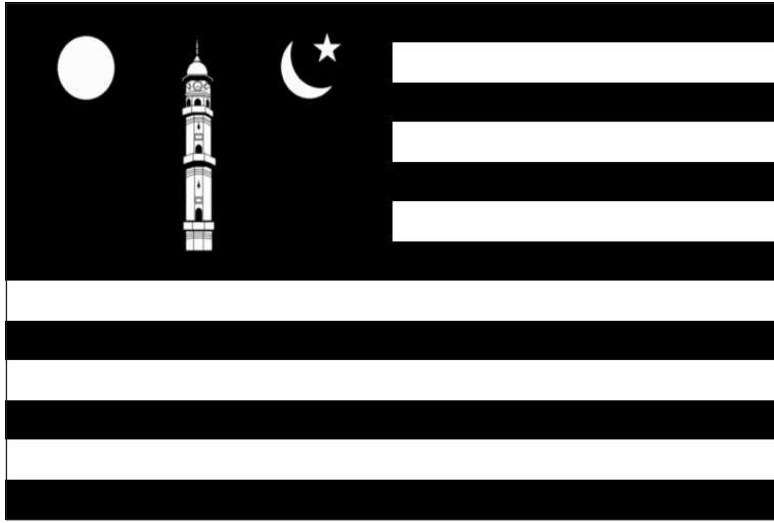
مجلس خدام الاحمدیہ قادیان دارالامان

{......فہرست عناوین......}

محمد کاشف خالد

ولد ولوی عطاء الرحمٰن صاحب خالد

مجلس خدام الاحمدیہ قادیان، حلقہ دارالسلام کوٹھی

فون نمبر:- 8699360396

kashifqdn@gmail.com

www.deathofjesus.tk

پیش لفظ

خالق ارض وسماء خداوند قادر و یگانہ نے انسان کو اس دنیا میں اپنی عبادت کے واسطے پیدا کیا (الذاریات 57) نیز اس کی آزمائش کے لئے شیطان کو بھی مہلت دی کہ وہ داعی الی الشر بن کر انسان کو اُس کے فرض اوّل یعنی عبادت الٰہی سے دور رکھے۔مگر دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو بے یارو مددگار نہیں چھوڑا بلکہ فرشتوں کو بھی پیدا کیا جو کہ داعی الی الخیر ہیں۔اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے انسانوں میں سلسلۂ نبوت کو جاری فرمایا تا کہ انسانوں میں سے ہی بعض ایسے وجود بھی ہوں جو رحمانی افضال کو جذب کر کے دیگر عوام الناس کو بھی اس سے مستفیض کرائیں اور انہیں خدا کا عاشق بناتے ہوئے انہیں اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کرنے والا بنائیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو کہ ربُّ العٰلمین ہے، دنیا کے ہر خطہ میں بسنے والے لوگوں کے لئے مختلف اوقات میں مختلف انبیاء کو بھیجا تا کہ کوئی بھی انسان اس آسمانی ہدایت کے واحد ذریعہ سے محروم نہ رہ جائے۔اور مرور زمانہ کے ساتھ بالآخر وہ دور بھی آ گیا جب اللہ تعالیٰ نے سلسلہ نبوت کے شہنشاہ اور تخلیق ارض وسماء کے موجب خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل و آخری شریعت قرآن کریم کے ساتھ انسان کی کامل راہنمائی کے لئے مبعوث فرمایا۔

چنانچہ انبیاء نے جہاں بنی نوع انسان کو اپنے خالق حقیقی سے ملایا اور اسکا حقیقی عبد بنایا وہیں دوسری طرف انہوں نے انسانوں کو زندگی گزارنے اور ایک دوسرے سے حسن سلوک کرنے کا وہ طریق کار بھی سکھلایا جو ان کی فطرت اور قویٰ کے مناسب اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت شدہ تھا۔ایسا اسلئے تھا کیونکہ خدا تعالیٰ سے دور جانے اور شیطانی راہوں کی پیروی کرنے کے باعث ہمیشہ یہ اشرف المخلوقات حقیقی تہذیب سے بھی دور چلا جاتا ہے اور اس کی سوچ اور اخلاق ایسے ہو جاتے ہیں کہ اس میں اور ایک وحشی میں کچھ فرق نہیں رہتا اور انسان ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کو بھول جاتا ہے۔پھر انبیاء ہی اسے یہ سب یاد دلواتے ہیں اور اسے عملی طور پر

اشرف المخلوقات بناتے ہیں۔اسطرح انسان حقوق وفرائض کے دائرہ میں رہ کرزندگی گزارتا ہے اور اپنی تہذیب وتمدن میں ترقی کرتا ہے۔اور اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے والی زندگی گزارتا ہے۔اور جولوگ ان انبیاءؑ کے منکر ہوتے ہیں وہ پھراس آسمانی ہدایت سے

تمام انبیاء نے اپنے جملہ فرائض کو پورا کیا اور ان میں سے جوتشریعی نبی تھے انہوں نے خدا تعالیٰ سے حاصل کردہ شریعت کو انسانوں تک پہنچایا اور انہیں زمانہ کے مناسب حال زندگی گزارنے کا طریق کارسکھایا،اوران میں سے جوغیرتشریعی نبی تھے انہوں نے انسانوں کواس گزشتہ شریعت کی راہ پر چلایا جسے وہ بھول چکے تھے۔چنانچہ تمام انبیاء میں سے افضل وارفع نبی بانی اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے انسانوں کوسب سے اعلیٰ وانسب تعلیم اسلام کے رنگ میں دی اور جہاں انہیں خالق حقیقی سے ملنے کا سب سے اکمل راہ سکھلایا وہیں انہیں زندگی گزارنے کا سب سے حسین وجمیل طریق بھی بتلایا۔خدا کے تمام ماموراور مرسل ہمیشہ دنیا میں خالق اور مخلوق میں تعلق استوار کرنے ،انکے حقوق قائم کرنے اورحقوق میں توازن پیدا کرنے کے لئے تشریف لاتے رہے لیکن انبیاء میں سب سے بڑھ کر یہ حق سید الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کئے۔آپؐ نے ہمیں سبق دیا کہ مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کو وہی بندہ زیادہ پیارا ہے جسے خدا کی مخلوق پیاری ہے اور جوان سے حسن سلوک کرتا ہے۔آپؐ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ روز محشر جب حساب کتاب ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں غفلت کوتو معاف بھی کردیگا مگر خدا کے خلق خدا کے حقوق میں کوتاہی کے ازالہ اور تدارک کی ہدایت ہوگی۔آپؐ کی بعثت تواس دور میں ہوئی تھی جب ظلم وفساد اپنی عروج پر تھا اور ساری دنیا ظلمت میں غرق تھی جیسا کہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

بود وقتِ ظہورآن جوّاد   ہمہ عالم پُرازموادِفساد

(درِّ مکنون صفحہ ۱۱۸)

یعنی اس جوادرسول کے ظہور کا وقت تھا اور تمام عالم فتنہ وفساد سے پُرتھا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

آپؐ کو تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا تھا۔

لیکن آپؐ نے انہی جہلاء میں سے بعض کو اپنی قوت قدسیہ سے پاک کر کے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلا کر آسمان علم وعرفان کے ستارے بنا دیا۔اور انہیں حقوق اللہ وحقوق العباد کی بجا آوری کی وہ تعلیم دی کہ انہوں نے اپنے معاشرہ کو جو پہلے جہالت کے عروج پر تھا حسین ترین معاشرہ بنا دیا۔

چنانچہ اسلام نے مردوزن کے وہ حقوق قائم کئے جو دیگر مذاہب میں یا تو مفقود تھے اور یا ناقص تھے۔اسلام نے ایک ایسے حسین معاشرہ کی بنیاد رکھی جس میں مردوزن کے مساوی حقوق کے علاوہ نسلی وملکی امتیازات سے دور عرب وعجم کے لئے یکساں حقوق مقرر ہیں۔اسلامی تعلیم نے جہاں حقوق اللہ میں اپنا اعلیٰ مقام ثابت کر دکھلایا وہیں حقوق العباد کی تعلیم میں بھی دیگر مذاہب کو پیچھے چھوڑ دیا۔اسلام نے تمام طبقات کے حقوق کو متعین کیا ہے جبکہ عام معاشرہ دنیا میں حقوق انسانی کو پامال کر رہا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ آپؐ نے نہ صرف یہ کہ مخلوق خدا کے حقوق ادا کئے بلکہ اس کے ساتھ ''حسن سلوک'' کا ارشاد فرمایا بلکہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے حسن سلوک کو احسان تک پہنچا دیا۔لیکن یہ سارا ارتقائی سلسلہ صرف جسمانی نہیں تھا بلکہ آپؐ نے اس کو روحانی کیفیت میں لے لیا اور بنی نوع انسان کے لئے آپؐ کا دل گداز ہونے لگا اور انہیں انتہاؤں کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (سورۃ الشعراء:۴)

دوسری طرف آپؐ مومنوں کی تکالیف پر بھی بے چین ہو جاتے تھے۔حقوق العباد کے لئے آپؐ نے ساری عمر جدوجہد فرمائی جس کی وجہ سے معاشرہ میں ایک عالمگیر انقلاب برپا ہوا جس کی مثال مذہب کی تاریخ میں ناپید ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نازل فرمایا ہے یہ اس کی آخری اور کامل کتاب ہے اور اس میں ہماری ساری دینی، اخلاقی اور رُوحانی ضرورتوں کو اصولاً واجمالاً پورا کیا گیا ہے۔قیامت تک بنی

نوع انسان کو جو بھی مسائل درپیش ہو سکتے ہیں ان کا حل قرآن کریم میں موجود ہے۔ پس قرآن کریم ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں ہر طرح کے خوبصورت اور خوشبودار پھل جمع کر دئے گئے ہیں۔ کوئی ایسی صداقت نہیں جو قائم رہنے کے لائق ہو اور وہ قرآن کریم میں محفوظ نہ کر دی گئی ہو۔ مردوزن کے جو جائز حقوق ہیں جن کے قیام سے حسین معاشرہ کی بنیاد ڈل سکتی ہے اسکا تفصیلی ذکر بھی قرآن حکیم میں موجود ہے۔ چنانچہ تمام الہامی کتب کی وہ پاک تعلیمات جو وقتی طور پر فائدہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل سبق اپنے اندر رکھتی تھیں یا انبیاء کے واقعات جو ہمیشہ سعید فطرت انسانوں کے لئے درس عبرت رکھتے ہوں، وہ سب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جمع کر دئے ہیں۔

جس طرح قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے انسانوں کی مکمل ہدایت اور راہنمائی کی غرض سے نازل فرمایا ہے اسی طرح اس ہدایت کی تعلیم دینے، اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی حکمتیں بیان فرمانے کے لئے قیامت تک کے لئے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم (571ء-632ء) کو اُسوۂ کامل بنا کر مبعوث فرمایا اور قرآن کریم کے معارف اور اس کی حکمتیں آپؐ کے قلبِ مطہّر پر روشن فرمائیں چنانچہ خود قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق انسانی زندگی کو عمل کے جس ڈھانچہ میں ڈھلنا چاہئے اس کی اکمل اور احسن تصویر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار میں موجود ہے جس کی تقلید اُمّتِ محمدیہ کے لئے قیامت تک واجب قرار دی گئی ہے۔ اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(سورۃ الاحزاب آیت ۲۲)

یقیناً تمہارے لئے یعنی ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اخروی دن سے ملنے کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کا بہت ذکر کرتے ہیں اللہ کے رسول میں ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس کی انہیں پیروی کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جس مذہب کی بنیاد رکھی اسکا نام قرآن مجید میں ''اسلام'' اور اس میں شامل ہونے والوں کا نام مسلمان رکھا۔ جیسا کہ فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَام

(آل عمران آیت ۱۹)

یعنی یقیناً دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ

(الحج آیت ۷۹)

یعنی یقیناً اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔

یقیناً اسلام کی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر مشتمل روحانی و اخلاقی تعلیمات انسانوں کے دلوں پر اثر کرنے والی ہیں۔ آیئے اب ہم بتفصیل اسلام کی تعلیمات کا ملاحظہ کرتے ہیں۔

انسانی حقوق کی اہمیت و اقسام

انسانی حقوق کی اہمیت

اس دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے کچھ حقوق لے کر پیدا ہوتا ہے،لیکن دنیا نے یہ حقوق کبھی اسے دئے اور کبھی یہ ان سے محروم رہا۔کسی کو ان حقوق سے محروم رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے یہ حقوق بہت ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان ہی سے اس کی عظمت اور ترقی وابستہ ہے۔یہ اسے رفعت اور بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔یہ اس سے چھن جائیں تو وہ ذلت اور پستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور اسکی ترقی کے سارے امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ یہ حقوق کیا ہیں اور کیا سب انسانوں کے یکساں حقوق ہیں یا ان کے درمیان فرق ہے؟ یہ حقوق کیسے حاصل کئے جائیں اور ان کے تحفظ کی کیا صورت ہے؟ موجودہ دور میں یہ سوال۔بعض تاریخی اسباب کی بناء پر پوری فضا میں گشت کر رہا ہے اور ہر طرف اس کی گونج سنائی دے رہی ہے۔مختلف ملکوں میں ان حقوق کی صورتِ حال دیکھی جاتی ہے،اس کا جائزہ اور نقد و احتساب ہوتا ہے،معاشرہ میں ان کا شعور پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے،قانون اور عدالت کے ذریعہ ان کی حفاظت کے اقدامات کئے جاتے ہیں،اس کے لئے سماجی،معاشی اور سیاسی قوت بھی استعمال میں لائی جاتی ہے،قانون اور عدالت کے ذریعہ ان کی حفاظت کے اقدامات کئے جاتے ہیں۔ان کوششوں کی اہمیت اور قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔بعض اوقات ان کے بہتر نتائج بھی دیکھنے میں آتے ہیں،لیکن اس کے ساتھ یہ سوال بھی بار بار پوری شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ یہ کوششیں کس حد تک غیر جانبدار اور تعصب وتخریب سے پاک ہیں؟ عالمی سطح پر حقوق انسانی کے نگراں ان کوششوں کو حقوق کی پامالی کا بہانہ تو نہیں بنا رہے ہیں؟

حقوق انسانی سے متعلق ایک بات یہ بھی واضح ہے کہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں (سوائے اُسکے جو اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہو) جو جنبہ دار نہ ہو۔کسی سے اس کو عداوت ہوتی ہے کسی کو محبت۔کسی کو اپنا سمجھتا ہے کسی کو غیر۔اسی طرح انسان جزبات کا غلام بھی ہوتا ہے۔اسلئے انسانی قوانین میں ہمیشہ یہ نقص ہوتا ہے کہ بعض کے حقوق تلف کئے جاتے ہیں اور بعض کو زیادہ حقوق دئے جاتے

ہیں۔پس وہ قانون، جس میں سب کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔نہ کسی کے حق میں کمی کی جائے اور نہ ہی کسی کا حق لے کر دوسروں کو دیا جائے صرف اللہ تعالیٰ ہی بنا سکتا ہے جو مخلوق کی مدد کا محتاج نہیں اور سب ہی اس کے بندے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے یہ قانون قرآن کریم کے رنگ میں اور اسلام کے ذریعہ قائم فرما دیا ہے۔یہ ایک زبردست سچائی ہے۔

حقوقِ انسانی کے سلسلہ میں اسلام کا تصور بہت ہی واضح اور اسکا کردار بالکل نمایاں ہے اسلام نے فرد اور جماعت اور مختلف سطح کے افراد اور طبقات کے حقوق کا تعین کیا ہے اور عملاً یہ حقوق فراہم بھی کئے ہیں۔جن افراد اور طبقات کے حقوق ضائع ہو رہے تھے ان کی نصرت اور حمایت میں کھڑا ہوا اور جو لوگ ان حقوق پر دست درازی کر رہے تھے ان پر سخت تنقید کی اور انھیں دنیا اور آخرت کی وعید سنائی، معاشرہ کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کی تعلیم و ترغیب دی اور ہم دردی و غم ساری کی فضا پیدا کی۔

قرآن مجید انسانی حقوق کی ان کوششوں کی اساس ہے اور احادیث میں ان کی قولی و عملی تشریح موجود ہے۔قرآن و حدیث کا اندازِ بحث و نظر مروّجہ قانونی کتابوں کا سا نہیں ہے۔قانون کی کتابیں حقوق کا دفعہ وار ذکر کرتی اور حسب ضرورت ان کی تشریح کرتی ہیں۔قرآن مجید کا طرزِ گفتگو اخلاقی بھی ہوتا ہے اور قانونی بھی۔وہ جب اخلاق کا ذکر کرتا ہے تو ادائے حقوق کو سیرت و اخلاق کے لازمی تقاضے اور اور اعلیٰ کردار کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔قرآن ان لوگوں کی ستائش اور تعریف کرتا ہے جو ہر ایک کا حق ادا کرتے ہیں اور انہیں دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کی بشارت دیتا ہے اور جہاں ظلم و ستم و حقوق کی پامالی ہو وہ اسکے سنگین نتائج سے آگاہ کرتا اور اس پر جہنم کی وعید سناتا ہے۔اس کے ساتھ وہ ان حقوق کا قانونی الفاظ میں بھی ذکر کرتا ہے۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی حق کا صرف ایک ہی جگہ ذکر کرے بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کا ایک پہلو ایک جگہ اور دوسرا پہلو دوسری جگہ بیان کرتا ہے۔

احادیث کا بھی یہی انداز ہے۔اسلئے کسی حق کو جاننے کے لئے پورے قرآن اور ذخیرۂ

حدیث کو دیکھنا پڑتا ہے۔ مسلمان فقہاء کرام نے تفصیل سے اس پر غور کیا ہے اور حقوق کے تعین کی اپنے دور کے حالات وظرف کے مناسب حال سے کوشش کی ہے۔ اسلامی قانون کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

حقوق دو قسم کے ہیں۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد۔ ان دونوں حقوق کی ادائیگی ضروری ہے اور جب ان دونوں حقوق میں توازن ہو تب ہی انسان کا ایمان مکمل ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے گا اپنے حقوق تو معاف کر دیگا لیکن جس نے کسی بندے کے حقوق تلف لئے ہوں گے ان کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریگا جب تک کہ وہ بندہ خود معاف نہ کردے۔ اس حدیث سے حقوق العباد کی اہمیت اور مقام واضح ہو جاتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی کما حقہٗ ادا کئے جائیں۔

نیز اسلامی تعلیمات کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ اس نے پہلے ہی سے بتادیا کہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کمزوروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے اور اپنے پیاروں کے حقوق کو بڑھوانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اور ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اختیار میں دنیا آتی ہے وہ کسی صورت میں اُن لوگوں کے ساتھ جو اُن کے ماتحت ہوں ان اختیارات کو جو انہیں حاصل ہو چکے ہوں تقسیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسلام نے اس کا علاج بھی بتادیا اور وہ انبیاء کی بعثت ہے جو کہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت پا کر ایسے لوگوں کے قبضہ سے دنیا کو نکال کر عزت اور رتبہ کو لیاقت اور قابلیت اور بنی نوع انسان کی مساوات کی بنیاد پر رکھنے کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے حَکَم وعدل حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی معہودؑ فرماتے ہیں :

’’خدا تعالیٰ نے دو ہی قسم کے حقوق رکھے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ جو شخص حقوق العباد کی پرواہ نہیں کرتا وہ آخر حقوق اللہ کو بھی چھوڑ دیتا ہے کیونکہ حقوق العباد کا لحاظ رکھنا یہ بھی تو امرِ الٰہی ہے جو حقوق اللہ کے نیچے ہے۔‘‘

(ملفوظات جلد چہارم صفحہ ۲۷۰)

نیز ایک جگہ آپؑ حقوق العباد کو وحدانیت کے ساتھ جوڑ کر اس کی اہمیت سمجھاتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ:

''خدا کے واحد ماننے کے ساتھ یہ لازم ہے کہ اس کی مخلوق کی حق تلفی نہ کی جائے۔ جو شخص اپنے بھائی کا حق تلف کرتا ہے وہ لا الٰہ اِلّا اللہ کا قائل نہیں۔''

(بدر ۱۸ مارچ ۱۹۰۹ء)

پھر ایک جگہ فرمایا:۔ ''حق العباد کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرنا اور کسی کے حقوق میں دست اندازی نہ کرنا۔ جہاں اس کا حق نہیں ہے جھوٹی گواہی نہ دینا وغیرہ۔''

(ملفوظات جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۹)

حقوق انسانی کے متعلق قرآنی تعلیم یہ بھی ہے کہ:

اِنَّ اللہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبیٰ

(النحل آیت ۹۱)

اسکی تشریح کرتے ہوئے امام الزمان سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودؑ فرماتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم لوگوں سے عدل کرو پھر اس سے بڑھ کر فرمایا کہ احسان کرو یعنی صرف اُس سے ہی نیکی نہ کرو جس نے تم سے نیکی کی ہو بلکہ احسان کے طور پر بھی جو کہ کوئی حق نہ رکھتا ہو کہ اس سے نیکی کی جاوے اس سے بھی نیکی کرو۔ پھر حقوق العباد کے اعلیٰ معیار کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آگے فرمایا کہ احسان سے بھی آگے بڑھو اور ترقی کر کے ایسی نیکی کرو کہ وہ ایتاءِ ذی القربیٰ کے رنگ میں رنگین ہو یعنی جس طرح ایک ماں اپنے بچے سے نیکی کرتی ہے۔ ماں کی اپنے بچے سے محبت ایک طبعی اور فطری تقاضا پر مبنی ہے نہ کہ کسی طمع پر۔''

(ملفوظات جلد ۱۰۔ صفحہ ۴۱۵)

انسانی حقوق کی اقسام

حقوق انسانی کی اہمیت سمجھنے کے بعد اس کی اقسام پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے

بارے میں جاننے کے بعد ہی ہم اسلام اور دیگر مذاہب کی تعلیمات کے درمیان موازنہ کر سکتے ہیں کہ کس مذہب نے کس حد تک انسان کو اس کے حقوق دلوائے ہیں اور ایک حسین معاشرہ کی بنیاد رکھنے کے سامان مہیا کئے ہیں۔ پس واضح ہو کہ انسانی حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں:۔

(۱) ایک وہ حقوق ہیں جو حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں جیسے کہ مثلاً عدل وانصاف کا قیام یا قومی عہدوں کی تقسیم وغیرہ۔

(۲) دوسرے وہ حقوق ہیں جو یا فطری اور قدرتی رنگ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے جسمانی طاقتیں اور دماغی قویٰ وغیرہ اور یا وہ انفرادی کوشش اور انفرادی جدو جہد کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے دولت یا مکسوب علم وغیرہ۔

ان دونوں قسم کے حقوق کے بارے میں ہمیں تمام مذاہب میں تعلیمات نظر آتی ہیں اور ان میں سے بعض تعلیمات یقیناً نہایت اچھی اور قابل تعریف بھی ہیں لیکن جس قدر تفصیل سے اور پُر حکمت طریق سے انسانی حقوق کے بارے میں اسلام نے تعلیم دی ہے اسکی نظیر ہمیں دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ اسلام نے جو ان حقوق کے بارے میں اصول بیان کئے ہیں وہ یقیناً کامل ہیں۔ اسلام نے نہایت حکیمانہ طریق پر ان دونوں قسم کے حقوق میں اصولی فرق ملحوظ رکھا ہے یعنی جہاں تک اُن انسانی حقوق کا تعلق ہے جو حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں اسلام نے اُن میں کامل مساوات قائم کی ہے اور مختلف قوموں اور مختلف انسانوں میں قطعاً کوئی فرق پیدا نہیں ہونے دیا، جیسا کہ آگے اس مقالہ میں اس کا تفصیلی ذکر آئے گا انشاءاللہ۔ لیکن جہاں دوسری قسم کے حقوق کا دائرہ شروع ہوتا ہے جو فطری قویٰ اور انفرادی جدو جہد سے تعلق رکھتے ہیں وہاں اسلام نے ایک مناسب حد تک دخل دے کر مختلف طبقات اور مختلف افراد کے فرق کو سمونے کی تو ضرور کوشش کی ہے لیکن ظلم و جبر کے رنگ میں سارے فرقوں کو یکسر مٹانے کا طریق اختیار نہیں کیا اور یہ طریق یقیناً انسانی فطرت کے موافق نہیں ہے۔ اور حق یہ بھی ہے کہ اِس میدان میں سارے فرقوں کو مٹانا ممکن بھی نہیں ہے۔ مثلاً جسمانی طاقتوں کے فرق کو کون مٹا سکتا ہے؟ دماغی

قوتوں کے فرق کو کون مٹا سکتا ہے؟ اور جب یہ فرق نہیں مٹائے جا سکتے تو ظاہر ہے کہ اِن فرقوں کے طبعی نتائج بھی نہیں مٹائے جا سکتے۔ ہاں چونکہ انسان مدنی الاصل صورت میں پیدا کیا گیا ہے اور اس کی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم جنس لوگوں کے ساتھ مل کر اور جہاں تک ممکن ہو اُن کے لئے قربانی کرتے ہوئے زندگی گزارے اس لیے اسلام نے یہ ضرور کیا ہے کہ انسان کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اُس سے بعض قومی ضرورتوں کے لیے قربانیوں کا مطالبہ کیا ہے اور اس مطالبہ کو اُس انتہائی حد تک پہنچا دیا ہے جو ایک انسان کی انفرادیت کو مٹانے اور ظلم کا طریق اختیار کرنے کے بغیر اس کے ارد گرد کے معاشی طور پر گرے ہوئے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اوپر اٹھانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اسلامی مساوات اور اشتراکیت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے بشرطیکہ کوئی شخص دیانت داری کے ساتھ اسے سمجھنے کے لئے تیار ہو۔ پس اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام ایک وسطی نظریہ پیش کرتا ہے اور اسلام کی تعلیمات ایسی ہیں کہ اگر ان پر مکمل طور پر عمل کیا جائے تو ایک ایسے معاشرہ کی بنیاد پڑتی ہے جس میں تمام مرد وزن کو اُن کے واجب حقوق مساوی طور پر ملتے ہوں۔

انسانی حقوق کا تصور
تاریخی پس منظر

انسانی حقوق کا تصور (تاریخی پس منظر)

اس دنیا میں طاقتور اور کمزور دونوں طرح کے انسان کل بھی تھے آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ طاقتور اپنی طاقت کا ناجائز استعمال نہ کرے اور کمزوروں کے ساتھ محبت،تعاون دست گیری اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرے۔جو طاقتور ہے اسکی طاقت کمزور کی کمزوری رفع کرنے اور اُسے اوپر اٹھانے اور اُسے دنیا کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کے قابل بنانے میں صرف ہو۔لیکن ماضی کی شہادت اور حال کا مشاہدہ یہ ہے کہ زیادہ تر حالات میں فطرت کا یہ مطالبہ پورا نہیں ہوا۔اکثر دنیا میں طاقتور کے ہاتھ میں بے شمار حقوق اور اختیارات جمع ہوتے چلے گئے اور کمزور کو ان کا بہت تھوڑا حصہ ملا ، یا بالکل ہی نہیں ملا۔اکثر طاقتور کو طاقت کے نشہ میں اپنی ذمہ داریاں یاد نہیں رہیں اور کمزور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔طاقتور نے اپنے حقوق کا بے تحاشا استعمال کیا اور کمزور اپنی محرومی پر آنسو بہاتا رہا۔کبھی تو اُسے مضبوط اور طاقتور ہاتھوں نے اس طرح دبایا اور کچلا کہ سسکنے،تڑپنے اور فریاد کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔اس طرز عمل کا ایک شاخسانہ یہ رہا کہ مختلف ادوار میں اور زمین کے مختلف خطوں میں اصحابِ حقوق اور اصحابِ فرائض کے مستقل طبقات وجود میں آتے چلے گئے۔ایک طرف وہ گروہ تھا جو گردوپیش کے تمام وسائل کا مالک ومختار تھا اور دوسری طرف وہ جماعت تھی جو کہ ہر ایک چیز سے بالکل ہی محروم تھی۔ایک جانب آسائش اور راحت اور عیش وعشرت کا رقص جاری تھا اور دوسری جانب زندگی اپنے وجود اور بقا کے لئے تڑپ رہی تھی ۔طاقتور طبقہ کے ہاتھ میں اقتدار ،حکومت،قانون ،علم وفن،وسائلِ معیشت اور تہذیب و معاشرت سب کچھ تھا۔اسی طبقہ سے فرماں روانِ مملکت، امراء ورؤسائے سلطنت،فوجی جرنیل ،علوم وفنون کے ماہر،تہذیب کے معمار اور سماج کے صورت گر پیدا ہوئے اور ہر در و بام کے مالک بن بیٹھے۔اس کے مقابل کمزور طبقہ ان میں سے کسی بھی چیز کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔وہ زندہ بھی تھا تو اس لئے کہ طاقتور طبقہ کو اس کی ضرورت تھی۔وہ بے روح مشین کی طرح اس کی

قوت میں اضافہ کا سبب بنا رہا۔ طاقتور ایسے بہت سارے حقوق کا مالک بن بیٹھا جن کے لئے کوئی وجہ جواز فراہم نہیں کی جاسکتی۔ اور کمزور اپنے جائز حقوق سے بھی محروم تھا۔ وہ ان کے لئے جدّوجہد کیا کرتا وہ تو ان کا نام بھی اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ بعض اوقات اس کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا چلا گیا کہ دونوں طبقات نے اسے قانونِ فطرت سمجھ لیا۔ طاقتور طبقہ نے سمجھا، یا اسے باور کرادیا گیا کہ جو کچھ اسکے پاس ہے اس کے ذاتی استحقاق کی بنا پر ہے اور بلا شرکت غیر ہے۔ وہ اسکا مالک ومختار ہے اور کمزور طبقہ اپنی محرومی پر قانع اور صابر ہوتا چلا گیا کہ یہی خدا کی طرف سے اسکی قسمت میں ازل سے لکھا گیا ہے۔ کبھی انکے درمیان کشمکش اور تصادم بھی رہا، بغاوت بھی ہوئی ہے، لیکن صورت حال میں بہت زیادہ تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ تصور جتنا بھیانک ہے اسی قدر بھیانک یہ سوال ہے کہ کیا نوع انسان کی تاریخ ظلم وستم سے ہی بھری ہوئی تاریخ ہے؟ کیا اس نے عدل وانصاف اور فضل واحسان کی فصل بہار کبھی نہیں دیکھی؟ کیا اس طویل مدت میں اولادِ آدم کی اکثریت اپنے حقوق سے بے خبر اور نا آشنا ہی رہی یا ان سے محرومی ہی اس کے حصہ میں آئی؟ کیا ان حقوق کی حمایت میں کبھی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور ان کے لئے جدوجہد کرنے والے اور حقدار کو اسکا حق دلانے اور اسے ادا کرنے والے پیدا نہیں ہوئے؟

اسکا جواب یہ ہے کہ دنیا نے عدل وانصاف کی مثالیں ضرور دیکھی ہیں اور ان میں سب سے اعلیٰ واکمل مثال ہمارے پیارے آقا ومتاع سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی ہے جو اسلام کے رنگ میں ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ دنیا میں زیادہ تر ظلم کی تاریخ ہی رقم ہوئی ہے۔ اور اکثر اصحابِ اقتدار اور طاقتور طبقات اسکے سیاہ اوراق میں اضافہ کرتے ہی رہے ہیں۔ اسکے نتیجہ میں زیادہ زمانہ نہیں گزرا صرف چند صدی قبل ہی حقوق انسانی کا تصور دنیا میں شدت سے ابھرا ہے۔ چنانچہ اسکے لئے جدوجہد شروع ہوئی اور اس نے بہت جلد ایک عمومی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ اور یورپ اور آج خصوصاً امریکہ اس کے علمبردار

بنے ہوئے ہیں حالانکہ حقوق انسانی کا حقیقی مفہوم دنیا کے سامنے اسی دن آچکا تھا جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے آخری شریعت یعنی اسلام کو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں قائم فرمایا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی معلوم تاریخ میں اور مذہبی کتابوں میں انسان کے بنیادی حقوق کے حوالے تو ملتے ہیں لیکن انھیں اس نام سے یاد نہیں کیا جاتا ہے۔جدید دور کے مؤرخین کے نزدیک حقوق انسانی کے تصور سے دنیا Magna Carta (منشور اعظم) کے ذریعہ روشناس ہوئی۔یہ شاہ برطانیہ جوہن John کے دور میں 15 جون 1215ء کو منظور ہوا تھا۔لیکن اس منشور کے بارے میں یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اسکے ذریعہ برطانیہ کے عوام کو شخصی اور سیاسی آزادی حاصل ہوگئی۔درحقیقت یہ محض بادشاہ سے بعض طبقات کے حقوق پر غور کرنے کی درخواست تھی اس سے زیادہ اسکی کوئی بھی حیثیت نہیں تھی۔مغربی ممالک میں اس سلسلے کی اور بھی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً

☆ شاہ کانکرڈ ثانی Concard II نے ایک مشور کے ذریعہ پارلیمنٹ کے اختیارات متعین کئے۔

☆ ۱۱۸۸ء میں شاہ الفانسونہم Alfanso IX سے حبس بے جا کے عدم جواز کا اصول تسلیم کرایا گیا۔

☆ ۱۷۶۲ء میں فرانس کے معروف مفکر Rousseaue نے معاہدۂ عمرانی لکھی اسے انقلابِ فرانس کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔اسکی بنیاد پر ۱۷۸۹ء میں فرانس کا منشور حقوق انسانی Declaration of the Rights of Man ظہور میں آیا۔

☆ ۱۷۷۶ء میں امریکی ریاست ورجینا Vergina میں منعقدہ اجتماع نے George Mosin کا مرتب کردہ منشور حقوق انسانی منظور کیا۔

اس سلسلہ کی اور بھی نمایاں کوششیں ہیں ۔اقوام متحدہ United Nations نے بھی مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں قرار دادیں منظور کیں ۔آخر میں ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اس نے عالمی منشور حقوق انسانی The Universal Declaration of Human Rights پاس کیا۔دنیا کی بیشتر قوموں نے اس کی تائید کی ،جن قوموں نے تائید نہیں کی اُنہوں نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔پس اس پہلو سے اسے اقوام عالم کا متفقہ منشور کہا جاسکتا ہے۔آج دنیا میں کوئی بھی حکومت اس کا انکار یا مخالفت نہیں کر رہی ہے۔اسے حقوقِ انسانی کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم سمجھا جاتا ہے۔دنیا کے دانشوروں اور مدبّرین نے بڑے غور وخوض کے بعد دنیا میں امن وصلح قائم کرنے کے لئے جو اصول اس منشور میں منظور کئے ہیں ان کی بنیاد مساوات انسانی ،آزادئ ضمیر اور مذہب کی آزادی پر ہی رکھی ہے جس کو اسلام نے چودہ سو برس پہلے ہی بیان کیا تھا۔اس منشور کی دفعہ ۱، ۲ اور ۸ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں اسلامی تعلیمات کو اپنانے کی ہی جھلک نظر آئے گی۔

حقوق انسانی کے اس عالمی منشور میں فرد کی آزادی،عدل وانصاف اور مساوات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔یہ معاشی ،سماجی اور ثقافتی حقوق کے ساتھ سیاسی حقوق کا بھی احاطہ کرتا ہے اس میں ہر فرد کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ مساوات ہو،کسی کو اس سے برتر یا اسے کسی سے کم تر نہ سمجھا جائے ،اسے جان اور مال کا تحفظ حاصل ہو،اس پر کسی قسم کا جبر وتشدد نہ روا رکھا جائے اور اسے عدل وانصاف ملے۔اسی طرح عقیدہ اور مذہب،اظہار خیال، تنظیم اور جماعت سازی،سفر اور نقل مکانی،اپنی مرضی سے شادی بیاہ اور خاندان بسانے کو اس کا حق مانا گیا ہے تعلیم اور حکومت میں شرکت ،ملازمت،راحت اور آرام ،خلوت اور نجی زندگی میں عدم مداخلت کو بھی اس کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔

اس منشور کی یہ خوبی سمجھی جاتی ہے کہ یہ فرد کو اس کے بنیادی حقوق فراہم کرتا ہے اور اس میں حکمراں طبقہ کے ظلم وستم سے شہریوں کو محفوظ رکھنے کی تدبیر کی گئی ہے۔عوام کو طاقت کا سر چشمہ اور

حکمرانوں کو ان کے سامنے جواب دہ قرار دیا گیا ہے۔عدل و انصاف کے حصول کو آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ فرد کو تعلیم ،ترقی اور خوش حالی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

لیکن اس منشور کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں بعض بنیادی خامیاں بھی ہیں۔اور ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ان خامیوں کی وجہ سے اس سے متوقع نتائج برآمد نہیں ہو پا رہے ہیں اس منشور کے پیچھے کوئی قوتِ نافذہ نہیں ہے۔دوسرے لفظوں میں کوئی ایسی بالاتر قوت نہیں ہے جو کسی قوم کو اس کا پابند بنائے۔اس پہلو سے بعض اوقات اس کی حیثیت محض پند و نصیحت اور اخلاقی تلقین کی ہو کر رہ جاتی ہے۔چنانچہ ان ممالک میں بھی جو اسے ایک مقدس صحیفہ سمجھتے اور اسکے گن گاتے رہتے ہیں ،حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے واقعات بہ کثرت ہوتے رہتے ہیں۔ان حقوق کی نگرانی کرنے والے دنیا میں بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں اور مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان میں سے ایک European Court of Human Rights ہے۔اس میں یورپ کے ممالک حقوق انسانی کی پامالی کے مقدمات درج کراتے رہتے ہیں۔ان کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔

ان مہذب ممالک میں داخلی طور پر حقوق انسانی کی خلاف ورزی جس پیمانہ کی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ بین الاقوامی سطح پر وہ اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔طاقتور اقوام کو،جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے ،ان حقوق کا پابند بنانا کمزور قوموں کے بس کی بات نہیں ہے۔الجیریا فلسطین،کوسووو، بوسنیا،عراق وغیرہ اسکی نمایاں مثالیں ہیں۔فلسطین میں جس طرح حقوق انسانی کی پامالی ہو رہی ہے اسے اقوام متحدہ کی جانچ ٹیم کے ذمہ داروں نے تسلیم کیا ہے۔

یہ منشور فرد اور ریاست کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تعین نہیں کرتا۔اس سے یہ بات واضح نہیں ہے کہ فرد کے حقوق کے حدود کیا ہیں اور کہاں سے ریاست کے حقوق شروع ہوتے ہیں۔مذہب کے معاملے میں بھی اس کا رویہ غیر واضح ہے۔اس میں فرد کو کسی بھی مذہب کے اختیار کرنے اور

اس پر عمل کرنے کا حق دیا گیا ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ مذہب انسان کے حقوق وفرائض کا بھی تعین کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ ان پر عمل کرسکتا ہے؟ اگر نہیں کرسکتا یا خاص دائرہ ہی میں کرسکتا ہے تو مذہبی آزادی کیا معنی ہیں؟

یہ منشور اس تصور کے تحت وجود میں آیا ہے کہ انسان آزاد ہے اور وہ اپنے لئے خود قانون بنا سکتا ہے۔ اسے کسی آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک غیر مذہبی یا سیکولر منشور ہے۔ اس میں فطری طور پر سیکولر نظریات کے ابھرنے، اس نوع کی تحریکوں کے قائم ہونے، فروغ پانے اور اس سے ہم آہنگ کردار کی تبلیغ واشاعت کے زیادہ مواقع ہیں۔ عملاً یہی ہو بھی رہا ہے۔ حریت فکر اور فرد کی آزادی کے نام پر ہر معاملہ میں الحاد اور خدا بیزاری، وحی و رسالت اور رسالت اور آخرت کے انکار کا ذہن کارفرما ہے۔ مخرب اخلاق تحریکیں چلانے، دنیا کو ایک خاص تہذیب اور کلچر کا عادی بلکہ پابند بنانے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ اسے ترقی اور روشن خیالی کا نام دیا جاتا ہے یا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ Moderen generation کے اپنے خیالات ہیں۔ اس کے برعکس کسی دینی تحریک کے چلانے اور دینی اور اخلاقی قدروں کی ترویج واشاعت کے مواقع محدود سے محدود تر بنانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ بعض دفعہ تو دینی تحریکوں کو ناکام بنانے کے لئے ذرائع ابلاغ کا استعمال کر کے ایسی فضا بنائی جاتی ہے کہ ان کی بدترین تصویر ہی دنیا کے سامنے پیش ہو۔ دقیانوسیت اور بنیاد پرستی کے الزامات لگا کر انہیں نا قابل قبول ٹھہرایا جاتا ہے اور موقعہ ملنے پر طاقت کے ذریعہ ان کو ختم کرنے کی بدترین تدبیریں بھی کی جاتی ہیں۔ آزادئ فکر کے سارے دعوے یہاں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس کے مقابل پر وہ منشور ہے جسے دنیا کے سامنے ہمارے پیارے آقا سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا جو اپنے آپ میں لاثانی اور اکمل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج حقوق انسانی کا ہر طرف چرچا ہے اور اس سلسلے میں بعض اچھی اور قابل تعریف مساعی بھی ہو رہی ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا

جا سکتا کہ ان حقوق کی خلاف ورزی بھی آئے دن بڑھتی ہی جا رہی ہیں اور اسے روکنے کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آج سے چودہ سو سال قبل سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بنی نوع انسان کے واسطے کامل ہدایت یعنی اسلام کو اس دنیا میں قائم فرمایا۔ اسلام دنیا اور آخرت کی فوز وفلاح کا ضامن ہے۔ اسلام نے انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں مشعل راہ بن کر سیدھا راستہ دیکھایا ہے۔ اسلام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اس دنیا میں انسانی حقوق کا سب سے بڑا پاسبان اور محافظ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور انسانی حقوق کی پامالی کو روکنے کی موثر تدابیر اختیار کرتا ہے۔ یہ محض خاکسار کی اسلام سے عقیدت ومحبت یا جذباتی تعلق کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے جس وسعت اور گہرائی، بصیرت اور ظرف نگاہی سے اس کے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے، اسکی نظیر دنیا کے کسی بھی منشور میں خواہ وہ بڑے سے بڑے عالم نے ہی کیوں نہ بنایا ہو، ملنا ناممکن ہے۔ یہ اسلام کی ہی امتیازی تعلیمات ہیں جنہوں نے حقوق انسانی کا حسین ترین اور آفاقی تصور اُس وقت پیش کیا جب نہ تو کسی Atlantic Treaty کا تصور تھا نہ کسی اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا اور نہ ہی Magna Carta کی تریسٹھ شقیں جو Baroons کو تو حقوق دیتی تھیں لیکن دوسروں کے حقوق غصب کرتی تھیں۔ اور نہ ہی روسو کا معاہدہ عمرانی (Social Contract) تھا۔ بلکہ یہ وہ آفاقی تعلیم تھی جو خدائے لاشریک نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری اور اس وجود باجود نے اس تعلیم کو اپنی ذات میں جاری کر کے یہ دکھا دیا کہ یہی وہ تعلیم ہے جس پر آئندہ بنی نوع انسان کی بقا موقوف ہے۔ اور انشاء اللہ اس مقالہ میں خاکسار اس سچائی کو حسب استطاعت بیان کرنے کی کوشش کریگا۔ یہ بات ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ایک غیر متعصب نگاہ سے تحقیق کرنے والے شخص کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ دنیا نے جس طرح بہت سارے معاملات میں اسلام سے اکتسابِ فیض حاصل کیا ہے اسی طرح اس معماملہ میں بھی خاطر خواہ فیض حاصل کیا ہے۔ البتہ اس بات کے اعتراف کی ہمت یا

ظرف ابھی اکثر لوگوں کو حاصل نہیں ہے لیکن پھر بھی بہت سارے مستشرقین اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے متعلق اسلامی تعلیمات سے دنیا نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اسلامی فکر کا پورا تتبع نہ ہونے کی وجہ سے موجودہ دور میں لوگوں کے ذہن افراط وتفریط اور بے اعتدالی کا شکار ہیں۔

آج کی اس دنیا میں جبکہ اسلام پر چاروں طرف سے اعتراض کرنے والے پائے جاتے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلامی فکر اور تعلیم کی صحیح اور مکمل نشاندہی کی جائے اور اسلامی فکر میں جو اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے اسے دنیا کے سامنے نمایاں کیا جائے۔ اور جماعت احمدیہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دنیا کے ہر کونے میں اس کام کو بخوبی سرانجام دینے کے لئے حسب توفیق کوشش کر رہی ہے اور اسلام کی تعلیمات کی خوبیوں کو اور اسلام کے خوبصورت چہرے کو دنیا کے سامنے رونما کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اسلام کی خدمت کرنے اور اسکی حسین تعلیمات کو دنیا کے سامنے اُجاگر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کو سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمودؓ مصلح موعود کی خدمت اسلام کیلئے جذبہ سے بھری اس دعا کا وارث بنائے:

تبلیغِ دین ونشر وہدایت کے کام پر
مائل رہے تمہاری طبیعت خدا کرے

آمین

اسلام
انسانی حقوق کا پاسبان

اسلام کا مفہوم

لفظ ''اسلام'' عربی زبان کا ہے جو ''سَلِمَ'' سے بنا ہے۔سَلِم کا مطلب ہے امن وسلامتی ۔بانئ اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفی ؐ نے فرمایا ہے ''اَلسَّلَامُ مِنَ الْاِسْلَامِ ''یعنی امن و سلامتی اسلام سے ہی ہے۔نیز فرمایا:۔

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ"

یعنی حقیقی مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو قرآن کریم میں فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ

(سورۃ یونس آیت ۲۶)

یعنی اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔اسلام کے ایک اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ احکامات کی مکمل طور پر فرمانبرداری کی جائے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے ماننے والے ہر مسلمان کو دنیا کے ہر انسان سے محبت اور پیار اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے۔خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب وملت وعقیدہ اور رنگ ونسل سے ہو۔ایک مسلمان دن میں پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے اور ہر نماز کے آختتام پر دائیں طرف رُخ کر کے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ "کہتا ہے پھر بائیں طرف رُخ کر کے یہی کلمات دوہرتا ہے۔ان کلمات کا مطلب ہی یہ ہے کہ اَے میری دائیں طرف والو(خواہ کوئی بھی ہو) تم پر اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو۔پھر اسی طرح کی دعا بائیں طرف والوں کیلئے بھی مانگتا ہے۔اسی طرح مسلمان جس کسی سے بھی ملتا ہے اُسے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ کہتا ہے۔یعنی تجھ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت و برکت ہو۔پس اسلام اور مسلمان کا نام ہی اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ دین اپنے متبعین کو یہ تعلیم دے رہا ہے کہ وہ دنیا کے انسانوں کیلئے جہاں تک اُن کے بس میں ہے امن وسلامتی اور طمانیت مہیا کریں کیونکہ امن وسلامتی کی زندگی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔غرض یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسی خوبصورت تعلیم کو ماننے والے لوگ

بنی نوع انسان کے امن وسلامتی سے جینے کے حق کو غضب کر سکتے ہیں؟ اور جو شخص کرتا ہے وہ یقیناً اسلام کا ماننے والا نہیں ہوسکتا۔

حقیقی مسلمان کی پہچان

اللہ تعالیٰ نے بانیٔ اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفی ؐ کو تمام جہانوں کے لئے باعث رحمت بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

(سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۸)

یعنی اَے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے تمام جہانوں کیلئے رحمت کے طور پر بھیجا ہے۔

اس میں صرف مسلمانوں، یا عربوں کا ذکر نہیں بلکہ آپ ؐ کا وجود باجود تمام جہانوں کے لئے رحمت ہے۔ اسی لئے ہر وہ مسلمان جو سیدنا حضرت محمد مصطفی ؐ کی طرف منسوب ہوتا ہے اسے بھی اپنے رسول کے اُسوہ پر چلتے ہوئے مخلوق خدا کے لئے رحمت بننا ہوگا اور اسے ہر رنگ ونسل کے امتیاز سے بالاتر ہو کر سب کے لئے خیر کا موجب بننا ہوگا اور اسے انسانوں کے لئے زحمت بننے سے اپنے آپ کو ہر پہلو سے بچانا ہوگا۔ یہی ایک حقیقی مسلمان کی پہچان ہے اور خود سوچیں کہ جو شخص اس حسین تعلیم کا پیرو ہوگا وہ کس طرح کسی دوسرے کے حقوق کو غصب کرسکتا ہے۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ

(سورۃ النساء آیت ۲)

اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے مردوں اور عورتوں کو بکثرت پھیلا دیا۔ اسی طرح فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ

اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۴﴾

(سورۃ الحجرات آیت ۱۴)

اے لوگو یقیناً ہم نے تم کو نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ یقیناً اللہ دائمی علم رکھنے والا اور ہمیشہ باخبر ہے۔

اسی طرح ہمارے پیارے آقا نے تو ہمیں یہ بتایا ہے کہ:

اَلۡخَلۡقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الۡخَلۡقِ اِلَی اللّٰہِ مَنۡ اَحۡسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ

(مشکوٰۃ کتاب الآداب)

ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ پس مخلوق میں سے اسے سب سے پیارا وہ ہے جو اس کے عیال سے سب سے زیادہ اچھا سلوک کرے۔

سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی اپنے اور غیروں کے حقوق کو احسن رنگ میں ادا کر کے تمام انسانیت کے لئے ایک کامل نمونہ چھوڑا ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ بنی نوع انسان سے سچی ہمدردی و محبت کی۔ آپؐ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت پر فائز بھی نہ ہوئے تھے کہ آپؐ نے چند لوگوں کے ساتھ مل کر ایک عہد کیا تھا کہ ہم ہمیشہ حقدار کو اس کا حق حاصل کرنے میں مدد دیں گے اور ظالم کو ظلم سے روکیں گے۔ اس عہد کا نام تاریخ اسلام میں ''حِلفُ الفُضول'' رکھا گیا۔ بعض روایتوں کی رُو سے اس تجویز کے محرک ایسے شخص تھے جن کے ناموں میں فضل کا لفظ آتا تھا اس لئے یہ عہد ''حِلفُ الفُضول'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔

(روض الانف امام سہیلی جلد ا صفحہ ۱۱ بحوالہ سیرۃ خاتم النبیین)

اگرچہ آپؐ اس حلف میں نبوت پر فائز ہونے سے قبل شریک ہوئے مگر نبوت پر فائز ہونے کے بعد بھی آپؐ نے اس عہد کو پورا کیا اور تاریخ گواہ ہے کہ نہایت ہی احسن رنگ میں پورا کیا اور مظلوم انسان کی ہمیشہ مدد کی۔ چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ اراشہ نامی ایک شخص مکہ میں کچھ

اونٹ بیچنے آیا۔ ابو جہل نے اس کے اونٹ خرید لئے اور قیمت ادا نہ کی۔ وہ رؤساءِ قریش کے پاس گیا تو اُنہوں نے اسے شرارت کی نیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس بھیج دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن دنوں قریش مکہ اور خاص طور پر ابو جہل کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا تھا مگر اس کے باوجود آپؐ اس مظلوم کی مدد کے لئے اُسے ساتھ لے کر چل پڑے اور ابو جہل کے دروازے پر دستک دی۔ حضورؐ نے ابو جہل سے کہا کہ اس کی رقم ادا کر دو۔ ابو جہل اس قدر مرعوب اور خوفزدہ ہوا کہ فوراً اندر گیا اور رقم لا کر دے دی۔ اس طرح آپؐ نے مظلوم کی مدد کی اعلیٰ مثال قائم فرمائی۔

آج بھی دنیا میں لاکھوں انسان ایسے ہیں جن کا حق ظالم لوگ غصب کر لیتے ہیں اور ایسے مظلوم آپ کو دنیا کے ہر کونے میں اور ہر علاقہ میں بآسانی مل جائیں گے۔ سیدنا حضرت محمد مصطفیٰؐ کا اُسوہ حسنہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ حسب استطاعت قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے مظلوم کی مدد کرنی چاہئے اور دوسروں کا حق غصب کرنے والے ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا چاہئے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا

یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر ہم دنیا میں حقیقی امن قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسلامی تعلیمات کے مطابق مظلوم کو اس کا حق دلوانے میں مدد کرنی ہوگی اور یہ کام پہلے ذاتی سطح پر شروع کرنا ہوگا ہر انسان کو کمزور اور غریب طبقہ سے محبت اور شفقت کا سلوک کرنا ہوگا اور اپنے مدنظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ رکھنا ہوگا۔ پھر اپنے محلہ اور شہر اور پھر عالمی سطح پر مظلوم قوموں کو انکے حقوق دلوانے ہوں گے۔ اس کے بغیر بدامنی کو اس دنیا سے دُور کرنا ممکن نہیں ہے۔

احادیث میں ہمیں بہت سارے واقعات ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غرباء و مساکین کی ہمیشہ حسب استطاعت مدد کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ کبھی کمزوروں

کا سامان خود اٹھاتے اور کبھی نچلے طبقہ کے لوگوں سے جن کو دیکھ کو دوسرے منہ پھیر لیا کرتے تھے، محبت کا اظہار کرتے اور انکی عزت افزائی فرماتے۔ آپؐ نے اپنے متبعین کو انسان سے پیار کرنے کا ابدی سبق سکھا دیا اور اسی اُسوہ پر عمل کرتے ہوئے کروڑوں انسان بنی نوع انسان سے بلا تفریق مذہب ونسل محض اسلئے محبت کرتے ہیں کہ آپؐ نے انہیں اپنے نمونہ سے محبت کا سلیقہ سکھلایا۔ اور اسکی سب سے بڑی مثال جماعت احمدیہ ہے جس نے آپؐ کی تعلیمات کی روشنی میں Love for all Hatered for none کا Motto اپنایا ہوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قبل عرب کے بڑے بڑے قبائل اور خاندان غلاموں اور غریب انسانوں کو جنور سے بدتر سمجھتے تھے۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عرب کے معزز ترین قبیلہ قریش کے چشم و چراغ تھے مگر آپ نے غرباء کو اپنی چھاتی سے لگا کر دنیا والوں کو انسانیت اور انسان کی قدر کرنے کا اعلیٰ سبق سکھایا۔ ایک احمدی شاعر ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحبؓ نے کیا ہی خوب کہا ہے:

محبت سے گھائل کیا آپ نے
دلائل سے قائل کیا آپ نے
جہالت کو زائل کیا آپ نے
شریعت کو کامل کیا آپ نے
بیاں کردئیے سب حلال وحرام
علیک الصّلوٰۃ علیک السّلام

انسانی حقوق سے متعلق بنیادی تصوّرات اوراسلامی تعلیمات کے امتیازات

دین اسلام اس تصور کے خلاف ہے کہ انسان ایک طویل عرصہ تک ظلمت اور تاریکی میں رہا، پھر آہستہ آہستہ اسے علم وفکر کی روشنی ملی ۔ اسلام کے نزدیک انسان اول بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے ساتھ اس زمین پر آباد ہوا۔اس کے بعد ہر دور میں اس کی ہدایت اور رہنمائی کا انتظام ہوتا رہا۔ بنی نوع انسانی کی ہدایت کی خاطر دنیا کے ہر حصہ میں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے اور اس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کی خاطر مسیح موعودؑ کو بھیجا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول و پیغمبر انسان کو ہر دور میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سے باخبر کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے علم پا کر بنی نوع انسان کو ایک طرف تو یہ بتایا کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق عائد ہوتا ہے، دوسری طرف بندوں کے حقوق کی بھی وضاحت کی ۔غرض یہ کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد سے ہر زمانہ میں انسان کو مطلع کیا گیا۔ ان کی تعلیمات میں خدائے واحد کی عبادت سے لیکر حسب حال نظام شریعت بھی رہا ہے۔ اگر انسان نے خدا کا حق ادا نہیں کیا تو انہوں نے اس پر تنقید کی ۔شرک کو مٹایا اور توحید کو قائم کیا۔ اور جب انسان نے انسان کے حقوق کی ادائیگی میں بھی کوتاہی کی تو انہوں نے اسکے خلاف بھی آواز اٹھائی ،ظلم و ناانصافی کے خاتمہ اور عدل و انصاف کے قیام کے لئے ان کی مساعی جاری رہیں ۔ جب اللہ تعالیٰ کی نصرت سے انہیں فتوحات حاصل ہوئیں اور اللہ نے انہیں اقتدار عطا کیا تو انہوں نے حقدار کو اس کا حق دلایا اور معاشرہ میں عدل و انصاف کو عملاً قائم کیا اور دوسروں کے لئے اعلیٰ اسوہ پیچھے چھوڑا۔ اور تمام انبیاء کی تعلیمات میں سے ہمارے پیارے آقا اور نبیوں کے سردار سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ سب سے احسن و اکمل ہے۔ انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ وحی و رسالت کی تاریخ بھی جڑی ہوئی ہے ۔اس سے صرفِ نظر کر کے اس کا مطالعہ ناقص اور ادھورا

ہوگا۔ چنانچہ اس ضمن میں سیدنا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی علیہ السلام کا درج ذیل اقتباس تحریر کرنا خالی از حکمت نہ ہوگا:۔

''اللہ تعالیٰ نے حقوق کے دو ہی حصے رکھے ہیں۔ ایک حقوق اللہ دوسرے حقوق العباد۔ اس پر بہت کچھ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جس طرح پر تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اس جگہ دو رمز ہیں۔ ایک تو ذکر اللہ کو ذکر آباء سے مشابہت دی ہے۔ اس میں یہ سِرّ ہے کہ آباء کی محبت ذاتی اور فطرتی محبت ہوتی ہے۔ دیکھو بچہ کو جب ماں مارتی ہے وہ اس وقت بھی ماں ماں ہی پکارتا ہے۔ گو یا اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی تعلیم دیتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے فطری محبت کا تعلق پیدا کرے۔ اس محبت کے بعد اطاعت امر اللہ کی خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ اصلی مقام معرفت کا ہے جہاں انسان کو پہنچنا چاہئے۔ یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے فطری اور ذاتی محبت پیدا ہو جاوے۔ ایک اور مقام پر یوں فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ۔ اِس آیت میں ان تین مدارج کا ذکر کیا ہے جو انسان کو حاصل کرنے چاہئیں پہلا مرتبہ عدل کا ہے۔ اور عدل یہ ہے کہ انسان کسی سے کوئی نیکی کرے بشرط معاوضہ۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ ایسی نیکی کوئی اعلیٰ درجہ کی بات نہیں بلکہ سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عدل کرو۔ اور اگر اس پر ترقی کرو تو پھر وہ احسان کا درجہ ہے یعنی بلاعوض سلوک کرو۔ لیکن یہ امر کہ جو بدی کرتا ہے اس سے نیکی کی جاوے۔ کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے دوسری پھیر دی جاوے یہ صحیح نہیں یا یہ کہو کہ عام طور پر یہ تعلیم عمل درآمد میں نہیں آسکتی چنانچہ سعدی کہتا ہے:۔

نکوئی با بداں کردن چنان است   کہ بد کردن برائے نیک مرداں

اس لئے اسلام نے انتقامی حدود میں جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ کوئی دوسرا مذہب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور وہ یہ ہے۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ الآیۃ۔

یعنی بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے اور جو معاف کر دے مگر ایسے محل اور مقام پر کہ وہ عفو اصلاح کا موجب ہو۔ اسلام نے عفوخطا کی تعلیم دی لیکن یہ نہیں کہ اس سے شر بڑھے۔''

(روحانی خزائن۔کمپیوٹرائزڈ: جلد ۲۰ -لیکچرلدھیانہ:صفحہ 283)

اسلام نے انسان کوکیا حقوق دیۓ ہیں اور کس حدتک دیۓ ہیں اس کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے خود انسان کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہ سارے حقوق اسی نقطۂ نظر کے تابع ہیں۔ وہ اسکے فطری اور منطقی نتائج کے طور پر ابھرتے اور اسی کی بنیاد پر تفصیلی شکل اختیار کرتے ہیں۔اس لیے خاکسار اس بات کی کوشش کریگا کہ پہلے انسان کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرے۔

ا۔اللہ تعالیٰ خالق ومالک ہے

اسلام اس حقیقت کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور وہ تمام جہانوں کا اور تمام زمانوں کا رب ہے۔زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز اس کی ہی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے اور کوئی دوسرا اس میں اسکا کوئی شریک نہیں ہے۔جیسا کہ قرآن کریم کے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

(سورۃالفاتحہ:۲)

یعنی سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جورب العالمین ہے

انسان کوبھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔انسان کا کام اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اوران کا نفاذ کرنا ہے۔اسی میں اس کا امتحان وآزمائش ہے۔اس حقیقت پر ایمان لانے اور اسے تسلیم کرنے سے معاشرتی زندگی میں زبردست انقلابی تبدیلی رونما ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس دنیا پر اور اسکی

ہر چھوٹی بڑی چیز پر سے کسی فردِ واحد، خاندان، قبیلہ یا ادارہ کی مطلق ملکیت اور اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ انسان یہ مان کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے خواہ وہ علم ہو یا دولت، سب اللہ تعالیٰ کا ہی عطا کردہ ہے اور ان چیزوں کو حاصل کرنے یا بنانے میں اس کو کوئی کمال حاصل نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ ہی ہے اور انسان ان اشیاء کے استعمال میں اللہ کی مرضی اور اس کے احکام کا پابند ہے۔ اس میں آزادانہ تصرف اس کے لیے ناجائز اور اپنے مالک کو ناراض کرنے والا عمل ہے۔ اس دنیا میں جو شخص جس حیثیت میں ہے اسی حیثیت میں اس کا امتحان ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۶﴾

(سورۃ الانعام آیت 166)

اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کے مقابلے میں بعض کے درجات بلند کئے تا کہ وہ تم کو ان چیزوں میں آزمائے جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں۔ بے شک تمہارا ربّ جلد سزا دینے والا اور بے شک وہ غفور و رحیم ہے۔

نیز فرمایا:

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ﴿۳﴾

(سورۃ الملک آیت 3)

وہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تا کہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون زیادہ اچھے عمل کرتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کو رب العالمین قرار نہیں دیا بلکہ مخصوص قوموں کا رب قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ بائبل کو پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بار بار اُس میں ''اسرائیل کا خدا'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہودیوں کے دل و دماغ پر یہی خیال غالب رہا کہ وہ خدا جسے بائبل پیش کرتی ہے کسی اور قوم کا خدا نہیں بلکہ صرف بنی اسرائیل

کا خدا ہے۔ چنانچہ توریت میں متعدد جگہ ایسا ہی لکھا ہے۔ مثلاً:۔

خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے تجھے آج کے دن مجھ سے ملنے بھیجا۔

(سموئیل باب ۲۵ آیت ۳۲)

خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے ایک وارث بخشا کہ وہ میری ہی آنکھوں کے دیکھتے ہوئے آج میرے تخت پر بیٹھے۔

(سلاطین ۱/ ۴۸)

خداوند اسرائیل کا خدا ازل سے ابد تک مبارک ہو

(تواریخ باب ۱۶ آیت ۳۶)

خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے مونہہ سے میرے باپ داؤد سے کلام کیا

(تواریخ ۶/ ۴)

خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو

(زبور باب ۱۸ آیت ۷۲)

غرض بائبل صرف بنی اسرائیل کے خدا کو پیش کرتی ہے لیکن قرآن کریم پڑھ کر دیکھ لو اس میں ہر جگہ یہی لکھا ہوا نظر آئے گا کہ میں ساری دنیا کا خدا ہوں۔ میں جنّ و انس کا خدا ہوں اور میں تمام مخلوق کا رب ہوں خواہ کوئی مسلمان ہو یا ہندو ہو یا عیسائی ہو یا یہودی وغیرہ ہو۔

۲۔ انسان کا وجود اللہ کی مشیت کے تابع ہے

اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی مشیت کارفرما ہے، یہاں جو انسان بھی پیدا ہوتا ہے یا مرتا ہے سب اسی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے کم یا زیادہ جتنی حیاتِ مستعار چاہتا ہے عطا کرتا ہے پھر اسی کے فیصلے کے تحت انسان یہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے اور اس کا سفرِ آخرت شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ

(سورۃ الحج آیت 6)

اے لوگو! اگر تم کو بعث بعد الموت کے بارے میں شک ہے تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر لوتھڑے سے پھر مضغۂ گوشت سے جس کا نقش مکمل اور نامکمل ہوتا ہے تاکہ اپنی قدرت تم پر واضح کردے اور ہم تم کو ماؤں کی رحموں میں جب تک چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رکھتے ہیں پھر ہم تم کو حالتِ طفلی میں نکالتے ہیں پھر جوانی کی عمر تک لے جاتے ہیں تاکہ تم جوانی کے زور اور قوت تک پہنچو۔ تم میں سے کسی پر موت آجاتی ہے اور کوئی ارذل عمر کو لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ جاننے کی حالت کو پہنچ جائے۔

یہی حقیقت سورہ مومن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝۶۸

(سورۃ المومنون آیت 68)

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر وہ تم کو بچہ کی حالت میں نکالتا ہے پھر مہلت دیتا ہے کہ تم (اپنی جوانی کے) زور کو پہنچ جاؤ۔ پھر تم بوڑھے ہو جاؤ۔ تم میں سے کوئی اس سے پہلے ہی وفات پا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ تم ایک مقررہ وقت تک پہنچو اور شاید تم غور وفکر کرو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اوت موت وحیات کے سلسلے میں اس کی حکمت اور فیصلہ کا ذکر ہے کہ وہ جس شخص کو جتنی زندگی عطا کرنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ کوئی عہد طفلی ہی میں ختم ہو جاتا ہے، کوئی عین دورِ شباب میں اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے اور کوئی بڑھاپے کی منزل تک پہنچ

کر موت کی آغوش میں پہنچتا ہے۔اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ خدا کی قدرت سے آخرت کا آنا بھی بعید نہیں ہے۔اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جس شخص کو جتنی زندگی ملتی ہے وہ اللہ کی دین ہے۔جب تک اللہ چاہے اسے زندہ رہنے کا حق ہے اور اگر کوئی اسے اس حق سے محروم کرتا ہے تو وہ بہت بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔لیکن کوئی بھی انسان اپنی زندگی کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُسے مزید جینے کا حق ہے۔

۳۔کائنات سے استفادہ کا ہر شخص کو حق حاصل ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ وسیع کائنات انسان کے لئے نہایت موزوں بنائی ہے۔اس میں اسکی حیاتِ دنیا کا بہترین ساز وسامان موجود ہے۔اللہ تعالیٰ نے بحر و بر کو انسان کیلئے مسخر کر دیا ہے۔زمین میں انسان کے لئے مستقر ہے۔زمین اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ اس پر رہ سکے اور زندگی گزار سکے۔وہ یہاں کی ہوا اور پانی سے،سورج کی گرمی اور چاند کی ٹھنڈک سے،شب و روز کی گردش سے،سمندر کی گہرائی اور دریا کی روانی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسے اپنی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ بہ حیثیت انسان بغیر کسی روک ٹوک کے اسکی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور کسی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے یہ حق چھینے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۳﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۴﴾

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۵﴾

(سورۃ ابراھیم آیت 33 تا 35)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ تمہارے لئے

پھلوں کا رزق نکالا اور تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کیا تا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور تمہارے لئے نہریں مسخر کیں اور تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کیا جو ہمیشہ گردش میں ہیں اور تمہارے لئے رات اور دن کو مسخر کیا اور تمہیں وہ سب چیزیں دیں جو تم نے (تمہاری فطرت نے) طلب کیں۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکتے۔ بے شک انسان بڑا ظالم اور بڑا ناشکرا ہے۔

یہی بات ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۲۱﴾

(سورۃ لقمٰن آیت 21)

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے تمہارے لئے وہ ساری چیزیں مسخر کر دیں جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اس دنیا میں بے شمار نعمتیں پیدا کیں ہیں اور اسی نے ان سے فائدہ اٹھانے کا اسے حق بھی دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں کو کوئی اس سے سلب نہیں کر سکتا۔ اگر سلب کرتا ہے تو بدترین ظلم کا ارتکاب اور اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ چنانچہ سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمودؓ المصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی سورۃ البقرۃ کی آیت ۳۰ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

''اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب بنی نوع انسان کی مشترک وراثت ہے پس اس کا استعمال اس رنگ میں نہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک فرد یا ایک قوم کی مخصوص ملکیت ہو جائے۔ اس نکتہ کو نظر انداز کر کے اس وقت یورپ تباہی کی طرف جا رہا ہے اگر قرآن کریم کی اس تعلیم پر عمل کیا جاتا تو یہ حسد اور بغض جو مختلف ممالک اور مختلف اقوام اور مختلف گروہوں اور مختلف افراد میں پیدا ہو رہا ہے کبھی نہ ہوتا۔ اسلام نے صدقہ اور زکوٰۃ کا حکم بھی اسی اصل پر مبنی رکھا ہے کہ اصل میں زمین کی سب اشیاء سب انسانوں کے لئے پیدا کی گئی

ہیں اور انسان مجموعی طور پر ان کا مالک ہے۔ پس گو انفرادی قبضہ کو تسلیم کیا جائے مگر یہ ایسے رنگ میں نہیں ہونا چاہئے کہ دوسرے حقدار اس سے فائدہ اُٹھانے سے کلی طور پر محروم ہو جائیں۔‘‘

(تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۲۶۸)

۴۔ انسان صرف ایک خدا کا بندہ ہے

انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اسی کی بندگی اور اطاعت اسے کرنی چاہئے۔ انسان اس دنیا میں کسی کا غلام نہیں ہے صرف خدا کا بندہ ہے۔ لہٰذا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر اس غلامی سے آزاد ہو جو اس کے حقوق کو غصب کرنے والی ہو۔ اور فی الواقع اسے آزاد بھی ہونا چاہئے۔ کسی فردِ بشر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے، اپنی بندگی پر اسے مجبور کرے اور اسکی آزادی چھینے۔ اس ضمن میں ہمیں قرآن کریم میں ایک تاریخی واقع ملتا ہے۔ فرعون نے بھی بنی اسرائیل کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اس نے انکو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ پیغمبر خدا حضرت موسیٰ ؑ نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور فرعون کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی۔ انکی دعوت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کو جس عذاب میں اس نے ڈال رکھا ہے وہ اس سے باز آجائے اور انہیں مصر سے ہجرت کر جانے دے۔ اسکے جواب میں فرعون نے اپنے ان احسانات کا ذکر کیا جو اس نے حضرت موسیٰ ؑ پر ان کے ابتدائی دور میں کیے تھے۔ اس پر حضرت موسیٰ ؑ نے فرمایا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ

(سورة الشعراء آیت ۲۳)

اور یہ احسان جو تُو مجھ پر جتا رہا ہے وہ اس وجہ سے تھا کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔

اگر فرعون نے حضرت موسیٰ ؑ پر کوئی احسان کیا بھی تھا تو کسی فردِ واحد کے ساتھ ہمدردی اور انسانیت کا برتاؤ اس امر کا جواز نہیں فراہم کرتا کہ اس کی پوری قوم کو جبر کے شکنجہ میں کس لیا جائے اور غلامی کی زندگی پر اسے مجبور کیا جائے۔ اس کی آزادی کا حق اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا

۔حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جس احسان کا تو ذکر کررہا ہیا س کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ اس غلام قوم کی نسل کشی کی جو تدبیر تُو کررہا تھا، اس سے میں محفوظ رہا اور تو سمجھ نہ سکا کہ میں بھی اسی قوم کی اولاد ہوں۔حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور بنی اسرائیل کی آزادی کے مطالبہ کو فرعون نے حقارت کے ساتھ ٹھکرادیا۔اس نے کہا کہ موسیٰ کا تعلق تو ہماری غلام قوم سے ہے۔انہیں ہم کیسے اللہ تعالیٰ کا رسول اور اپنا راہنما مان سکتے ہیں؟ فرعون اور اسکی قوم کا نسلی غرور اللہ تعالیٰ کی ہدایت قبول کرنے کی راہ میں مانع بن گیا اور وہ غرقِ آب کردئے گئے۔جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ:

فَقَالُوٓا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿۴۸﴾
فَكَذَّبُوۡهُمَا فَكَانُوۡا مِنَ الۡمُهۡلَكِيۡنَ ﴿۴۹﴾

(سورۃ المومنون آیت 49،48)

انہوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں (حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ) پر ایمان لے آئیں جبکہ انکی قوم ہماری ماتحت اور تابعدار ہے۔پس ان لوگوں نے ان دونوں کی تکذیب کی اور ان قوموں میں شامل ہوگئے جو ہلاک کردی گئیں۔

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کسی فرعونِ وقت کو برداشت نہیں کرتا ۔حکومت واقتدار اس لیئے نہیں ہے کہ ایک طبقہ دوسرے کو محکوم و غلام بنائے رکھے۔ریاست میں کسی کا حق دوسرے سے کم نہیں ہے۔سب شہریوں کے حقوق یکساں ہیں اور حکومتِ وقت ان حقوق کی پاسبان ہے نہ کہ غایت گر۔

۵۔مذہبی غلامی کا جواز نہیں ہے

سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ اسلام مذہبی غلامی کا بھی مخالف ہے۔اسلام نے عیسائیت کے ادارہ پاپائیت اور آریوں کے برہمنیت کو ختم کیا اور یہ تعلیم دی کہ انسان خدا سے اس کے پیغمبروں کی ہدایت کے تحت براہِ راست تعلق پیدا کرسکتا ہے اور اپنے روحانی مقام و مرتبہ میں بڑھ سکتا ہے۔اسکے مقابل پر دیگر مذاہب کا یہ اعتقاد ہے کہ دنیا میں بعض اشخاص ایسے خاص ہیں جن کا

تعلق خدا سے ہے اور ہم صرف انکے ہی ذریعہ خدا تک پہنچ سکتے ہیں حتی کہ خدا سے دعا مانگنے کے لئے بھی ہمیں انکا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسلام نے ہمیں یہ سکھایا کہ انسان کو خدا کی عبادت کرنے، اُسے یاد کرنے، اُسکے لئے قربانی پیش کرنے اور اس سے دعا مانگنے کے لئے کسی دوسرے انسان کے وسیلہ کہ ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جو شخص بھی مصیبت کے وقت خدا سے مانگے خدا ضرور اسکی مدد کرتا ہے کیونکہ وہ بندوں کے بہت قریب ہے۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

(سورۃ البقرۃ آیت 187)

اور جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو تُو بتادے کہ میں قریب ہوں۔ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے۔ پس ان کو بھی میرا حکم ماننا چاہئے اور مجھ پر ایمان لانا چاہئے تا کہ وہ ہدایت پا جائیں۔

اللہ تعالیٰ سے پختہ تعلق پیدا کرنے کے واسطے کسی دیوی، دیوتا یا کسی پوپ، پنڈت اور پراہت کے واسطہ کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ہر قسم کے وسائل کی جن کی عبادت اسلئے کی جاتی ہے کہ وہ خدا کے قریب کردیں گے، ان الفاظ میں تردید کرتا ہے:

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۴﴾

(سورۃ الزمر آیت 4)

سن لو! اللہ ہی کیلئے ہے بندگی جو خالص ہو، جن لوگوں نے اسے چھوڑ کر حمایتی بنا رکھے ہیں ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں تا کہ وہ ہمیں خدا سے قریب کردیں۔ بے شک اللہ فیصلہ کریگا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور حق کو نہ ماننے والا ہو۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسان کو سیاسی اور مذہبی کسی بھی حیثیت سے محکوم بنانا قطعاً

ناجائز ہے۔ انسان کا یہ حق ہے کہ اسے آزادی ملے اور وہ کسی فرد یا ادارے کا کسی بھی پہلو سے غلام نہ رہے۔

اسلامی ریاست میں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہوگی۔ جن میں عبادات، نکاح وطلاق، موت وحیات اور دیگر شخصی اور عائلی امور شامل ہیں۔ اِن کے ان امور میں ریاست کی مداخلت نہ ہوگی۔ بلکہ ریاست کے ذریعہ اسکے لئے ان کی الگ عدالتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔

۶۔ انسان محترم ہے

اسلام ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی دوسری بے شمار مخلوقات پر شرف و فضیلت عطا کی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيۡلًا ﴿۷۱﴾

(سورۃ الاسراء آیت 71)

ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری کے لئے ان کو سواری دی اور انکے کھانے کے لئے پاک چیزیں عطا کیں اور اپنی مخلوقات میں سے اکثر پر فضیلت عطا کی۔

انسان کو دوسری مخلوقات پر جو شرف وفضیلت حاصل ہے، اسکے بعض پہلوؤں کا خود قرآن مجید نے صراحتاً ذکر کیا ہے اور بعض کی طرف اشارات کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین خلقت عطا کی ہے۔ وہ اپنی جسمانی ساخت، شکل وصورت، قدروقامت، اعضاء وجوارح کے تناسب اور ظاہری ہیئت کے لحاظ سے دنیا کی حسین طرین مخلوق ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ

(سورۃ التین آیت ۵)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت طریقہ سے پیدا کیا ہے

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ

(سورۃ التغابن آیت ۵)

اس نے تمہاری صورت بنائی اور تمہیں بہت اچھی شکل وصورت عطا کی

اسی طرح انسان کو قوتِ گویائی عطا کی گئی ہے اور انسان کو مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے قلم کا استعمال بھی سکھایا گیا ہے اور یہ امتیاز کسی جانور کو حاصل نہیں ہے۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ O عَلَّمَهُ الْبَيَانَ O

(الرحمٰن: ۴،۵)

اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے گویائی سکھائی۔

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O

(العلق:۵)

جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھے جسم کے ساتھ ساتھ دل ودماغ بھی عطا کیا ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ

(السجدۃ:۱۰)

اور اس نے تمہیں کان، آنکھ اور دل عطا کئے

انسان سوچنے، سمجھنے اور واقعات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حیرت انگیز ایجادات اس کے ذریعہ جنم لیتے ہیں اور ہر روز مادی ترقی اور خوش حالی کی طرف اس کی پیش رفت ہوتی رہتی ہے۔ عقل کے ذریعہ انسان بھلے برے میں فرق کرتا ہے اور معاملات میں اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ یہی خوبی انسان کو ایک ذمہ دار فرد بناتی ہے۔ یہ انسان کی عزت وتکریم کے بعض پہلو ہیں جنہیں اسلام نے بیان کیا ہے۔ اسلام ہر اس چیز کا مخالف ہے جو اس عزت وتکریم کے منافی ہو۔ فقر وفاقہ، ناپاک غذاؤں کے استعمال پر اسکا مجبور ہونا، ناقابل برداشت محنت، طبی سہولیات کی کمی، نامناسب سزائیں یہ سب انسان کے خلقی حسن کو بگاڑنے کے موجب ہیں اور

اسلام اس غیر انسانی روش کی کسی حالت میں اجازت نہیں دیتا۔

اسی طرح اسلام کے نزدیک انسانی جان کی بھی بہت اہمیت ہے اسلئے تو قرآن کریم نے ایک انسان کے قتل کو ساری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیا ہے۔ نیز جہاں دیگر مذاہب نے بعض مقامات پر اور خاص طور پر جنگ میں اپنے دشمنوں کے ساتھ سخت رویہ اپنانے کی تلقین کی ہے وہیں اسلام نے اس کی تردید کی ہے اور جنگ جیسے موقع پر بھی اس بات کو مدنظر رکھنے کی تلقین کی ہے کہ کم سے کم اشرف المخلوقات کا خون بہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوہ کے ذریعہ بھی دنیا کو یہ پیغام دیا کہ انسان کی جان بہت قیمتی ہے اور ہر صورت میں اس کو بچانے کی کوشش کرنے چاہئے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد جب آپؐ کے جانی دشمن ہار گئے اور آپ کے سامنے پیش کئے گئے تو انہوں نے تو یہی گمان کیا تھا کہ ہمارے گناہوں اور ظلموں کے بدلے اب ہمیں قتل کر دیا جائے گا لیکن حضورؐ نے لاتثرب علیکم الیوم کا اعلان فرما کر تا قیامت ایک ایسی مثال قائم فرما دی جسکی کوئی نظیر نہیں مل سکتی اور اس طرح انسانی جان کی اہمیت کو بھی مسلمانوں کے سامنے عام کیا۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک عیسائی مستشرق کا اقرار تحریر کرنا خالی از حکمت نہ ہوگا۔

ایک عیسائی مستشرق مسٹر سٹینلے لین پول لکھتے ہیں:۔

''اب وقت تھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) خونخوارانہ فطرت کا اظہار کرتے۔ آپ کے قدیم ایذا دہندے آپ کے قدموں میں آپڑے ہیں۔ کیا آپ اِس وقت اپنے بے رحمانہ طریقہ سے اُن کو پامال کریں گے؟ سخت عقوبت میں گرفتار کریں گے یا اُن سے انتقام لیں گے؟ یہ وقت اُس شخص کے اپنے اصلی رُوپ میں ظاہر ہونے کا ہے۔ اس وقت ہم ایسے مظالم کے پیش آنے کے متوقع ہیں جن کے سُننے سے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اور جن کا خیال کر کے اگر ہم پہلے ہی سے نفرین وملامت کا شور مچائیں تو بجا ہے۔

مگر یہ کیا معاملہ ہے؟ --- کیا بازاروں میں کئی خون ریزی نہیں ہوئی؟ ----- ہزاروں مقتولوں کی لاشیں کہاں ہیں؟ واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں (کسی کی رعایت نہیں

کرتے) اور یہ ایک واقعی بات ہے کہ جس دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم ۔ ناقل) کو اپنے دُشمنوں پر فتح حاصل ہوئی، وہی دن آپ کو اپنے نفس پر سب سے زیادہ عالی شان فتح حاصل کرنے کا دن بھی تھا۔ قریش نے سالہا سال تک جو کچھ رنج اور صدمے دیئے تھے اور بے رحمانہ تحقیر و تذلیل کی مصیبت آپ پر ڈالی تھی آپ نے کُشادہ دلی کے ساتھ اُن تمام باتوں سے درگزر کی اور مکّہ کے تمام باشندوں کو ایک عام معافی نامہ دے دیا''۔

(''انتخاب قرآن'' مقدمہ ص 67) (مذہب کے نام پر خون ص 66-67)

۷۔ اللہ تعالیٰ فرماں روائے حقیقی ہے

انسان اجتماعیت پسند ہے اور معاشرہ سے الگ تھلگ زندگی گزارنا اسکی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ وہ دوسروں کے تعاون ہی سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کر سکتا ہے۔ معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ کچھ حقوق رکھتا ہے اور اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ان دونوں کا پورا ہونا ہی ایک مہذب معاشرہ کی بنیاد ہے۔ یہ حقوق اوع ذمہ داریاں فرد پر بھی عائد ہوتی ہیں اور خاندان، معاشرہ، قبیلہ اور ریاست کا بھی اس میں حصہ ہے۔

ان حقوق و رفرائض کا تعین کون کریگا؟ اسلام اسکا جواب یہ دیتا ہے کہ اسکے تعین کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ قانون سازی کا حق اس نے کسی کو نہیں دیا ہے۔ بعض دفعہ انسانی قانون کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ اہل عرب نے خود سے چیزوں کو حلال یا حرام قرار دے کر اسے خدا کے قانون کی حیثیت دے رکھی تھی۔ چنانچہ اس پر تنقید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ؕ﴿۱۱۷﴾

(سورۃ النحل آیت 117)

تمہاری زبانیں جو جھوٹ بولتی ہیں اسکی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال اور حرام ہے۔ اس طرح تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے۔ یقینا جو لوگ اللہ جھوٹی افترا پردازی کرتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء فقہاء کو مطلق قانون سازی کا حق دے رکھا تھا۔ وہ خود ہی حلال و حرام کا تعین کرتے تھے۔ قرآن نے اس پر سخت گرفت کی اور بتایا کہ کسی عالم، فقیر اور درویش کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ شارع اور قانون ساز بن بیٹھے۔ یہ کام صرف اللہ کا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو شریعت عطا کرے اور کسی چیز کی حرمت یا حلّت کا فیصلہ کرے۔

جب اہل کتاب نے توریت کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے علماء کے آزاد فتووں اور فیصلوں کو فوقیت دینی شروع کی تو اسی سے ان کے کفر و ضلالت اور تباہی کا آغاز ہوا۔ غرض یہ کہ اسلام نے کسی بھی فرد یا ادارہ کے مطلق بالادستی کے تصور کو ختم کر دیا اور کسی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ دوسروں کے حقوق کا تعین کرے۔ اور بتایا کہ انسان کو اپنے حقوق کے تعین کے لئے خدا کے دئے ہوئے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

۸۔ انسان کو اجتہاد کا حق حاصل ہے

یہاں اس قانون سازی کا ذکر نہیں ہے جو حدود اللہ میں رہ کر ہوتی ہے۔ اسکی اجازت خود اس نے دی ہے۔ اسے تفقہ اور اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اسکا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ کسی زندہ اور ابدی شریعت کے لئے ناگزیر ہے۔ اسکے بغیر وہ تغیر پزیر زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

قرآن میں منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ امن وخوف کی خبریں بلا تحقیق پھیلا کر ملک کے امن کو خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ اس معاملے میں صحیح رویہ کیا ہونا چاہئے اسکی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۴﴾

(سورۃ النساء:84)

اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں۔ اگر اسے وہ لوٹا دیتے رسول کی طرف اور اولوالامر کی طرف جو ان میں سے اس کی تحقیق کر سکتے ہیں تو وہ حقیقت حال سے باخبر ہوتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے چل پڑتے سوائے تھوڑوں کے۔

اس آیت میں واضح ہدایت ہے کہ ریاست کے نازک معاملات میں افواہیں پھیلانے کی جگہ اللہ کے رسول اور اولوالامر کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اور اولوالامر کی ذمہ داری ہے کہ صحیح صورت حال سے اُمت کو باخبر کریں۔ اس میں علماء کا گروہ بھی شامل ہے جو دینی مسائل کا استنباط کر سکتے ہیں۔

۹۔ مرد و عورت میں حقوق مساوی ہیں

اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ عورت و مرد کو برابر کے حقوق ملنے چاہئے۔ لیکن اسلام اس معاملہ میں افراط یا تفریط کا حامی نہیں ہے۔ یعنی اسلام نہ تو اس ذہنیت کی تائید کرتا ہے کہ عورت کو نعوذ باللہ جوتی کی طرح اپنے پاؤں کے نیچے رکھا جائے اور نہ ہی اس سوچ کو صحیح خیال کرتا ہے کہ عورت کو ایسی آزادی دے دی جائے کہ گویا وہ انتظامی لحاظ سے بھی خاوند کی نگرانی سے باہر سمجھی جائے۔ یورپ کا ایک طبقہ تو اسلام کی طرف یہ تعلیم بھی منسوب کرتے ہوئے نہیں شرماتا کہ اسلام عورت میں رُوح تک کو تسلیم نہیں کرتا۔ گویا وہ صرف مشین کی طرح کا ایک جانور ہے جس کی زندگی اُس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ مگر قرآن شریف ان سارے باطل خیالات کی تردید فرماتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ مرد عورت اپنے اعمال کی جدّ و جہد اور ان کے نتائج کے حصول میں برابر ہیں اور سب کے اعمال کا نتیجہ یکساں نکلنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ

(آل عمران:196)

یقیناً میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ کیونکہ تم سب ایک ہی نسل کے حصے ہو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمٰتِ وَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَ الۡقٰنِتِیۡنَ وَ الۡقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِیۡنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِیۡنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الۡخٰشِعِیۡنَ وَ الۡخٰشِعٰتِ وَ الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَ الۡمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِیۡنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَہُمۡ وَ الۡحٰفِظٰتِ وَ الذّٰکِرِیۡنَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۳۶﴾

(سورۃ الاحزاب آیت 136)

اس آیت کا خلاصہ یہی ہے کہ مسلمان، مومن، فرمانبردار۔ راست گو۔ صابر۔ عاجز اور صدقہ دینے والے، روزہ گر، تقدس کی حفاظت کرنے والے یعنی پاکدامن اور خدا تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بخشش کا سامان اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

اور خاوند بیوی کے مخصوص حقوق کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَہُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡہِنَّ

(البقرۃ:۲۲۹)

جس طرح خاوندوں کے بعض حقوق بیویوں کے ذمّہ ہیں اسی طرح بیویوں کے بعض حقوق خاوندوں کے ذمّہ بھی ہیں۔

اس قرآنی آیت کا یہ مطلب ہے کہ حقوق اور ذمہ داریوں کے معاملہ میں میاں بیوی برابر ہیں کہ کچھ پابندیاں خاوند کے ذمہ لگا دی گئی ہیں اور کچھ پابندیاں بیوی کے ذمہ لگا دی گئی ہیں اور دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کے متعلق پوچھے جائیں گے۔ مگر چونکہ انتظامی لحاظ سے گھریلو زندگی کی باگ ڈور بہر حال ایک ہاتھ میں رہنی ضروری ہے اس لیے اس جہت سے قرآن شریف

نے فرمایا کہ گھریلو زندگیوں میں مردوں کو عورتوں پر نگران رکھا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے فطری قویٰ میں مردوں کو فضیلت عطا کی ہے۔ (سورۃ النساء: ۳۵)

لیکن اس انتظامی فرق کو ایک طرف رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا ۲۰

(سورۃ النساء: ۲۰)

اے مسلمانو! اپنی بیویوں کے ساتھ بہت نیک سلوک کیا کرو۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو ناپسند بھی کرتا ہو تو پھر بھی یاد رکھو کہ ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو مگر خدا نے اس میں تمہارے لئے انجام کے لحاظ سے بہت بڑی خیر مقدّر کر رکھی ہو۔

چنانچہ اس سلسلہ میں سیدنا حضرت مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔ حضورؒ فرماتے ہیں:۔

''اسلام بحیثیت انسان ہونے کے عورتوں کو مساوی درجہ دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن میں جو احکام دئے گئے ہیں وہ الناس کو مخاطب کر کے دئے گئے ہیں اور عربی لغت کی رُو سے الناس کا لفظ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اکٹھا بولا جاتا ہے۔۔۔۔ قرآن مجید کی ایسی آیات کی تعداد (جن میں صرف عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے) اُنچاس ہے۔۔۔ بشر کا لفظ عربی زبان میں عورت اور مرد دونوں کے ئے استعمال ہوتا ہے۔ سو گویا انسان ہونے کی حیثیت میں عورتوں کو مردوں کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔''

(دورہ مغرب ۱۴۰۰ھ بمطابق ۱۹۸۰ء صفحہ ۵۲۔۵۳)

۱۰۔اخلاق اور قانون کا تعلق

انسان کے اندر اخلاقی حس موجود ہے۔اعلیٰ اخلاق سے محبت اور پست اخلاق سے نفرت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔اسکی اخلاقی حس بیدار اور طاقت ور ہو جائے تو وہ تہذیب و شرافت کا نمونہ بن جائے۔اسلام انسان کے اس جذبہ کو زندگی و توانائی عطا کرتا ہے۔اس نے انسان کے حقوق کی سادہ سی فہرست نہیں فراہم کی ہے بلکہ اخلاق سے ان کا رشتہ جوڑ دیا ہے ۔بہت سے قانونی حقوق کو وہ انسان کی اخلاقی خوبیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے،ان کی پابندی کی ترغیب دیتا ہے،ان کا اجر و ثواب بیان کرتا اور ان کی خلاف ورزی پر سخت وعید سناتا ہے۔اسلام نے ان حقوق کے سلسلہ میں فرد کے ضمیر کو بیدار کیا اور معاشرہ کے اندر اس کے حق میں فضا بنائی ہے۔قتل نفس،قتل اولاد، چوری، بدکاری، دشنام ترازی، افتراء و تہمت، حق تلفی اور ظلم و زیادتی جیسی خرابیوں کو اسلام فسق و فجور اور کبائر میں شمار کرتا ہے اور قرآن کریم میں متعدد جگہ اس پر سخت وعید سناتا ہے۔ان کے بالمقابل جن پہلوؤں سے بھی آدمیت کا احترام ہو،اسلام انکی تحسین کرتا اور انکے اجر و ثواب کا ذکر کرتا ہے۔

اسطرح اسلام کے نزدیک حقوقِ انسانی کی حیثیت صرف قانونی ہی نہیں ہے بلکہ انسان کے اعلیٰ اخلاق کردار کی بھی ہے۔

۱۱۔خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس

اسلام نے جہاں ایک طرف تو انسانی حقوق کو قانونی اور اخلاقی تحفظ فراہم کیا،وہیں دوسری طرف اس کے احترام کا جذبہ بیدار کیا۔اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہ سکھایا ہے کہ احکام اللہ اور حدود اللہ کی پابندی ہر حال میں لازمی ہے۔اور اس کے بدلہ انسان کو کل قیامت کے روز اللہ کے انعام کے اکرام کا مستحق ٹھہرے گا اور انکی خلاف ورزی پر اسے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔اللہ کے نیک بندوں کی ایک خوبی اَلْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ (التوبۃ:۱۱۳) ہے۔اسے

بعض مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

وراثت میں قرابت داروں کے حقوق بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۴﴾

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۵﴾

(سورۃ النساء:14،15)

یہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود ہیں جو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کریگا تو اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اسکے رسوک کی نافرمانی کرے اور اسکے حدود سے تجاوز کرے تو اسے وہ نارِ جہنم میں داخل کریگا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اسکے لئے رسوا کن عذاب ہوگا۔

قرآن مجید نے ان حقوق کی پابندی کو قیامت کے عقیدہ سے جوڑ دیا ہے۔ یہ عقیدہ ان حقوق کی پامالی سے انسان کو باز رکھتا اور اسے ان کے احترام پر مجبور کرتا ہے۔ قتلِ ناحق قانونی جرم ہی نہیں گناہِ کبیرہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جملہ گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کو بروزِ قیامت دوگنے عذاب سے ڈرایا ہے۔ لڑکیوں کو زندہ درغور کرنے والوں، یتیم کے مال کو ناحق کھانے والوں اور خیانت کرنے والوں کو بھی قرآن کریم نے متعدد مرتبہ قیامت کے دن کے عذا سے ڈرایا ہے۔ اور یہ بات سچ ہے کہ جب قیامت کے حساب کتاب اور آخرت کی جواب دہی کا احساس ابھر آئے تو انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اس احسان کا فقدان ہی ادائے حقوق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اسلام میں فرد کے شخصی اور ذاتی حقوق

شخصی اور ذاتی حقوق

ا۔زندہ رہنے کا حق

فرد کے حقوق میں سب سے بڑا اور بنیادی حق اس کے زندہ رہنے کا حق ہے۔اسی پر دوسرے حقوق کا انحصار ہے۔یہ حق اگر کسی سے سلب کر لیا جائے تو دوسرے حقوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اسکی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کے تمام جمہوری قوانین نے اسے ایک فطری اور بنیادی حق قرار دیا ہے۔اس کے ساتھ یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ یہ حق مطلق اور غیر مشروط نہیں ہے۔عدل وانصاف اور جائز قانون کے تحت کسی کو اس حق سے محروم بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسلام نے انسان کو زندگی کا حق عطا کیا،اس پر دست درازی سے اور شدت سے منع کیا اور اسے پورا تحفظ فراہم کیا اور اعلان کیا کہ جب تک حق ہی کا مطالبہ نہ ہو اُسے اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔اسلام کے نزدیک ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے زندہ رہنے کا حق لے کر پیدا ہوتا ہے۔زندگی اسے اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ملی ہے۔وہی اس کا مالک ہے،اسے کوئی سلب کرنے کا مجاز نہیں ہے۔حتّٰی کہ وہ خود بھی اپنی زندگی ختم نہیں کر سکتا۔اسی وجہ سے اسلام نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے۔یہ ایک منفرد تعلیم ہے جس کا دیگر مذاہب میں فقدان پایا جاتا ہے۔

اسلام نے تو اہل ایمان نیک لوگوں کا ایک نمایاں وصف یہ بیان کیا کہ وہ ناحق کسی کی جان نہیں لیتے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۝

(الفرقان:٦٩)

اور وہ کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے،قتل نہیں کرتے۔سوائے اسکے کہ حق کا تقاضا ہو۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہمارے پیارے آقا سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کبائر (بڑے گناہ) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الکبائر :الاشراك باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس

(بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب الیمین الغموس)

کبائر یہ ہیں اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی نفس کوقتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا

اس حدیث سے واضح ہوجاتا ہے کہ قتل نفس جیسے جرم کبیر سے اہل ایمان کا دامن پاک کوتا ہے اور پاک ہونا چاہئے۔ دوسری طرف اسلامی تعلیمات کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام نے صراحت کے ساتھ یہ بتادیا ہے کہ انسان کب زندگی کے حق سے محروم ہوجاتا ہے اور وہ کون سے جرائم ہیں جن کے ارتکاب کے بعد وہ اپنے حق حیات کا مطالبہ نہیں کوسکتا اور کب وہ معاشرہ کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَیۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡیَاهَا فَکَاَنَّمَاۤ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ

(سورۃ المائدۃ: آیت:33)

جوکوئی کسی نفس کوقتل کرے بغیر اسکے کہ اس نے کسی کوقتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہوتو اس نے گویا سب انسانوں کوقتل کیا۔ جس نے کسی نفس کوزندہ رکھا گویا اس نے سب انسانوں کوزندہ رکیا۔

یہ حسین اور منفرد تعلیم ہے اسلام کی کہ ایک بے قصور کا قتل گویا ساری انسانیت کا قتل ہے اور ایک شخص کی جان بچانا گویا ساری انسانیت کو بچانا ہے۔ ایسی امن پسند تعلیم ہمیں اور کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ اس جگہ اسلام نے توریت کی مانند یہ حکم نہیں دیا کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کا قتل نہ کریں بلکہ بلاتفریق مذہب وملت تمام انسانیت کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔ اب جولوگ اسلام کے نام پر بے گناہوں کا قتل کرتے ہیں صاف ظاہر ہے کہ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ اسلامی تعلیمات کے تحت یہ گھنونا کام کرتے ہیں۔ حضورؐ نے ہر ایک کوخواہ وہ دوست ہو یا دشمن، مسلم ہو یا مشرک ہو یا کافر اس کو گلے سے لگایا اور اُس سے اسی طرح برتاؤ کیا جس سے ایک بھائی دوسرے بھائی سے کرتا ہے۔ اسلام تو ایسا امن پسند مذہب ہے کہ اس نے تو دشمن قوم حتیٰ کہ مشرکین کا بھی امن کے ساتھ زندہ رہنے کا حق بھی تسلیم کیا ہے۔ آپؐ نے ابتدائی زندگی

میں مشرکین سے دکھ پر دکھ اُٹھائے اور اس قدر آپ کو ستایا اور اذیتیں دی گئیں آپ کو ہجرت کرنا پڑی لیکن آپؐ نے مشرکین کا امن کے ساتھ زندہ رہنے کا حق بھی تسلیم کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یوں مخاطب کر کے فرمایا:

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ﴿٦﴾

(التوبہ آیت 7)

اور مشرکوں میں سے اگر کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام سُن لے۔ پھر اس کو اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دے کیوں کہ وہ ایسی قوم ہے جو حقیقت کو نہیں پہچانتی۔

غرض یہ کہ اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی شخص کا ناحق خون بہائے یا مملکت میں فساد پھیلائے اور کشت وخون کا بازار گرم کرے تو وہ اپنی جان کی حرمت ختم کو دیتا ہے۔ اس کا وجود صفحۂ زمین پر معاشرہ کی حفاظت اور امن وسلامتی کے قیام کے لئے رکاوٹ ہے اور ناقابل برداشت ہے۔ اب ریاست کا فرض ہے کہ وہ ایسے شخص کو امن وسلامتی بحال کرنے کے لئے راستہ سے ہٹائے۔ اسے کسی پہلو سے بھی غلط نہیں کہا جا سکتا۔

قتل ناحق کے سلسلہ میں اسلام نے حسب ذیل ہدایات دی ہیں:

ا۔ قاتل سے قصاص لیا جائے یعنی ناحق قتل کرنے والے کو بھی بدلہ میں قتل کیا جائے۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ کسی دوسرے کو اس جرم کے ارتکاب کی ہمت نہ ہوگی اور وہ قاتل آئندہ کسی دوسرے کی بھی جان نہ لے سکے گا۔ قانون قصاص پر اگر صحیح مونی میں عمل ہو تو اقدام قتل سے پہلے آدمی ہزار بار سوچے گا کہ اس کے بعد اسے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس سے قتل ناحق کی راہ مسدود ہوگی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوٰةٌ يَّٰأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٠﴾

(البقرۃ:18)

اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو۔ تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

۲۔اگر مقتول کے ورثہ چاہیں تو قصاص کے بدلہ دیت لے سکتے ہیں یعنی خون بہا لے سکتے ہیں۔اور انہیں پوری دیت لینے اور اس میں کچھ کمی کرنے کا اختیار ہوگا۔وہ قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں لیکن حکومت کو دیکھنا ہوگا کہ آیا یہ معافی معاشرہ کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔معافی پسندیدہ عمل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی ترغیب دی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِى الۡقَتۡلٰى ؕ اَلۡحُرُّ بِالۡحُـرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰى بِالۡاُنۡثٰى ؕ فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

اے ایمان والوں تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت تو جس کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی۔تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا، یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بوجھ پر ہلکا کرنا ہے اور تم پر رحمت تو اس کے بعد جو زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(سورۃ البقرہ آیت:179)

۳۔اسلام نے ریاست کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ مقتول کے ورثاء کو ان کا حق دلوائیں۔اسی طرح اگر مقتول کے ورثاء قاتل کے ساتھ کوئی غیر شرعی اور غیر انسانی رویہ اختیار کرنا چاہیں یا قاتل کے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی انتقام کا نشانہ بنانے کی کوشش کریں یا اور کسی قسم کی ظلم و زیادتی پر آمادہ ہوں تو اس کی انہیں اجازت نہ ہوگی۔اور ریاست کا کام ہوگا کہ قانوناً انہیں اس امر سے باز رکھیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيۡنَ لَا يَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَـقِّ وَلَا يَزۡنُوۡنَ ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ يَلۡقَ اَثَامًا ۙ﴿۶۹﴾

(الفرقان آیت:69)

موجودہ دور میں عیسائی انسانیت کے حقوق کے علمبردار بنے بیٹھے اور اکثر و بیشتر اسلام کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں کہ اسلام نے ظلم و جبر کو دنیا میں رائج کیا اور لوگوں کو مذہبی بنیاد پر قتل کرنے

کی تعلم دی۔لیکن وہ اپنے گریبان میں جھانکنا بھول جاتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ عیسائیوں نے نہ صرف دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر ظلم کئے بلکہ باہم اختلافات کی وجہ سے اپنے بعض فرقوں پر بھی ایسے تشدد کئے جن کو سوچ کر بھی جسم پرلرزہ طاری ہوجاتا ہے۔

چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ سپینش انکویزیشن (Spanish Inquisition) نے جسے 1478ء میں پاپائے روم کی ایمائی اور منظوری سے قائم کیا گیا تھا مظالم کی وہ مثالیں قائم کیں جس پر چرچ آج بھی شرمندہ ہے اور تاریخ میں

Tomas de Torquemada (توماس، دے، تورقے مادا)

جیسے بدنام انکویزیٹر کو جنم دیا جس کی بربریت کی داستانیں عیسائی مذہب کی تاریخ کا ایک تاریک حصہ ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جب عیسائی فرقے Protestant کا آغاز ہوا اور اِس کے ماننے والوں نے پھیلنا شروع کیا حصوصاً اٹلی میں تو Pope Jhon III نے Cardinal Carafa کی سربراہی میں انکویزیشن قائم کی جو ایک عرصے تک قائم رہی اور نہ صرف پروٹیسٹنٹ قبول کرنے والوں پر بلکہ ایسی سائنسی تحقیقات پیش کرنے والوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا جن کی تحقیقات بائبل سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔رومن انکویزیشن 1542ء تک صرف اٹلی کی حدود میں رہی جب کارڈینل کرافا Pope Paul IV بنا تو اِس کا دائرہ وسیع ہوگیا اور اُس کی تحقیقات اور ظلم سے بشپ اور کارڈینل بھی محفوظ نہ رہے۔

(انسائیکلو پیڈیا انکارٹا زیز لفظ Inquisition)

اسکے مقابل پر اسلام کی کیا تعلیم تھی اور مسلمانوں کا کیا رویہ تھا؟ اس بات کو میں اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی بجائے ایک مشہور و معروف عیسائی مصنف Godfrey Higgins کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔وہ لکھتا ہے کہ:۔

"In all the history of Caliphs, there can not be shown anything half as infamous as the inquisition,

not single instance of an individual burnt for his religious opinions,nor do I believe put to death in time simply not embracing the religion of Islam....."

(128-ibid page 125)

خلفاء اسلام کی تمام تر تاریخ میں انکویزیشن جیسی بدنام چیز سے نصف سے کم بھی بدنام چیز ہمیں نہیں ملتی۔کوئی ایک واقع بھی کسی کو مذہبی اختلاف کی بنا پر جلا دینے یا کسی کو محض اس وجہ سے موت کی سزا دینے کے لئے نہیں ہوا کہ وہ مذہب اسلام کو قبول نہیں کرتا۔

۲۔سلامتی اور امن سے زندگی گزارنے کا حق

مذہب اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے بنی نوع انسان کو امن و سلامتی سے زندگی گزارنے اور دوسروں کے لئے بھی باعثِ سلامتی بننے کی سب سے زیادہ تاکید کی ہے۔آج کی اس دنیا میں امن وسلامتی کے نام نہاد علمبرداروں نے اسلام پر سب سے زیادہ اسی بات کا جھوٹا اعتراض گھڑا ہے کہ اسلام لوگوں کا امن سے رہنے کا حق چھینتا ہے جبکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے امن و سلامتی کی تعلیم کو عروج تک پہنچایا ہے اور دوسرے مذاہب چہ جائیکہ امن وسلامتی کو تمام بنی نوع انسانوں کا حق قرار دیں ،وہ غیر قوموں کے امن کو چھیننے کی ترغیب دلاتے ہیں ۔خاکسار ان مذاہب پر یا انکی مقدس کتب پر اس طرح اعتراض نہیں کر رہا جس طرح وہ اسلام پر کرتے ہیں کیونکہ بیشک وہ کتب بھی اپنی ابتدائی حالت میں منجانب اللہ تھیں ،بلکہ خاکسار انکے اس دعاوی کا توڑ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ ہی عالمی امن وسلامتی اور مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے علمبردار ہیں اور انکی تعلیم اس میدان میں اسلام سے اعلیٰ ہیں۔

سب سے پہلے ہم اہل کتاب کی تعلیم کو لیتے ہیں کیونکہ معترضین اسلام کے گروہ میں ہم سب سے آگے یہود وعیسائی مستشرقین کو ہی پاتے ہیں۔یہود وعیسائی علماء اسلام پر بے امنی کا جھوٹا

اعتراض لگانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا تو بھول ہی جاتے ہیں اور اپنی عم میں اپنی جنگی تعلیمات کو موجب امن وسلامتی سمجھ کر اسلام کی اعلیٰ وموجب امن تعلیمات کو قابل اعتراض خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ بائیبل میں لکھا ہے کہ:۔

''جب تم شہر پر حملہ کرنے جاؤ تو وہاں کے لوگوں کے سامنے امن کا پیغام دو۔ اگر وہ تمہارا پیغام قبول کرتے ہیں اور اپنے بھاٹک کھول دیتے ہیں (تو) اُس شہر میں رہنے والے تمام لوگ تمہارے غلام ہو جائیں گیا اور تمہارا کام کرنے کے لئے مجبور کئے جائیں گے۔ لیکن اگر شہر امن کا پیغام قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور تم سے لڑتا ہے تو تمہیں شہر کو گھیر لینا چاہئے۔ اور جب خداوند تمہارا خدا شہر پر تمہارا قبضہ کراتا ہے تب تمہیں تمام آدمیوں کو مار ڈالنا چاہئے۔ تم اپنے استعمال کے لئے عورتیں، بچے، جانور اور شہر کی ہر ایک چیز لے سکتے ہو۔ خداوند تمہارے خدا نے تمہارے دشمنوں کی مالِ غنیمت تم کو دی ہیں۔ جو شہر تمہاری ریاست میں نہیں ہیں اور بہت دُور ہیں، اُن سبھی کے ساتھ تم ایسا برتاؤ کرو گے''

(استثناء باب ۲۰ آیت ۱۰ تا ۱۵)

اسکے بعد جب ہم ہندو مذہب کی تعلیمات پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ گویا ایک انسان اگر نچلی ذات کا ہے یعنی شودر ہے تو اُسے انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کا حق ہی نہیں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر اسکے ساتھ سلوک کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ مَنُو جو تمام ہندو قوم آریہ اور سناتن دھرم کا تسلیم شدہ مشارح قانون ہے لکھتا ہے کہ:۔

''شودر اگر وید کو سن لے تو راجہ سیسہ اور لاکھ سے اُس کے کان بھر دے۔ وید منتروں کا اُچارن (تلاوت) کرنے پر اسکی زبان کٹوا دے۔ اور اگر وید کو پڑھ لے تو اس کا جسم ہی کاٹ دے۔''

(گوتم سمرتی ادھیائے ۱۲)

اسی طرح وید میں غیر قوموں کے لئے جو تعلیم موجود ہے وہ نہایت ہی خطرناک ہے۔ رِگ وید

میں ویدک دھرم کے مخالفین کو کُتّا قرار دیتے ہوئے یہ بددعا کی گئی ہے کہ:۔

''اے آگ دیوتا تُو ان بُرے کتوں (یعنی مخالفین) کو دُور لے جا کر باندھ دے۔''

اتھروید میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو جکڑ کر ان کے گھروں کو لوٹ لینا چاہئے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

''اے ویدک دھرمی لوگو! تم چیتے جیسے بن کر اپنے مخالفین کو پھاڑ دو اور پھر ان کے کھانے تک کی چیزیں زبردستی اٹھالو''

(اتھروید کانڈ ۴ سوکت ۲۲ منتر ۷)

اسی طرح وید میں چاند، سورج، آگ، پانی اور اندر سے یہاں تک کہ گھاس سے بھی یہ دعائیں کی گئی ہیں کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے گویا کہ انہیں جینے کا کوئی حق ہی نہیں۔

(سام وید پارٹ دوم کانڈ ۹ سوکت ۲ و ۳ منتر ۹)

پھر ہندو دھرم میں یہ تعلیم بھی موجود ہے کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کے ساتھ بات چیت بھی نہ کرو۔

(گوتم دھرم سوتر ادھیائے ۵)

ان تعلیمات کے مقابل پر جب ہم اسلام کی تعلیمات کا ملاحظہ کرتے ہیں تو یہ بات اظہر من الشّمس نظر آتی ہے کہ اسلام نے نہ صرف امن وسلامتی سے رہنے کی اعلیٰ تعلیم دی ہے بلکہ قیام امن کی خاطر معقول طور پر جنگ کرنے کی بھی بعض مخصوص حالات میں اجازت دی ہے۔ اور بانئ اسلامؐ نے اپنے اسوہ حسنہ کے ذریعہ مسلمانوں کو امن پسند بننے کی ھداہت فرمائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہ صرف مسلمانوں کو امن وشانتی کے ساتھ رہنے کی تعلیم دی بلکہ وہ بنیادی اصول بیان فرمائے جن سے دنیا میں مختلف قوموں، نسلوں طبقوں کے لوگ ایک دوسرے سے امن کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اس کی بھی تاکید کی اور اپنے عمل سے کر کے دکھایا کہ تم بھی غیر قوموں کے معبودوں کے علاوہ ان کے تسلیم شدہ بزرگوں کی عزت وتکریم

کرنا ایسا کرنے سے کینہ وبغض دور ہو جائے گا۔تم دنیا میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ

(سورۃ النحل آیت 37)

یعنی ہم نے ہر قوم میں اپنا رسول بھیج کر لوگوں کو یہ ہدایت دی کہ خدا کی پرستش کرو اور شیطانی رستوں کے قریب نہ جاؤ۔بعض نے ہماری نصیحت کو مانا اور بعض نے گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا۔

اس ارشاد ربّانی کے مطابق بانیٔ اسلام حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر قوم و ملت و مذہب کے رہنماؤں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ہمیشہ اپنی زندگی میں اُن کا نام اور اُن کی تعلیمات کو سراہا۔

قارئین کرام! تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زندگی میں کبھی کسی غیر قوم کے معبودوں اور رہنماؤں کو بُرا بھلا نہیں کہا۔بلکہ آپ نے اپنی امت کو تاکید کرتے ہوئے یہ ہدایت فرمائی کہ:

إِذَا أَتَاكُمْ كَرِيمُ قَوْمٍ فَأَكْرِمُوهُ

(ابن ماجہ)

جب تمہارے پاس کسی قوم کا بڑا آدمی آئے تو اس کا واجبی اکرام کرو۔جب ہم ایسا کریں گے تو ایک دوسرے سے پیار و محبت پیدا ہوگا۔دراصل یہ وہ عظیم تعلیم اور اُسوۂ حسنہ ہے جو امن و سلامتی کا ضامن ہے۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے کسی یہودی کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حضرت موسیٰؑ پر ایسے رنگ میں فضیلت بیان کی جس سے یہودی کو صدمہ پہنچا۔آپؐ نے اس صحابی کی ملامت فرمائی اور فرمایا کہ یہ تمہارا کام نہیں کہ خدا کے نبیوں کو اس طرح بعض کو بعض سے افضل بیان کرتے پھرو۔پھر آپؐ نے حضرت موسیٰؑ کی جزوی فضیلت بیان کرکے اس یہودی کی دلداری فرمائی۔

قارئین کرام! حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں کفار مکہ سے ہر قسم

کے دُکھ اُٹھانے کے بعد الٰہی منشاء کے مطابق مدینہ کی طرف آپ کو ہجرت کرنا پڑی۔ جب اُن لوگوں نے آپ کو وہاں بھی چین سے زندگی بسر کرنے نہیں دی تو اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آکر آپ کو دفاعی جنگوں کی اجازت ملتی ہے اور ہر وقت جب آپؐ کسی فوجی دستہ کو روانہ فرماتے تو یہ ہدایت بھی دیتے کہ:۔

اُغْزُوْا بِسْمِ اللّٰہِ وَقَاتِلُوا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تَغْلُوْا وَلَا تَغْدَرُوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِیْداً وَلَا اِمْرَأَۃً۔ وَلَا تَقْتُلُوْا اَصْحَابَ الصَّوَامِعِ۔ وَلَا تَقْتُلُوْا شَیْخاً وَلَا طِفْلاً وَلَا صَغِیْراً وَلَا اِمْرَاۃً۔ وَلَا تَقْتُلُوْا اَصْحَابَ الصَّوَامِعِ۔ وَلَا تَقْتُلُوْا شَیْخاً فَانِیاً وَلَا طِفْلاً وَلَا صَغِیْراً وَلَا اِمْرَاۃً وَاَصْلِحُوْا وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔

اے مسلمانو! نکلو اللہ کا نام لے کر اور جہاد کرو حفاظت دین کی نیت سے۔ مگر خبردار مالِ غنیمت میں بددیانتی نہ کرنا اور نہ کسی قوم سے دھوکا کرنا اور نہ دشمنوں کے مقتولوں کا مثلہ کرنا اور نہ بچوں اور عورتوں اور مذہبی عبادت گاہوں کے لوگوں کو قتل کرنا اور نہ بوڑھوں کو قتل کرنا اور ملک میں صلاح کرنا اور لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

یہ واقعات اس بات پر گواہ ہیں کہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قیام امن کے لئے ایسا کرتے تھے۔ آپ کیوں ایسا نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا عظیم دین عطا فرمایا تھا جس کا نام ہی سلامتی و امن ہے یعنی اسلام جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ

(البقرہ آیت ۱۱۳)

آخر پر خاکسار اس مضمون کے ایک غیر مسلم کے تاثرات پیش کرتا ہے۔ چنانچہ جناب گرودت سنگھ دارا بیرسٹر ایڈوکیٹ بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

''حضرت محمد صاحب کا دل انتہائی نرم اور محبت و شفقت سے پُر تھا۔ انہوں نے کبھی بھی ذات پات کا بھید بھاؤ نہیں کیا۔ جو لوگ حضرت محمد صاحب پر جبر کا الزام لگاتے ہیں وہ آپؐ کی

سیرت اور تعلیمات میں سے اس کا ثبوت تو دیں۔ الزام لگانے والوں کو اپنی زبانوں پر کنٹرول کرنا چاہیے۔۔۔۔ بیشمار لوگ حضرت محمد صاحب میں عقیدت رکھتے ہیں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ آپ جنگ کی نیت سے کبھی نہیں لڑے نہ آپ نے لوگوں کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔‘‘

(نورِ الٰہی مصنفہ باباورسا سنگھ جی شائع کردہ گوبندسدن گدائی پور مہرولی نئی دہلی صفحہ 14)

۳۔حق مساوات

مساوات کو انسان کا بنیادی حق ہی نہیں بلکہ تمام حقوق کی اساس کہا جاتا ہے۔ حقوق انسانی کے عالمی منشور میں جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے متعلق کہا گیا(Universal Declaration of Human Rights) ہے کہ یہ حقوق سب کو یکساں حاصل ہوں گے۔ اس میں نسل، رنگ، جنس (مرد اور عورت) زبان، مذہب، سیاسی یا دیگر افکار و خیالات، سماجی ومعاشی حیثیت اور جائے پیدائش کی بنیاد پر فرق و امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ یہی بات بین الاقوامی سیاسی وسماجی معاہدہ(International Covenanat on Civil and Political Rights) میں کہی گئی ہے۔

ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ان حقوق کو پامال نہ ہونے دے اور اس کے تقاضوں کو زندگی کے کسی بھی معاملہ میں متاثر ہونے سے بچائے۔

(بحوالہ Human Rights International Challenges volume1 page 79-84)

دنیا نے مساوات کے تصور کو آج جتنی اہمیت دی ہے اور اس کے متعلق قوانین بنائے ہیں، اسلام نے اسے اس سے بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ وحدت انسانیت اور مساوات کا تصور اسلام کی اساسی تعلیمات میں شامل ہے۔ اور اسلام نے اس مسئلہ کو اس وقت اُجاگر کیا جب دنیا اس سے بے خبر اور ناآشنا تھی۔

انسانوں کے درمیان رنگ ونسل، زبان، خطۂ ارض، جنس، عہدہ اور منصب اور صنعت وحرفت

وغیرہ کا فرق فطری طور پر پایا جاتا ہے لیکن اس فرق کو انسان کے اپنی نادانی سے یہی نہیں کہ اسے حقیقی فرق سمجھ لیا بلکہ اسے بلندی وپستی کا معیار بھی قرار دے دیا۔ کبھی اس نے سفید فام کو سیاہ فام سے اونچا قرار دیا، کبھی کسی خاص نسل کی دوسری نسلوں سے برتری کا تصور اس پر چھایا رہا، کبھی کسی زبان کے بولنے والوں کو دوسری زبان بولنے والوں پر برتر سمجھ بیٹھا۔ یہی وجہ کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے آپ کا اللہ کا پیارا اور سب سے برتر قوم قرار دیا اور دیگر اقوام کو پست خیال کیا۔ اسی طرح آریہ مذہب والوں کے نزدیک خدا صرف سنسکرت زماب ہی میں الہام کرتا تھا اور صرف آریہ ہی خدا کی اعلیٰ قوم ہے۔ ایک فرق ایسا ہے جو آج بھی مساوات کے ہزار دعوؤں کے باوجود باقی ہے اور وہ فرق ہے عورت پر مرد کی برتری کا فرق۔ اسلام نے انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز کے اس تصور پر کاری ضرب لگائی اور اس حقیقت کو اُجاگر کیا کہ انسانوں کے درمیان فرق و اختلاف دراصل محض باہم تعارف کا ذریعہ ہے، یہ حقیقی فرق نہیں ہے۔ یہ فرق اسلئے ہے کہ تا معلوم ہو کہ کس فرد کا کس سرزمین سے تعلق ہے اور وہ کونسی زبان بولتا ہے اور اسکی جنس کیا ہے۔ یہ تعارف اصلاً ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کا ذریعہ ہے۔ اگر تمام بنی نوع انسان کے رنگ روپ اور شکل وصورت وغیرہ ایک ہوتی تو انہیں پہچانا نہ جاتا، انسانوں کے درمیان یہ فرق قدرت کی نشانی ہے کہ اس نے اتنے فرق اور رنگارنگی کے اندر نوعِ انسانی کی وحدت قائم رکھی ہے۔ یہ کثرت میں وحدت کی دلیل ہے، اختلاف اور انتشار کی دلیل نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۴﴾

(الحجرات:14)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بیشک تم میں سے سب سے بزرگ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے۔ یقیناً اللہ علیم وخبیر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فتحِ مکہ کے بعد جو خطبہ دیا، اس میں قومی اور نسلی برتری کے احساسات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور بتایا کہ آدم کی اولاد سب ایک حیثیت کی مالک ہے، ہاں تقویٰ اور خدا ترسی سے انسان عزت وسربلندی کے مقامِ رفیع تک پہنچتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

یا یہا الناس الا ان ربکم واحد و ان أبا کم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لأحمر علی اسود ولا لأسود علی احمر الا بالتقوی

(مسند احمد ۵/ ۴۱۱)

اے لوگو! سن لو بیشک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ (بھی) ایک ہے۔ سن لو کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سفید کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سفید پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ کے یعنی جس کے اندر جتنا تقویٰ ہوگا اتنا ہی وہ صاحب فضیلت ہوگا۔ یہ انسان کی مساوات کا واضح Declaration تھا کہ کسی بھی فرد کو کسی بھی ظاہری وجسمانی وجہ سے کسی دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہے سب برابر ہیں۔ انسانوں کے درمیان فرق وامتیاز اوران پر ظلم وزیادتی خدا کی آتش غضب کو بھڑ کاتی ہے۔ جس قوم کو تکبر کا یہ کیڑا لگ جائے وہ بالآخر ضرور ہلاک ہوتی ہے اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ فرعون کا تکبر بھی اسی قسم کا تھا اور وہ بنی اسرائیل کو محض غلام خیال کرتا تھا۔ اسکا انجام آج تک دنیا کے سامنے مصر میں موجود ہے۔ قرآن مجید نے فرعون کے ظلم کو جگہ جگہ نمایاں کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے اس ظلم کے مقابلہ میں بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم کو اوپر اٹھایا اور انہیں طاقتور بنایا۔

(سورۃ القصص آیت ۵)

قرآن نے فرعون کا واقع بیان کر کے اس بات کا واضح اعلان کر دیا کہ حکومت واقتدار کسی بھی طبقہ یا گروہ کو غلام بنانے کے لئے نہیں ہے۔ ریاست کا ہر فرد اور ہر گروہ اپنے حقوق رکھتا ہے۔ ریاست اسے کسی بھی حیلے بہانے یا برتری اور کم تری کے جھوٹے احساسات کے تحت ختم نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اس جبر وتشدد اور فرعونیت کو برداشت نہیں کرتا۔

اسلامی مساوات کا اُصولی نظریہ اور دیگر مذاہب کے مقابل پر امتیازات

اسلامی مساوات کا مسئلہ ایسا ہے کہ جس کے متعلق اکثر لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔یعنی جہاں ایک طبقہ نے اسلامی مساوات کے یہ معنے سمجھ رکھے ہیں کہ اسلام میں سب چھوٹے بڑے ہر جہت سے برابر ہیں اور اسلام کسی صورت میں کسی شخص کے امتیاز یا بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا اور ہر شخص کو ہر لحاظ سے ایک لیول پر کھڑا کرنا چاہتا ہے وہیں ایک دوسرے طبقہ نے اسلام میں بھی اسی رنگ کے ناگوار طبقے بنا رکھے ہیں جو اکثر دوسری قوموں میں پائے جاتے ہیں اور ان طبقوں کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دے دئے گئے ہیں جو سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔صحیح اسلامی تعلیم کی رُو سے یہ دونوں خیالات افراط و تفریط کے طریق پر غلط اور نادرست ہیں۔اسلامی تعلیم تو یہ ہے کہ جہاں ایک طرف اسلام نے سب بنی نوع آدم کو حقوق اور ذرائع ترقی کے حصول کے معاملہ میں ایک سطح پر کھڑا کیا ہے اور کسی ناواجب نسلی اور قومی یا خاندانی یا انفرادی امتیاز کو تسلیم نہیں کیا وہاں افراد اور قوموں کی حاصل شدہ بڑائی اور ترقی کو جبر اور تشدد کے رنگ میں مٹایا بھی نہیں بلکہ ایسے اشخاص کی حاصل کردہ بڑائی اور ترقی کو تسلیم کیا ہے اور انہیں ان کی محنت کے ثمر سے محروم نہیں کیا۔البتہ اسلام نے اس صورت میں گرے ہوئے لوگوں کو اُٹھانے کے لئے موثر تدابیر ضرور اختیار کی ہیں اور یہی وہ اعلیٰ اور وسطی طریق ہے جسے نظر انداز کر کے آجکل دنیا مختلف قسم کے فتنوں کا شکار بن رہی ہے اور کمزوروں کو انکے جائز حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے ۔اسلامی مساوات کے اصولوں کو سمجھنے کیلئے ہمیں قرآن کریم کی پر غور کرنے کی ضرورت ہے :-

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۲

(سورۃ النساء آیت:2)

یعنی اے لوگو! تم آپس کے معاملات میں خدا کا تقویٰ اختیار کیا کرو اور اسی سے ڈرتے رہو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس ایک جان سے اُس نے اس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے اُس نے دنیا میں کثیر التعداد مرد اور عورت پھیلا دئے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اُس ابدی حقیقت کی طرف توجہ دلا کر کہ وہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں دنیا میں صحیح مساوات کی بنیاد قائم کر دی ہے اور اس اصول کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خواہ بعد کے حالات کے نتیجہ میں مختلف انسانوں اور مختلف طبقات میں کتنا ہی فرق پیدا ہو جائے لیکن انہیں آپس کے معاملات میں کبھی اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ بہر حال اپنی اصل کے لحاظ سے وہ ایک ہی باپ کی نسل ہیں۔ اور اگر ایک باپ کے بیٹوں میں سے بعض بچے دوسروں کی نسبت زیادہ دولت یا طاقت حاصل کر لی تو وہ اس فرق کے باوجود بھائی بھائی ہی رہتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''جب تم ایک شخص کی اولاد ہو تو پھر کبریائی کس لئے؟ تقویٰ میں امن پیدا ہوتا ہے اور کبریائی سے فساد اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (الحجرات:۱۴) میں بتایا ہے کہ اللہ کے نزدیک معزز اور مکرم صاحبِ تقویٰ ہے نہ کہ اعلیٰ ذات والا۔''

(حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ۱)

اسی طرح قرآن کریم میں دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ ۔۔۔۔﴿۱۱﴾

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا خَیۡرًا مِّنۡہُمۡ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُنَّ خَیۡرًا مِّنۡہُنَّ ۚ

(سورۃ الحجرات آیت: 11، 12)

یقیناً سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔۔۔سوائے مسلمانو! تم میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر ہنسی نہ اڑائے اور اسے ذلیل خیال کرے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ فریق جس پر تم ہنسی اڑاتے وہ تم سے بہتر ہو۔

اسی طرح اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خطبہ جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ کے مقام میں دیا تھا (جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے) بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس کے ہر لفظ سے اسلامی مساوات کا خوبصورت چہرہ صاف نظر آتا ہے۔

اس کے مقابل پر دیگر مذاہب میں انسانی مساوات کی تعلیم کس قدر ناقص اور انسانی فطرت کے خلاف ہے اسکی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:۔

ہندوستان کے سب سے بڑے مذہب ہندو مذہب نے معاشرہ کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے الگ الگ لوگوں کے لئے الگ الگ حقوق قرار دئے اور مساوات انسانی کو پسِ پشت ڈال دیا چنانچہ ہندومت نے براہمن، چھیتری، ویشیہ اور شودر کی تقسیم کر کے بنی نوع انسان کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد شودروں کے تمام حقوق غصب کر لئے گئے اور ان کے ساتھ ایسے سلوک کرنے کی ہدایت دی گئی کہ جیسے وہ جانور ہوں۔ ان کا یہ فرض قرار دے دیا گیا کہ وہ ساری زندگی براہمن کی خدمت کریں اور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ نہ کریں۔ چنانچہ ہندو مذہب کی مقدس کتب میں درج ہے کہ:۔

''اگر شودر دھن جمع کرے تو راجہ کا فرض ہے کہ وہ اُس سے چھین لے کیونکہ شودر مالدار ہو کر براہمنوں کو دُکھ دیتا ہے۔''

(منوادھیائے ۹ شلوک ۶۷)

اسی طرح یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ:۔

''براہمن شودر سے دولت لے لے، اس میں کوئی وچار نہ کرے کیونکہ وہ دولت جو اُس نے جمع کی ہے وہ اُس کی نہیں بلکہ براہمن کی ہے۔''

(منوادھیائے ۸ شلوک ۴۱۷)

ان شلوکوں کی تفسیر کرنی ضروری نہیں کیونکہ ہر عاقل ان کو پڑھنے کے بعد خوب سمجھ سکتا ہے کہ یہ تعلیم کس حد تک مساواتِ انسانی کا حق ادا کر رہی ہیں؟

اسکے بعد جب ہم یہودیت پر نظر دوڑائیں تو اُس نے بھی اندھوں اور لنگڑوں اور بیماروں کو اپنے معاشرہ سے الگ قرار دے دیا ہے اور انہیں ناپاک سمجھنے کا حکم دیا۔

(ملاحظہ ہو احبار باب ۲۱ آیت ۱۶ تا ۲۳)

اس طرح یہودیت نے بھی مساوات انسانی کو قائم نہیں رکھا اور معاشرہ کے ایک بڑے طبقہ کے حقوق ختم کر دئے ہیں۔

مساوات کے بارہ میں اسلامی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

(آل عمران آیت:111)

یعنی تم سب سے بہتر جماعت ہو جسے لوگوں کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔تم نیکی کی ہدایت کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بہتر امّت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں تمام بنی نوع انسان اور سب دنیا کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔یعنی اسلام میں چھوٹے بڑے، کالے گورے، امیر غریب کمزور اور طاقتور سب برابر ہیں۔ یہ عالمگیر مساوات ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ

(الحجرات آیت:۱۱)

مومنوں کا رشتہ آپس میں بھائی بھائی کا ہے پس تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ فرماتا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ

(الحجرات آیت:12)

اے مومنو کوئی قوم کسی قوم سے اس کو حقیر سمجھ کر ہنسی مذاق نہ کیا کرے ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہو اور نہ کسی قوم کی عورتیں دوسری اقوام کی عورتوں کو حقیر سمجھ کر ان سے ہنسی کیا کریں ممکن ہے وہ دوسری قوم یا حالات والی عورتیں ان سے بہتر ہوں۔

ان آیات میں یہ سنہری اصول مضمر ہے کہ مسلمانوں کا آپس میں تعلق اخوت اسلامی پر مشتمل ہونا ازبس ضروری ہے اور مسلمانوں کو نہ صرف آپس میں بلکہ تمام مذاہب کے پیروؤں اور تمام اقوام کے ساتھ مساوات کا سلوم کرنا چاہئے تا دنیا میں امن صلح اور عالمگیر اخوت پیدا ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ پھر فرماتا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝

(الحجرات آیت:14)

اے لوگو ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو گروہوں اور قبائل میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اللہ یقیناً بہت علم رکھنے والا اور بہت خبر رکھنے والا ہے۔

یعنی قومیں اور نسلیں صرف امتیاز کے لئے ہیں جو ان کو تفاخر اور تکبر کا ذریعہ بناتا ہے وہ اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں اپنے ارشادات میں مساوات انسانی پر بہت زور دیا ہے۔ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا:۔

''تمام مسلمان ایک جسم کے مختلف حصے ہیں جب ان کے ایک حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو تمام جسم تکلیف برداشت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ تمہارے درمیان تمام

اختلافات کو مٹا دیا ہے تمام مسلمان حضرت آدم کی اولاد ہیں اور حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا۔ایک عرب کو ایک عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور ایک عجمی کو کسی عرب پر فضیلت نہیں۔‘‘

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ سے ایک حدیث مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایک عہد کیا کہ وہ نمازوں کی پابندی کریں گے زکوۃ باقاعدہ ادا کریں گے اور تمام مسلمانوں کے ساتھ مساوات اور نیکی کا سلوک روا رکھیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا کہ ایک انسان اُس وقت تک مومن نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اپنے دوسرے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(بخاری ومسلم)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے مساوات انسانی کے قیام کے لئے کیا عملی اقدامات کئے۔ مساوات کے قیام کے لئے اسلام نے سب سے پہلے غلامی کو مٹایا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے سارا زور اس امر پر صرف کیا کہ دنیا سے غلامی کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے چنانچہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قرآن کریم نے ایک اصول بیان کیا ہے جو سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے یہ اصول قرآن کریم میں اس طرح مذکور ہے:۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً۔

(سورۃ محمد آیت:۵)

یعنی جب کوئی غلام پکڑا جائے تو اُس کے بارہ میں شریعت اسلام میں صرف دو ہی حکم ہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو یا جُرم کا جُرمانہ وصول کر کے چھوڑ دو قید کا حکم کہیں نہیں۔جرمانہ کے بارہ میں شرط ہے کہ اگر غلام مکاتبت چاہے تو مکاتبت کر سکتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ غلام قاضی کے پاس جا کر کہہ دے کہ میں آزاد ہونا چاہتا ہوں۔تم میرا جرمانہ مقرر کرو میں محنت مزدوری کر کے اپنی کمائی میں سے ماہوار قسط تمہیں دیتا چلا جاؤں گا۔جب کوئی غلام پر مطالبہ کرے تو اسلامی

شریعت کے ماتحت قاضی کے پاس مقدمہ جائے گا اور وہ اس کی لیاقت کو دیکھ کر اس کے ذمہ ایک رقم مقرر کردے گا۔ اب دیکھیں اس تعلیم کے ہوتے ہوئے کیا کوئی شخص اپنی مرضی کے خلاف غلام رہ سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کے بعد تمام غلام آزاد کر دیئے تھے۔ حضورؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن سے کر دی حالانکہ عرب غلام کے ساتھ شادی کو بہت برا سمجھتے تھے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کے بارہ میں اسلامی تعلیم کا منشاء یہ تھا کہ مسلمان ان کے ساتھ بالکل اپنے قریبی عزیزوں کی طرح سلوک روا رکھیں۔ اسی طرح حضرت اسامہؓ جو حضرت زیدؓ کے بیٹے تھے انہیں آنحضرت صل اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک ایسے لشکر کا سردار مقرر کیا جس میں دس ہزار مسلمان شامل تھے اور جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تک شامل تھے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کی کون سی قوم ہے جس نے لوگوں کو اس قسم کی آزادی عطا کی ہو اور مساوات کا یہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا ہو کہ آزاد شدہ غلام کے بیٹے کو ایک لشکر جرار کا سردار مقرر کیا ہو اور اس لشکر میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ بھی شامل ہوں۔

حدیث میں آتا ہے حضرت ابوزرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جب کسی شخص کے ماتحت کوئی غلام ہو تو اُسے چاہئے کہ اُسے وہی کھانا دے جو وہ خود کھاتا ہے اور وہی لباس دے جو وہ خود پہنتا ہے اور تم اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دیا کرو جو اُن کی طاقت سے زیادہ ہو۔

(بخاری)

یہ حدیث اپنے مطلب میں نہایت واضح ہے اور اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ غلاموں کے ساتھ کامل درجہ کا حسن سلوک اور انتہائی شفقت کا حکم دیا گیا ہے۔ دراصل اس تعلیم کا اصل منشاء یہ تھا کہ مسلمان اپنے غلاموں کو بالکل اپنے بھائیوں کی طرح سمجھیں تا کہ اُن کے تمدن اور معاشرت میں اسی طرح کی بلندی پیدا

ہو جائے جیسا کہ دوسرے آزاد لوگوں میں ہے اور ان کے دلوں سے پستی کے احساسات بالکل محو ہو جائیں۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں حضرت ابونوارؓ جو روئی کے کپڑوں کی تجارت کرتے تھے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ ان کی دوکان پر آئے اور اس وقت ان کے ساتھ ان کا غلام بھی تھا۔ حضرت علیؓ نے دو قمیضیں خریدیں اور پھر اپنے غلام سے کہا کہ ان میں سے جو قمیض تم چاہو لے لو چنانچہ غلام نے ایک قمیض چُن لی دوسری قمیض حضرت علیؓ نے خود پہن لی۔

(اسد الغابہ حالات حضرت علیؓ)

اس حسن سلوک کے پیچھے وہی جھلک نظر آتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عملی نمونہ سے غلامی کو دور کرنے کے لئے پیش کی کہ یہ غلام جلد تر اخلاق و معاشرت میں آزاد لوگوں کے مرتبہ کو پہنچ کر آزاد کئے جانے کے قابل ہو جائیں۔ پس غور کریں کیا دنیا کا کوئی مذہب یا دنیا کی کوئی قوم اس مساوات کی مثال پیش کر سکتی ہے؟ یہی مساوات کی عالمگیر دلکش دلربا اور حسین تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کو دنیا کا سردار بنا دیا۔

مساوات کے قیام کے لئے اسلام کا دوسرا اہم حکم: جس پر تمام صحابہؓ شدت سے عمل کرتے تھے یہ ہے کہ اسلام نے جُرم کی سزا میں چھوٹے بڑے کا کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ اسلام کے نزدیک مجرم خواہ بڑا ہو یا چھوٹا بہر حال وہ تعزیر کا مستحق ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک عورت نے جو کسی بڑے قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی چوری کی اور معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا ساتھ ہی چند لوگوں نے سفارش کر دی کہ یہ بڑے خاندان کی عورت ہے اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے اور معمولی تنبیہ کر دی جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا تو آپؐ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور حضورؐ نے فرمایا خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالوں

اور پھر فرمایا دیکھو پہلی قومیں یعنی یہود اور نصاریٰ اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی جُرم کرتا تو اُسے سزا نہ دیتے مگر اسلام میں اس قسم کا کوئی امتیاز نہیں جو شخص جو جُرم کرے گا اُسے سزا دی جائے گی خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔

تمدنی معاملات میں مساوات کی اہمیت: اس بارہ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف فرما تھے مجلس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضورؐ کے بعض رشتہ دار بھی موجود تھے۔ ایک شخص دودھ کا پیالہ لایا اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا حضورؐ نے کچھ دودھ نوش فرمایا اور پھر خیال آیا کہ باقی دودھ حضرت ابوبکر کو دے دیں مگر آپؐ نے دیکھا کہ وہ حضورؐ کے بائیں طرف بیٹھے ہیں اور باقی رشتہ دار دائیں طرف اور حضورؐ کے دائیں طرف ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اسلام نے چونکہ دائیں طرف والے کا حق مقدم رکھا ہے اس لئے حضورؐ نے اس لڑکے کو کہا کہ اگر تم اجازت دو تو یہ دودھ حضرت ابوبکر کو دے دوں اِس لڑکے نے کہا کہ یارسول اللہ یہ میرا حق ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ دائیں طرف بیٹھنے کی وجہ سے دودھ پر تمہارا ہی حق ہے اس لئے میں تم سے اجازت چاہتا ہوں کہ میں یہ دودھ ابوبکرؓ کو دے دوں اُس نے کہا یارسول اللہ جب یہ میرا حق ہے تو پھر آپ کے تبرک کو کوئی کس طرح چھوڑ سکتا ہے یہ کہہ کر اُس نے دودھ کا پیالہ پینا شروع کر دیا۔ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عملی نمونہ سے اسلامی مساوات کے تمام پہلوؤں پر سیر کن روشنی ڈالی اور پھر ان پر ذاتی طور پر عمل پیرا ہو کر ثابت فرما دیا کہ اسلام واقعی عالمگیر مذہب ہے۔

مرض الموت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری بیماری میں اسلامی مساوات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ایک روز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنی وحی کے ذریعہ مجھ پر واضح کر دیا ہے کہ اب میری وفات کا وقت قریب ہے۔ اُس وقت تمام صحابہؓ پر رقت طاری تھی۔ آپ نے مجلس میں

صحابہؓ کو نصائح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو اسلامی قانون کے لحاظ سے مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں اگر میری زندگی میں کسی کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے اور فرمایا کہ اس معاملہ میں اس دنیا میں اس کی تلافی ہو جائے تو میں اسے زیادہ پسند کروں گا بہ نسبت اس کے کہ اس کی وجہ سے خدا تعالیٰ مجھ سے جواب طلبی کرے۔ جب حضورؐ نے یہ فرمایا تو ایک صحابیؓ اُٹھے اور کہا یا رسول اللہؐ میرا ایک حق آپ کے ذمہ ہے آپ نے فرمایا وہ کیا ہے۔ صحابیؓ نے کہا کہ فلاں موقع پر جبکہ لڑائی میں آپ مسلمانوں کی صفیں درست کر رہے تھے تو آپؐ کی کہنی مجھے لگ گئی۔ آپؐ نے فرمایا کہاں لگی تھی۔ صحابیؓ نے پیٹھ دکھائی اور کہا اس جگہ لگی تھی۔ حضورؐ اُس وقت بیٹھ گئے اور فرمایا میرے بھی اُسی جگہ کہنی مارو اس صحابینے کہا یا رسول اللہؐ اس وقت میرے تن پر کرتہ نہ تھا اور ننگے جسم پر حضورؐ کی کہنی لگی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا بہت اچھا اور یہ کہہ کر حضورؐ نے پیٹھ پر سے کپڑ اُٹھایا اور فرمایا اب کہنی مارلو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کرتہ اُٹھایا اور فرمایا کہ تم نے ٹھیک کیا کہ مجھ سے اس دنیا میں بدلہ لینے لگے اور قیامت پر اُسے اٹھا نہیں رکھا تو وہ صحابیؓ نم آنکھوں کے ساتھ آپؐ پر جھکے اور آپ کی پیٹھ پر بوسہ دیتے ہوئے کہا یا رسول اللہؐ بے شک مجھے کہنی لگی تھی مگر میں نے یہ بہانہ صرف اس لئے کیا تھا تا کہ میں اُس وقت جب حضورؐ اپنی جُدائی کا ذکر فرما رہے ہیں آخری دفعہ حضورؐ کے جسم مبارک کو بوسہ دے لوں۔ یہ کتنی عظیم الشان مساوات ہے جو اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں قائم کی۔

(بحوالہ سیر روحانی جلد اوّل صفحہ: ۱۴۱-۱۴۰)

حضرت عمرؓ کے زمانہ کا ایک واقعہ:

جبلہ ابن ایہم ایک بہت بڑے عیسائی قبیلہ کا سردار تھا۔ جب شام کی طرف مسلمانوں نے حملے شروع کئے تو یہ اپنے قبیلہ سمیت مسلمان ہو گیا اور حج کے لئے روانہ ہوا۔ حج کے موقع پر ایک جگہ بہت بڑا ہجوم تھا۔ اتفاق سے کسی مسلمان کا پاؤں اُس کے پاؤں پر پڑ گیا۔ بعض روایات

میں ہے کہ پاؤں اُس کے جبلہ کے دامن پر پڑ گیا اُس نے غصہ میں آ کر زور سے اُسے تھپڑ مار دیا اور کہا تو میری ہتک کرتا ہے تو جانتا نہیں میں کون ہوں۔ وہ مسلمان تو تھپڑ کھا کر خاموش ہو گیا مگر ایک مسلمان بول پڑا کہ تجھے پتہ ہے کہ جس مذہب میں تو داخل ہوا ہے وہ اسلام ہے اور اسلام میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں۔ اُس نے کہا میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ اس مسلمان نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے پاس تمہاری شکایت ہوگئی تو اس مسلمان کا بدلہ وہ تم سے لیں گے۔ وہ سیدھا حضرت عمرؓ کی مجلس میں پہنچا اور پوچھا کہ اگر کوئی بڑا آدمی کسی چھوٹے آدمی کو تھپڑ مارے تو آپ کیا کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اُس چھوٹے آدمی سے اُس کے منہ پر تھپڑ لگوایا جاتا ہے۔ آپؓ نے مزید فرمایا کہ اسلام میں بڑے چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں۔ پھر آپؓ نے فرمایا جبلہ کہیں تُم ہی تو یہ غلطی نہیں کر بیٹھے اس پر اُس نے جھوٹ بول دیا اور کہا میں نے تو کسی کو تھپڑ نہیں مارا میں نے صرف ایک بات پوچھی ہے مگر وہ اُس وقت مجلس سے اُٹھا اور اپنے ساتھیوں سمیت مرتد ہو گیا اور مسلمانوں کے خلاف رومی جنگ میں شامل ہوا۔ یہ ہے وہ مساوات جس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب اور قوم میں نہیں ملتی۔

(بحوالہ سیر روحانی صفحہ: ۱۴۳-۱۴۲)

مختلف مذاہب کے درمیان صلح کی تعلیم

پھر اسلام نے مختلف مذاہب کے درمیان انصاف اور مساوات قائم کرنے کے لئے سنہری اصول فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔

(الحج آیت: ۴۱)

کہ اگر دنیا میں ہم مسلمانوں کو کھڑا نہ کرتے اور اس طرح اسلام کے ذریعہ تمام اقوام کے حقوق کی حفاظت نہ کی جاتی تو یہودیوں کی عبادت گاہیں عیسائیوں کے گرجے اور ہندوؤں کے مندر اور مسلمانوں کی مساجد امن

کا ذریعہ نہ بنتیں بلکہ فتنہ فساد اور لڑائی جھگڑوں کی آماجگاہ ہوتیں۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس سنہری تعلیم کے پیش نظر اپنی مساجد میں ہر قوم کو عبادت کا حق دیا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر بخران کے عیسائیوں کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی چنانچہ ان عیسائیوں نے مشرق رُو ہو کر عین مسجد نبوی میں اپنی عبادت کے مراسم ادا کرئے۔

(زرقانی جلد ۴ حالات وفد بخران)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی خلفاء اربعہ نے مذہبی رواداری کا کامل شاندار نمونہ قائم کیا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے بارہ میں روایت آتی ہے کہ وہ جب کبھی اسلامی فوج روانہ فرماتے تھے تو اُس کے امیر کو واضح طور پر یہ ہدایت فرماتے تھے کہ غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں اور ان کے مذہبی بزرگوں کا پورا پورا احترام کیا جائے۔

(مؤطا امام مالک کتاب الجہاد)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب شام کا ملک فتح ہوا تو جو معاہدہ وہاں کی عیسائی آبادی کے ساتھ مسلمانوں کا قرار پایا اس میں مذہبی آزادی اور مذہبی رواداری کی روح باقی سارے امور پر غالب تھی۔

(تاریخ طبری ابن جریر)

عام تعلقات میں مراتب کو ملحوظ رکھنے کی تلقین

اسلامی مساوات کے متعلق یہ بنیادی نظریہ بیان کرنے کے بعد اسلام اس سوال کو لیتا ہے کہ جب اصل کے لحاظ سے ایک ہونے کے باوجود مختلف لوگوں کے حالات اور اوصاف مختلف ہو سکتے ہیں تو پھر مختلف مدارج کے لوگوں کے متعلق عام تمدّنی معاملات میں کیا رویہ ہونا چاہیئے۔

سو اسکے متعلق حضورؑ فرماتے ہیں:

اَنْزِلُوْاالنَّاسَ مَنَازِلَھُمْ

یعنی اے مسلمانو! تمہارے لئے ضروری ہے کہ آپس کے معاملات میں لوگوں کے معروف مرتبوں کا خیال رکھا کرو اور ان کے حالات اور درجہ کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا کرو۔

(ابوداؤد کتاب الادب)

اس حدیث کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ کسی دینی یا دنیاوی بناء پر کوئی رُتبہ یا بڑائی حاصل کرلیں تو عام معاملات میں اُن کے مرتبہ کا خیال رکھنا اور اُن کے ساتھ واجبی احترام سے پیش آنا اسلامی اخلاق کا حصہ ہے۔ مثلاً آنحضرتؐ کے زمانہ کی بات ہے کہ جب یہودی قبیلہ بنوقریظہ کے فیصلہ کے لیے سعد بن معاذ انصاری قبیلہ اوس کے رئیس موقع پر تشریف لے گئے تو حضورؐ نے انہیں آتا دیکھ کر صحابہ سے فرمایا:۔

قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ

(بخاری ابواب المناقب)

یعنی اپنے رئیس (سردار) کے اِکرام اور احترام کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

اسی طرح قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو پیغامِ رسالت دے کر فرعون کی طرف بھیجا تو حضرت موسیٰؑ کو تاکید فرمائی کہ (چونکہ فرعون کو اِس وقت ملک میں رتبہ حاصل ہے اس لیے) اُس کے ساتھ نرمی اور ادب کے طریق پر بات کرنا۔ (سورۃ طٰہٰ :45)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نے مساواتِ انسانی کے متعلق بہترین تعلیم دی ہے۔ اور اس بات کا اعتراف بعض غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ جناب سردار پنچھی صاحب جو کہ سکھ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک مشہور شاعر ہیں اپنی ایک کتاب میں سردار پنچھی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

''میں نے قرآن شریف کا ہندی ترجمہ پڑھا ہے۔ رسول اللہؐ کی حالاتِ زندگی پڑھی ہے اور انہوں نے عرب کے معاشرے میں رائج روایتی رواجوں میں جو صحت مند اور انقلابی تبدیلیاں کیں میں ان سے بہت متأثر ہوا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ سکھ دھرم نے بھی اسلام سے بہت

کچھ حاصل کیا ہے۔ ذات پات کا خاتمہ، سب کو برابری کا حق، سب کا بلاتفریق مذہب وملت ایک جگہ کھانا (لنگر) کھانا داڑھی اور سر کے بال رکھنا دستار سجانا بُت پوجا کو ممنوع قرار دینا، ایک ایشور کی عبادت کرنا یہ اصلاح کُن قدم سکھ دھرم نے اسلامی تعلیم سے متاثر ہوکر اٹھائے ہیں۔ اس لئے سکھ دھرم اسلام کے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔''

(گلستانِ عقیدت مصنفہ سردار پنچھی صفحہ 6 تا 10 شائع کردہ لکنس پرکاشن جالندھر)

اسی طرح ایک اور غیر مسلم عالم گیانی ترلوک سنگھ طوفان آپؐ کی مدح میں فرماتے ہیں:۔

''جہاں بھی اسلام گیا وہاں ذات پات ختم کردی گئی۔ مسلمان بھائی بھائی بن گئے۔ ذات پات، چھوت چھات اور نسلوں کی تفریق مٹادی گئی یہ ایک عظیم انسانی خدمت تھی۔ بات یہ ہے کہ حضرت محمد صاحب اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے ایک بہترین مذہبی رہنما، بہترین لیڈر، ایک عظیم سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ رب کے سچے رسول تھے۔''

(پوتر جیون حضرت محمد صاحب جی مہاراج مصنفہ گیانی ترلوک سنگھ طوفان صفحہ 195)

آخر پر اسلام میں حق مساوات کے بارے میں سیدنا حضرت مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا ایک اقتباس جس کا اس مضمون کے ساتھ گہرا تعلق ہے، پیش خدمت ہے۔ حضور فرماتے ہیں:۔

''جب میں نے مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق وفرائض کی روشنی میں قرآنی آیات کا جائزہ لیا تو میں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایسی آیات جن میں اللہ تعالیٰ نے الناس کہہ کر مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ مخاطب کرکے احکام دیئے ہیں ان کی تعداد دوسو ستائیس 227 ہے۔ اسی طرح انسان اور الناس کہہ کر جن آیات میں مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا گیا ہے ان کی تعداد علی الترتیب اکسٹھ 61 اور سڑسٹھ 66 ہے۔ اب رہیں وہ آیات جن میں عورتوں کو جسمانی طور پر مختلف حالات کے پیش نظر صرف عورتوں کو مخاطب کرکے صرف اُنہیں حکم دئے گئے ہیں یا اُن کے بعض زائد حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔ سو اُن کی تعداد اُنچاس

49 ہے۔اس کے بالمقابل جن آیات میں صرف مردوں کا ذکر ہے وہ صرف گیارہ 11 ہیں۔‘‘
(دورہ مغرب ۱۴۰۰ھ بمطابق ۱۹۸۰ء صفحہ ۸۴)

۴۔عدل وانصاف کا حق

عدل: اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں دونوں طرفوں کا مساوی ہونا۔ افراش وتفریط، کمی وبیشی سے بچتے ہوئے درمیانی راستے کو اختیار کرنے کو اعتدال کہا جاتا ہے۔انسانوں کے درمیان مساوات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب کے ساتھ عدل وانصاف ہو، کوئی بھی شخص ظلم وزیادتی کا ہدف نہ بننے پائے۔اسلام کی تعلیمات جن اساسات پر قائم ہیں ان میں سے ایک اساس عدل و انصاف ہے۔اسلام نے عدل وانصاف کا تصور ابھارا اور اسے ایک زندہ اور فعّال تصور بنایا ۔اسلام نے سکھایا کہ یہ دنیا عدل پر قائم ہے (الرحمٰن:۶-۱۰) اور انسان کی زندگی بھی عدل ہی کی بنیاد پر درست ہوسکتی ہے۔معاشرہ کو امن میں رکھنے کے لئے عدل لازمی چیز ہے۔اللہ تعالیٰ کا پورا دین صدق وعدل پر قائم ہے:

وَ تَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا

(الانعام:۱۱۶)

تمہارے رب کی بات پوری ہے باعتبار صدق وعدل کے۔

قال البیضاوی صدقا فی الاخبار والمواعید وعدلا فی الاقضیۃ والاحکام
(تفسیر بیضاوی:۱/۳۱۸ طبع بیروت ۱۹۸۸ء)

عدل وانصاف کے لئے قرآن کریم میں دوسرا لفظ قسط بھی آیا ہے۔قسط کے معنی ہیں کہ کسی کے حقوق وواجبات کو پورا پورا ادا کرنا اور اس میں کوئی کمی نہ کرنا۔اسلام نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی بعثت کا ایک اہم مقصد عدل وقسط کا قیام ہے۔جیسا کہ فرمایا:

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ

(الحدید:۲۶)

ہم نے اپنے رسول دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اسلام جس معاشرہ کی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کا تصور عدل وانصاف کے بغیر ناممکن ہے۔ اسلام ہر قسم کے ظلم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں عدل و انصاف کی ہدایت اور ظلم و سرکشی سے ممانعت ایک ساتھ کی ہے کیونکہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٩١﴾

(النحل:91)

اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو انکا حق ادا کرنے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے، منکر سے، زیادتی اور سرکشی سے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

اسلام کی تعلیم تو اتنی حسین ہے کہ اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا رویہ اختیار کرنے کی تاکید کی ہے اور عملاً قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس تعلیم کو احسن طور پر اپنا کر دنیا کے سامنے مثالیں قائم کی ہیں۔ اسلام نے دشمنوں کے معاملہ میں جو تعلیم دی ہے وہ دیگر مذاہب کی تعلیمات سے منفرد و اعلیٰ ہے۔ کجا یہودیوں کی وہ تعلیم کہ وہ دشمنوں کی بیویوں اور بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑیں اور ہندوؤں کی وہ تعلیم کہ وہ نچلی ذات والوں کے سبھی حقوق دبا کر اُن کو عدل و انصاف سے محروم رکھیں اور کجا اسلام کی یہ تعلیم کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٩﴾

(سورۃ المائدۃ:9)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے ہو جاؤ عدل وانصاف کے شاہد بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر ہرگز آمادہ نہ کرے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو یقیناً اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

اسلام کے نزدیک اقتدار اور حکومت قیام عدل کا ذریعہ ہے۔ جس کے ہاتھ میں حکومت ہے

اسکی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ ہے کہ وہ انصاف کو ہر حال میں بلاتفریق قائم کرے۔ اسلامی ریاست اپنے وسائل کو قیامِ عدل کے لیے استعمال کریگی چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

(سورۃ ص آیت 27)

اے داؤد! یقیناً ہم نے تجھ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس تو لوگوں کے درمیان حق اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کر اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کے راہ سے بھٹکا دیگی۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم ہوا:

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

(سورۃ المائدۃ:43)

یعنی اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز عادل امام اُن سات لوگوں میں سے ایک ہوگا جنہیں عرش الٰہی کے سایہ میں جگہ ملے گی۔

(بخاری، کتاب الاذان، ۔مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

ان المقسطین عند اللہ علی منابر من نور عن یمین الرحمٰن عزوجل و کلتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمھم و اھلیھم و ما ولوا۔

(مسلم کتاب الامارۃ باب فضیلۃ الامام العادل)

یقیناً انصاف کرنے والے اللہ کے نزدیک نور کے منبروں پر جلوہ افروز ہوں گے جو رحمٰن عزوجل کے سیدھے ہاتھ کی طرف ہوں گے اور اسکے دونوں ہی ہاتھ سیدھے ہیں۔ انصاف کرنے والے وہ ہیں جو اپنے فیصلوں

میں، اہل وعیال کے معاملہ میں اور جن کے وہ والی ونگران بنائے جائیں ان سب کے سلسلہ میں انصاف کرتے ہیں۔

عدل وانصاف سے متعلق اسلام کی یہ واضح ہدایات ہیں۔ان پر صحیح معنی میں عمل درآمد ہوتو حق تلفی اور زیادتی کی بیخ کنی ہوسکتی ہے اور ہر طرح کے استحصال سے پاک معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

اسلامی نظامِ عدل کے اصول وضوابط

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔

(المائدہ:49)

پہلا اصول:- یہ بیان فرمایا کہ ''بندگانِ خدا کے درمیان احکام الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا کرو۔ نہ کہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق یعنی ہر وقت ہر لمحہ قرآن کریم کو مدِّنظر رکھو۔

دوسرا اصول:- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔

(المائدہ:8)

اسمیں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ایمان والوں کے لئے ضروری ہے کہ دشمنان کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا سلوک کیا کریں۔مثلاً اگر اسلامی حکومت ہو اور اسمیں دیگر مذاہب کے لوگ بھی ہوں۔ چاہئے کہ اُن کے درمیان بوجہ غیر مذاہب ہونے کہ الگ فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ اُن کے جائز حقوق عدل وانصاف کے ساتھ دئے جائیں۔

انسانی فطرت ہے کہ جب اپنی ذات کے متعلق کوئی بات آجاتی ہے تو اُس وقت بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔لیکن خدا تعالیٰ جماعتِ مؤمنین کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ یاد رکھو انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی ذات کے متعلق بھی کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دیا کرو۔ذات

سے مراد یہ بھی ہے کہ مثلاً کسی کا بھائی، باپ، دوست وغیرہ ہوتو اگر کسی غیر کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آئے یا غیر کا حق اُسکے پاس ہوتو جماعتِ مومنین کے قاضی کو چاہئے کہ اس وقت رشتہ داری کا خیال نہ رکھے بلکہ انصاف کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھے۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال قائم کی کہ ایک مرتبہ دربارِ رسول کی خدمت میں صحابہ کرام نے کسی شخص کی سفارش کی تو حضورؑ نے بڑے جلال سے فرمایا:۔

''خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو مَیں اُسکا ہاتھ کاٹ دیتا۔''

تیسرا اصول:۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۔

(البقرہ:284)

''کہ گواہ کو مخفی نہ رکھو، جو گواہی مخفی رکھے گا یقیناً اس شخص کا دل گنہگار ہے۔''

چوتھا اصول:۔ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ۔

(البقرہ:286)

مطلب یہ کہ کاتب اور گواہی دینے والے کو کوئی تکلیف نہ دو۔

پانچواں اصول:۔ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا۔

(النور آیۃ:5)

یعنی وہ لوگ جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کرتے تو اُنہیں اَسّی کوڑے لگاؤ اور آئندہ کبھی انکی گواہی قبول نہ کرو۔

چھٹا اصول:۔ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ۔

(النور آیت:7)

اسی طرح حدیث شریف میں آتا ہے کہ:۔

البینتہ علی المدعی والیمین علی المدعا علیہ

یعنی ثبوت کا بار مدعی پر ہے اور مدعا علیہ کے لئے قسم ہے۔(بخاری)

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک آئین قائم فرمایا اور اس آئین کے تحت حضورؐ مدینہ کے ملحقہ علاقوں اور قبائل کے چیف جسٹس تسلیم کئے گئے۔ دعویٰ نبوت کے قریباً تیرہ سال گزرنے کے بعد آپؐ نے یہ معاہدہ اوس اور خزرج کے مسلمان لیڈروں سے کیا یہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے اسکی اہم شقیں احادیث کی کتب میں موجود ہیں ابن ہشام نے اسے مکمل اور اصلی شکل میں محفوظ کر دیا ہے یہ دستور بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع ہوتا ہے اسکی پہلی شق یہ ہے:۔

ھذا کتاب من محمد النبی بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم

☆۔ یہ آئین محمد النبیؐ کی طرف سے ہے۔ یہ قریش اور یثرب کے مومنوں اور مسلمانوں کے درمیان ہے اور جو اُن کی پیروی کریں۔ اُن سے مِل جائیں، اُن سے مِل کر جہاد کریں۔ اس دستور کی دوسری تا گیارھویں شقیں اس امر پر مشتمل ہیں کہ مدینہ کے تمام قبائل، قریش کے مہاجرین کی طرح اپنے سابقہ طریق کے مطابق انصاف سے خون بہا ادا کریں گے۔ اس معاہدہ کی چند ایک شقوں کا ذکر درج ذیل ہے:۔

☆۔ مومن اپنے کسی مقروض کو بے سہارا نہیں چھوڑیں گے بلکہ معروف طریقے سے فدیہ اور خون بہا میں اسکی مدد کریں گے۔

☆۔ مومن کسی دوسرے مومن کے آزاد کردہ غلام کو اُسکے خلاف اپنا حلیف نہیں بنائے گا۔

☆۔ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کرے گا۔ اور نہ مومن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا۔

☆۔ اللہ کا ذمّہ ایک ہے چھوٹے سے چھوٹا مسلمان بھی پناہ دے سکتا ہے۔ مومن ایک دوسرے کے مددگار رہوں گے۔

☆۔ یہودیوں میں سے جو بھی ہماری پیروی کریگا اُسے مدد اور مساوات حاصل رہے

گی۔جب تک اُس سے مسلمانوں کو تکلیف نہ پہنچے، نہ وہ اُنکے خلاف دوسروں کی مدد کرے گا۔

☆۔مومنوں کی صلح ایک ہوگی۔خدا کی راہ میں دورانِ جنگ کوئی مومن دوسرے مومن سے الگ صلح نہیں کرے گا۔

☆۔کوئی مشرک قریش کو جان و مال کی پناہ نہیں دیگا اور نہ کسی مومن کے خلاف اسطرح کے کسی معاملہ میں دخل دے گا۔

☆۔کسی مومن کے لئے جو اِس آئین کا اقرار کرچکا ہو اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لاچکا ہونا جائز ہوگا کہ وہ کسی فسادی کی مدد کرے یا اُسے پناہ دے۔جو اُس کی مدد کرے گا یا اُسے پناہ دے گا تو وہ بروزِ قیامت اللہ کی لعنت اور اُس کے غضب کے نیچے ہوگا اور اُس سے کوئی فدیہ یا بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

☆۔جب بھی تمہارے درمیان کوئی اختلاف کسی بات میں پیدا ہو تو اُسے خدا اور مصطفی ؐ کی بارگاہ میں پیش کرنا ہوگا۔

☆۔وفا کو اختیار کیا جائے نہ کہ غدّاری کو۔

☆۔یہ آئین، کسی ظالم اور غدّار کے کام نہ آئے گا۔جو کوئی باہر نکلے گا امن کا حق دار ہوگا۔جو کوئی گھر میں رہے گا وہ بھی مدینہ میں امن کا حق دار ہوگا سوائے ظالم اور غدّار کے۔

زمانۂ نبویؐ میں صوبائی عدالتیں اور مقامی قاضی

امام سیوطیؒ نے امام ابن حزم کے حوالہ سے تدریب الراوی میں لکھا ہے کہ رسول کریمؐ کے صحابہ میں بلند پایہ مفتی اور اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ قاضی تھے جن کے اسماء اس طرح ہیں:۔

حضرت ابوبکر۔عثمان۔معاذ۔سعد بن ابی وقاص۔ابوہریرہ۔انس۔عبدالرحمن بن عمرو بن العاص۔سلمان۔جابر۔ابوسعید۔الزبیر۔عبدالرحمن بن عوف۔عمران بن حصین۔ابوبکرہ۔عبادۃ بن الصامت۔معاویہ۔ابن الزبیر۔ابوالدرداء یا حذیفہ۔اُم سلمہ۔رضی اللہ عنھم

شروع میں جب مسلمانوں کی آبادی کم تھی اور مدینہ ابھی ریاست کا دارالحکومت نہیں بنا تھا بلکہ ایک قصبہ تھا۔اس زمانہ میں آپ نے مدینہ کے اردگرد کے دیہاتوں کیلئے مقامی قاضی اور ماہرین قانون، دانشور مقرر کردیئے تھے۔جب مدینہ قصبہ سے بڑھتے بڑھتے ایک وسیع اسلامی ریاست کا وفاقی دارالحکومت بن گیا تو حضورؐ نے ضلعی اور صوبائی عدالتیں قائم فرمائیں جن میں ماہر قانون دان، اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ قاضی اور جج مقرر فرمائے۔اگر کوئی مقدمہ کسی ضلعی یا صوبائی جج کے لئے پیچیدہ ہوتا یا کسی ضلعی یا صوبائی عدالت کے فیصلہ کو کوئی فریق چیلنج کرنا چاہتا تو وہ مقدمہ مدینہ کی سپریم کورٹ میں چیف جسٹس یعنی رسول اکرمؐ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا تھا۔

بعض علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ مدینہ میں حضور ﷺ کی مدد کے لئے سب جج مقرر تھے۔اس تعلق میں وہ الترمذی کی احادیث اور ابن العربی کی شرح ترمذی کے حوالے پیش کرتے ہیں۔مدینہ میں آپؐ کے ماتحت و مددگار سب ججوں کے تقرر کے ثبوت میں یہاں حضرت حذیفہ کے تقرر کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

قارئین کرام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے تادمِ زیست عدل وانصاف کے تمام تقاضوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔اور اُمّتِ مسلمہ کو ایک لائحہ عمل دے کر اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔آنحضور صلیٰ اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین نے عدل وانصاف کے تقاضوں کو بمطابق ارشادِ قرآن، سنّتِ رسول اور ارشاد رسولؐ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے جب خلفاء راشدین میں سے خلیفۃ الرسول حضرت علیؓ کی وفات کے بعد مسلمان انتشار کے شکار ہوئے اور مسلمانوں کے اندر اتحّاد ختم ہوا اور دشمنانِ اسلام کے عزائم نے مسلمانوں کو منتشر کر دیا تو مسلمان عدل وانصاف کی نعمت سے محروم ہوئے اور عذابِ الٰہی اور مختلف مصائب میں گرفتار ہوئے۔لیکن بمطابق وعدہ الٰہی جب بعثتِ ثانیہ کا ظہور ہوا۔تو پھر سے خدا تعالیٰ نے قرآنی احکامات کے مطابق نظامِ عدل کا قیام فرمایا۔محب خدا و رسول اس نظام میں شامل ہوئے۔میری مراد جماعتِ احمدیہ عالمگیر ہے جس میں خدا تعالیٰ کے فضل سے بعثتِ اولیٰ کے

عین مطابق نظامِ حکومت عالمگیر اور نظام عدلیہ عالمگیر دونوں موجود ہیں ۔اور ہر فیصلہ شریعتِ اسلامیہ حقہ کے مطابق ہوتا ہے اور احمدی مسلمان مرد،عورت کو بمطابق شریعتِ اسلامیہ حقہ حقوق دیئے جاتے ہیں۔الحمدللہ علی ذالك۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

’’آج کے زمانے میں سیاست گندی ہو چکی ہے،انصاف اور تقویٰ سے عاری ہے۔وہ مسلمان ریاستیں جو اسلام کے نام پر اپنی برتری کا دعویٰ کرتی ہیں اُن کی وفا بھی آج اسلامی اخلاق سے نہیں اور اسلام کے بلند و بالا انصاف کے اصولوں سے نہیں بلکہ اپنی اغراض کے ساتھ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیر قومیں انصاف کے نام پر بڑے بڑے دعوے کر رہی ہیں گویا وہی ہیں جو دُنیا میں انصاف کو قائم رکھنے پر مامور کی گئی ہیں اور اُن کے بغیر،اُن کی طاقت کے بغیر انصاف دُنیا سے مٹ جائے گا اور مسلمان ریاستیں اسلام کے نام پر بڑے بڑے دعاوی کر رہی ہیں۔مگر جب آپ تفصیل سے دیکھیں تو انصاف کا یعنی اس انصاف کا جو قرآن کریم پیش کرتا ہے ایک طرف بھی فقدان ہے اور دوسری طرف بھی فقدان ہے۔‘‘

(خلیج کا بحران صفحہ ۴۱)

۵۔قانون کی برتری

اسلام نے عدل وانصاف پر مبنی قانون ہی نہیں دیا بلکہ اس کی برتری بھی قائم کی ہے۔اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔اس میں چھوٹے اور بڑے امیر وغریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کے سامنے سر جھکا دے ورنہ یہ اسکے نفاق اور کمزور ایمان کی دلیل ہوگی:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔

(الاحزاب:37)

ترجمہ: اور نہیں ہے جائز کسی مومن مرد کے لئے اور نہ مومن عورت کے لئے کہ جب اللہ اور اسکا رسول کوئی فیصلہ کردے تو پھر انہیں اپنے معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جو اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

قانون کی برتری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس قبیلہ کے لوگوں نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی کہ وہ آپؐ سے سفارش کریں کہ اسکے ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ حضرت اسامہؓ کے سفارش کرنے پر نبی کریمؐ نے ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا:

أتشفعُ فی حد من حدود اللہ

کیا تم حدود اللہ میں سے ایک حد کے سلسلے میں سفارش کر رہے ہو؟

اسکے بعد آپؐ نے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا:

انما اھلك الذين قبلكم انهم كانو اذا سرق فيهم الشريف تركوه و اذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد

تم سے پہلے کے لوگوں کو جس چیز نے ہلاک کیا وہ یہی تھی کہ جب ان میں سے کوئی معزز شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے۔

اس کے بعد آپؐ نے قانون کی برتری کے سلسلہ میں وہ الفاظ بیان فرمائے جو پیغمبر ذیشان ہی کی زبان سے ادا ہوسکتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

وأیم اللہ، لو ان فاطمة بنت محمد رضی اللہ عنہا سرقت لقطعت یدھا

خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اسکا ہاتھ قطع کر دیتا۔

(بخاری کتاب الانبیاء باب ۵۴، مسلم کتاب الحدود باب قطع السارق الخ)

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ کو ارشاد فرماتے سنا کہ:

من حالت شفاعته دون حد من حدود الله فقد ضاد الله

جس کسی کی سفارش اللہ تعالیٰ کے حدود میں سے کسی حد کے نفاذ میں حائل ہوجائے اس نے اللہ کی مخالفت کی

(ابوداؤد کتاب الاقضیۃ)

۶۔ریاست حقوق کی نگراں ہے

معاشرہ میں کسی کا کسی حیثیت سے بااختیار ہونا اسلام کے نزدیک اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرتا ہے۔جس شخص کو جس حد تک بھی اقتدار حاصل ہے وہ اپنے ماتحت افراد کے حقوق کا محافظ ونگراں ہے۔اور اگران حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اُس سے دنیا میں کوئی پوچھے یا نہ پوچھے لیکن اللہ کے نزدیک وہ اس کے متعلق جواب دہ ہوگا۔اس پہلو سے سربراہِ مملکت کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔اس ضمن میں ایک مشہور حدیث ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

الا کلکم راع،و کلکم مسئول عن رعیتہ فالامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہ والرجل راع علی اھل بیتہ وھو مسئول عن رعیتہ،والمرأۃ راعیۃ علی اھل بیت زوجھا وولدہ وھی مسئولۃ عنھم وعبد الرجل راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔

(بخاری کتاب الاحکام۔۔مسلم کتاب الامارۃ)

سن لو!تم میں سے ہرایک راعی اورنگرن ہے۔اورتم میں سے ہرایک سے اسکی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔وہ شخص جولوگوں کا امام ہے وہ راعی اورنگراں ہے۔اس سے اسکی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا آدمی اپنے گھروالوں کا نگراں ہے۔اس سے اسکی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔عورت اپنے شوہر کے گھر اوراسکے بچوں کی نگراں ہے۔اس سے انکے بارے میں سوال ہوگا۔آدمی کا خادم اپنے سردار کے مال کا نگرں ہے اوراس سے اسکے بارے میں سوال ہوگا۔ہاں!سن رکھوتم سب نگرں ہواورتم میں سے ہرایک سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں بازپُرس ہوگی۔

یہ حدیث واضح طور پر مسلمانوں کوانکی ذمہ داریوں کواحسن رنگ میں ادا کرنے کی طرف توجہ دلا رہی ہے۔پھراسی طرح اسلام ہی ہے جس نے مردوزن کے ملکی حقوق بھی قائم کئے۔اسلام کے نزدیک ہرفرد کی خوراک اسکی رہائش اورلباس کی ذمہ وارحکومت وقت ہےاوراسلام نے ہی سب سے پہلے اس اصول کوجاری کیااورآج ساری دنیااس کی نقل کررہی ہے۔

۷۔ جرم عدالت سے ثابت ہوگا

قانون کے سلسلہ میں اسلام نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جائے اور اسے اسی وقت مجرم گردانا جائے جبکہ عدالت سے اس کا جرم ثابت ہو جائے۔ اس کے لئے اسلام نے شہادت اور گواہی کا ایک پورا تفصیلی ضابطہ مقرر کیا ہے۔ بے ثبوت کسی کو مجرم قرار دینا یا کسی کی عزت وآبرو سے کھیلنا اسلام کے نزدیک قابل تعزیر جرم ہے۔ اسی ذیل میں اسلام نے افواہوں کو پھیلانے اور ظن وتخمین سے کام لینے سے بھی منع کیا ہے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ عراق سے ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور کہا کہ میں ایک ایسے معاملہ کی خبر دینے کے لئے حاضر ہوا ہوں، جس کا نہ سر ہے نہ دم یعنی جو بے سر پیر کے ہے حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ وہ کیا ہے اس نے کہا جھوٹی گواہیاں۔ اس پر آپؓ نے فرمایا:

والله لا یؤسر رجل فی الاسلام بغیر عدول

(مؤطا امام مالک، کتاب الاقضیۃ، باب ما جاء فی الشھادات)

یعنی خدا کی قسم اسلام میں کوئی شخص عدول (قابل اعتماد گواہوں) کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔

پس اسلام کی تعلیمات کے مطابق کسی کو قید و بند کی سزا اسی وقت دی جائے گی جب کہ قابل اعتماد شہادتوں سے ثابت ہو جائے کہ واقعتاً اس نے جرم کیا ہے اور وہ اس سزا کا مستحق ہے اور اسے سزا دینے کا حق ریاست کو ہے نہ کہ عام لوگوں کو۔ مثلاً اگر کسی مقتول کے ورثاء قاتل کو حکومت کے سپرد نہ کریں بلکہ خود ہی قاتل سے بدلہ لیں تو معاشرہ میں خاندانی لڑائی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور اس طرح قتل وغارت کا ایک لمبہ سلسلہ چل سکتا ہے۔ اسلئے اسلام نے جرم کو عدالت میں ثابت کرنے اور گنہگار کو ریاست کے ذریعہ سزا دلوانے کی تلقین کی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف توریت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ قاتل کو لوگوں کے حوالہ کر دو تا وہ اسے قتل کر کے اپنا بدلہ لیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی کو قتل کر دے اور پھر حفاظت کے لئے چنے ہوئے شہروں میں بھاگ جائے تو:۔

''اسکے شہر کے بزرگوں کو کچھ شخصوں کو اس شخص کو (قاتل) محفوظ شہر سے لانے لے لے بھیجنا چاہئے ۔تب شہر کے بزرگ اُسے اس رشتہ دار کو دیں گے جس کا فرض اس کو سزا دینا ہے قاتل کو موت کی سزا دی جانی چاہئے ۔''

(استثناء باب ۱۹ آیت ۱۲)

اگر یہ تعلیم انسانی معاشرہ کے لئے فائدہ مند ہوتی تو اہل یورپ اسے ضرور اپنے معاشرہ میں بھی لاگو کرتے ۔لیکن ہر کوئی جانتا ہے کہ آج ساری دنیا میں قاتل کو سزا دینے کے لئے کہیں یہ قانون نہیں کہ اُسے مقتول کے رشتہ داروں کے حوالہ کیا جاتا ہو بلکہ ساری دنیا اسلامی تعلیم ہی کو اپنائی ہوئی ہے۔

۸۔کسی کو غلام نہیں بنایا جاسکتا

اسلام سے قبل غلامی کا رواج اپنے عروج پر تھا۔کیا عرب اور کیا عجم ہر جگہ لاکھوں لوگ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔غلامی کی لعنت نے معاشرہ میں اپنی جڑیں مضبوطی کے ساتھ قائم کر لی تھیں حتی کہ آج بھی یہ مختلف اشکال میں ہمارے درمیان موجود ہے ۔بعض اوقات انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے فروخت کر دیا جاتا تھا یا کوئی کسی کا قرض ادا نہ کر سکتا تو اسے بیچ کر قرض وصول کیا جاتا۔اسلام نے غلامی کی اس لعنت کو ختم کیا۔اسلام میں کسی کی آزادی کو سلب کرنا،اسے فروخت کرنا یا غلام کو آزاد کرنے کے بعد پھر سے اسے غلام بنالینا اور غلاموں کی طرح کسی سے خدمت لینا ،یہ ساری شکلیں ممنوع ہیں ۔غلامی کے متعلق سخت وعید ہے ۔چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ حدیث قدسی روایت کی ہے:

ثلاثة انا خصمهم يوم القيامة،رجل اعطى بي ثم غدر،و رجل باع حرًا فاكل ثمنه،و رجل استاجر اجيرا فاستوفى منه ولم يعط اجره۔

(بخاری کتاب البیوع)

ترجمہ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) میں قیامت کے دن تین آدمیوں کا حریف ہوں گا ۔ایک وہ شخص جس نے

میرے نام سے عہد و پیمان کیا پھر دھوکا دیا، دوسرا وہ جس نے کسی آزاد کو فروخت کیا اور اسکی قیمت کھا گیا اور تیسرا وہ جس نے کسی مزدور کو اُجرت پر رکھا اور اس سے پورا کام لیا اور اس کی اجرت نہیں ادا کی۔

اسی طرح ایک اور روایت ہے حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں کریگا اور میں اس شخص سے قیامت کے دن جنگ کروں گا جو کسی آزاد کو غلام بناتا ہے۔''

(فتح الباری جلد نمبر ۴)

اب کون عاقل ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو اپنا حریف بنانا پسند کریگا۔ اسلام نے جہاں کسی کو غلام بنانے کو بہت برا فعل قرار دیا ہے وہیں دوسری جانب غلاموں کو آزاد کرانے کی ترغیب دلائی ہے اور اسے بڑی نیکیوں میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے بتایا ہے کہ کسی انسان سے خدمت لینا اور اسے اجرت نہ دینا اور اسکی مزدوری کے پیسے کھا جانا سخت گناہ کا باعث ہے اور جو شخص اسکا ارتکاب کرے اسکی عبادت اور نماز سب فضول اور نا قابل قبول ہے۔ اور یہ کہ ان غیر انسانی حرکتوں کے سدّ باب کیلئے ریاست مناسب قانون وضع کرسکتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی نماز قبول نہیں کرتا۔ ان میں سے ایک آدمی یہ ہے:

ورجل اعتبد محررہ

(ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ۔ ابن ماجہ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ)

وہ شخص جس نے اپنے آزاد کردہ غلام کو پھر سے غلام بنالیا۔

آپؐ نے مسلمانوں کو غلاموں کو آزاد کرنے کی بھی تلقین فرمائی اور اسکے بدلہ انہیں بڑے اجر و ثواب کی خوشخبری دی۔ چنانچہ فرمایا:

''جو مسلمان کسی غلام کو آزاد کرائے گا اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کی آگ سے بکلی نجات عطا فرمائے گا۔''

(بخاری کتاب الایمان والقدر)

۹۔کسی کوناحق سزانہیں دی جاسکتی

اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب اور ایک معاشرتی نظام ہے جس کی بنیاد الٰہی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔دنیائے مذاہب میں اسلام کی ایک امتیازی شان ہے اس لحاظ سے کہ اس کی جزاسزا کے قوانین کا اطلاق مخصوص قواعدوضوابت کے تحت ہوتا ہے جن کا تعلق ایسے معاملات سے ہے جوحقوق اللہ اور حقوق العباد سے متعلق ہیں۔

اسلام نے امن پسند معاشرہ کی بنیادرکھنے کی خاطر ایک اصول یہ بھی بیان کیا ہے کہ کسی بے قصور کوسزا نہ دی جائے۔ بنا کسی قصور کے سزا دینے سے معاشر میں بے چینی پھیلے کے امکان ہوتے ہیں۔حدیث میں آتا ہے کہ ناحق کسی کے کپڑے اتار لینا یا اُس کی پیٹھ پرکوڑے برسانا خدا کے غضب کودعوت دیناہے۔طبرانی کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشادفرمایا:

من جرد ظهر امرئ مسلم بغير حق لقي الله وهو عليه غضبان۔

(قال المناوی،اسنادہ جید،التیسیر بشرح الجامع الصغیر ۲ / ۴۱۲)

جوشخص ناحق کسی مسلمان کی پیٹھ کوکپڑے اتار کر برہنہ کردے وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پرسخت غضب ناک ہوگا۔

چونکہ اس حدیث میں اسلامی معاشرہ سے خطاب ہے،اس لئے مسلمان کا ذکر ہے۔ورنہ یہی حکم غیرمسلم اور ذمی کا بھی ہے۔اسلام کی رو سے ناحق کسی بھی فرد کوکسی قسم کی سزا دینا سنگین جرم اورخدا کے غضب کو بھڑکانے والاعمل ہے۔سزا کے لئے جرم کا ثابت ہوناضروری ہے،جس درجہ کا جرم ہے اسی درجہ کی سزاہوگی۔اورسزا دینے کا حق حکومت کو بذریعہ علدالت ہے۔

۱۰۔عزت وآبروکاحق

انسان کے اندرخودّاری اورعزت نفس کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے۔اسکا یہ حق ہے کہ اسکی تحقیرو تذلیل نہ ہو،اسکو بدنام اوررسوانہ کیا جائے اور معاشرہ میں اسکا احترام ہواوراسے عزت کی نظر

سے دیکھا جائے۔صرف اسلام نے اسے اخلاقی اور قانونی حیثیت دی ہے۔اسلام کے نزدیک کسی شریف اور مہذب انسان کی عزت وآبرو سے کھیلنا سنگین جرم ہے۔رسول اللہؐ نے پاک دامن اور سیدھی سادھی عورت پر بدکاری کے جھوٹے اور بے ثبوت الزام کو ''کبائر'' (بڑے گناہ) میں شمار فرمایا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے کبائر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات

(بخاری کتاب الوصایا، مسلم کتاب الایمان)

ور پاک دامن، بھولی بھالی مومن عورتوں پر تہمت لگانا۔

قرآن مجید نے اس شنیع حرکت پر اسی کوڑوں کی سزا رکھی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵

(النور:5)

ترجمہ: جولوگ پاک دامن اور شریف عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ پیش کریں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور کبھی انکی گواہی قبول نہ کرو یہی لوگ فاسق ہیں۔

اس آیت میں پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کا حکم بیان ہوا ہے۔یہی حکم شریف اور با اخلاق مرد کے لئے بھی ہے۔اگر اس پر بھی تہمت لگائی جائے اور ثبوت نہ فراہم کیا جائے تو اسکی بھی یہی سزا ہے۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تہمت لگانے والا مرد ہے یا عورت، بشرطیکہ وہ عاقل و بالغ ہو۔زنا کی تہمت کے بارے میں یہ صریح حکم ہے۔زنا کے علاوہ اگر کوئی اور بھی کسی قسم کی تہمت لگائی جائے جیسے فاسق فاجر یا چور کہا جائے تو اس پر یہ حد تو جاری نہیں ہوگی البتہ تعزیر ہوگی۔تعزیر میں بوقتِ ضرورت کوڑوں کے ساتھ سزائے قید بھی دی جاسکتی ہے۔حالانکہ اہل علم کا اتفاق ہے کہ تعزیر شریعت کی قائم کردہ حد سے کم ہونی چاہئے۔ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ کتنی ہو۔

اسلام نے عزت وآبرو کو انسان کا بنیادی حق ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کی حفاظت کے لئے

مفصل اور مؤثر قانون بھی دیا ہے جو اور کسی دوسرے مذہب میں اتنا اعلیٰ نہیں ہے۔

۱۱۔ سفر کا حق

اسلام نے انسان کا یہ بھی حق قرار دیا ہے کہ وہ اپنی دینی اور دنیاوی ضروریات کی تکمیل کے لئے زمین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرے۔ اس نیز زمین میں چل پھر کر عجائبات قدرت کو دیکھنے اور انکا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی ہے اور آثارِ تاریخ کے مشاہدہ اور اس سے عبرت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم متعدد مرتبہ مومنوں کو اس کائنات پر غور وفکر کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے بھی اسلام نے انسان کو سفر کی اجازت دی ہے۔ اسلام نے بار بار اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر کیا ہے کہ اُس نے زمین کی ساخت ایسی رکھی ہے کہ انسان اپنے مقاصد کے لئے اس پر بآسانی سفر کرسکتا ہے ۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۱﴾

(الزخرف:11)

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنادیا اور تمہارے لئے اس میں راستے نکال دئے تا کہ تم منزل تک پہنچ سکو۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۲۰﴾
لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۱﴾

(نوح:20،21)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنادیا ہے تا کہ تم اسکے وسیع راستوں میں چلو۔

اسلام نے حالتِ سفر میں بعض فرائض و واجبات میں رعایت بھی دی ہیں مثلاً نماز اور روزہ ہے۔ نیز معاشرہ کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ مسافروں کی مدد کریں اور انہیں سہولتیں فراہم

کرے۔ بیت المال میں مسافروں کا حق رکھا ہے اور جولوگ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے تلاشِ معاش کے لئے سفرنہیں کرسکتے ،ان کے ساتھ ہمدردی کا حکم دیا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان حسبِ ضرورت دینی اور دنیاوی مقاصد کے لئے سفر کرسکتا ہے۔اسلام اسے جائز قرار دیتا ہےاوراس میں مدد کرتا ہے۔بعض حالات میں سفراسلام کے نزدیک پسندیدہ عمل بھی ہے۔

اسلام سفرمیں غیرضروری پابندیوں کا قائل نہیں ہے بلکہ آزادی سے سفر کرنے کا حق عطا کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾

(سورۃ البقرہ آیت:36)

ترجمہ: اورہم نے (آدم سے) کہا کہ اے آدم! تُو اور تیری بیوی جنت میں رہواوراس میں سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ مگراس درخت کےقریب نہ جانا ورنہ تم ظالمون میں سے ہوجاؤ گے۔

اس آیت میں جولفظ حَیْثُ شِئْتُمَا ہے، اسکی تفسیر حضرت مصلح موعودؓ نے یوں کی ہے کہ:۔

’’جہاں چاہو کے الفاظ سے یہ بتایا ہے کہ انسانی تمدن کے کمال کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہے کہ انسان کوسفر اور اقامت کی سہولت حاصل ہواوراس پر سے غیرضروری پابندیاں اٹھادی جائیں۔موجودہ زمانہ کے فسادات کی ایک بڑی وجہ اس حکم کی طرف سے عدم اعتنا بھی ہے۔مختلف اقوام ایک دوسرے کے خلاف پابندیاں لگاتی ہیں کہ فلاں قوم ہمارے ملک میں نہ آئے یا ہمارے ملک میں نہ رہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سب دنیا کوسب انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔۔اس قسم کے امتیاز سے دلوں میں بغض اورکشیدگی پیدا ہوجاتی ہے۔اسلام نے آدمؑ کے زمانہ سے ہی اس قسم کی پابندیوں سے منع فرمایا ہے اور تمام بنی نوع انسان کو دنیا سے یکساں فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے۔‘‘

(تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۳۳۷)

۱۲۔ مظلوم کا حق

اسلام نے انسان کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ وہ خوف وخطر سے پاک اور امن و امان کی زندگی گزارے۔ اسکی جان مال اور عزت کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اس پر دست درازی ہوتو اسے اسکے خلاف معقول طریق پر آواز اٹھانے کا حق حاصل رہے اور وہ عدالت سے رجوع کر سکے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ

(النساء آیت ۱۴۹)

اللہ تعالیٰ بری بات کے اظہار و اعلان کو پسند نہیں کرتا سوائے اسکے کہ جس پر ظلم ہوا ہو۔ (یعنی اسے حق ہے جس پر ظلم ہوا ہو)۔

اسلام نے جہاں ایک طرف مظلوم کا یہ قانونی اور اخلاقی حق تسلیم کیا ہے کہ وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور انصاف کا مطالبہ کرے وہیں دوسری جانب معاشرہ کی یہ ذمہ داری بھی قرار دی ہے کہ وہ آگے بڑھے اور مظلوم کی مدد کرے۔ رسول اللہؐ نے مظلوم کی مدد کو اس کا لازمی حق بتایا ہے اور یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ ظالم کی کسی پہلو سے تائید نہ ہو۔ ظلم کی حمایت روحِ اسلام کے منافی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

من مشی مع ظالم لیقوّیہ وھو یعلم انہ ظالم فقد خرج من الاسلام

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الظلم بحوالہ بیہقی شعب الایمان)

کوئی شخص کسی ظالم کے ساتھ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ظالم ہے، اسکی مدد کیلئے چلے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

قارئین! دیکھیں کتنی سخت وعید ہے اسلام میں ظلم کی مدد کرنے کے خلاف۔ اب کون ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہو اور ظلم بھی کرتا ہو۔ عدل و انصاف کے قیام کے لئے معاشرہ میں مظلوم کے ساتھ تعاون اور ظالم سے عدم تعاون کی فضا کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن اس میں ریاست کے کردار کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اسلامی ریاست مظلوم کو اس کا حق دلانے کی پابند ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا تھا اس میں حکومت کی پالیسی بیان

کرتے ہوئے فرمایا تھا:

الضعیف فیکم قوی عندی حتّٰی آخذ لہ حقہ و القوی ضعیف عندی حتّٰی أخذ منہ الحق ان شاء اللہ تعالیٰ

(ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۹۴-۱۹۵)

تم میں سے جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہوگا۔ یہاں تک کہ میں اس کا حق لے کر اسے پہنچا دوں اور جو تم میں قوی ہے وہ میرے نزدیک ضعیف ہوگا یہاں تک کہ اس کے پاس دوسرے کا جو حق ہے وہ اس سے میں لے لوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۱۳۔ دفاع کا حق

دنیا کا کوئی بھی فرد کسی دوسرے پر کسی قسم کی دست درازی کرے تو اسے دفاع کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب ہی کے نزدیک ایک تسلیم شدہ حق ہے اور کسی کو اس حق سے محروم رکھنا ظلم کو تقویت پہنچانا ہے۔ لیکن دفاع ایک نازک عمل ہے۔ بعض دفعہ دفاع کے نام پر ظلم و زیادتی اور ناحق کشت وخون ہونے لگتا ہے یہ غلط ہے اور اسلام اسکی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ رسول اللہؐ کے ارشادات میں صاف اور صریح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ انسان اپنے دین و ایمان، جان و مال، مکان، زمین، جائیداد اور بیوی بچوں کی حفاظت میں جان بھی دے سکتا ہے اور یہ جان دینا شہادت ہے۔ چنانچہ حضرت سعید بن زید رسول اللہؐ سے روایت فرماتے ہیں:

من قتل دون مالہ فھو شھید و من قتل دون دینہ فھو شھید و من قتل دون دمہ فھو شھید و من قتل دونہ اھلہ فھو شھید۔

(ترمذی ابواب الدیات۔ نسائی کتاب المحاربۃ)

اسی طرح احادیث میں اور بھی بہت سارے اقتباسات مل جاتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دفاع میں جان جانے پر شہادت کا مقام ملتا ہے۔ اسکے برعکس اگر حملہ آور مارا جائے تو وہ جہنم کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ جذبہ اگر پیدا ہو جائے تو انسان کبھی ظلم کے آگے جھک نہیں سکتا۔ دفاع کا حق

اسلام کے نزدیک ہر شخص کا ایک قانونی حق ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے دفاع کے سلسلہ میں حملہ آور کا جو بھی نقصان ہوگا اس کی ذمہ داری دفاع کرنے والے پر عائد نہیں ہوگی۔

فقہ کے مشہور امام، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ:

''کسی کی جان، مال اور بیوی بچوں پر حملہ ہو تو اسے دفاع کا حق ہے۔ اگر اس کے نتیجہ میں حملہ آور قتل ہو جائے تو دفاع کرنے والے پر دیت یا کفارہ واجب نہ ہوگا۔''

(ابن حجر، فتح الباری: ۵/۷۶)

اسی طرح امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''اگر ڈاکو کسی کی جان لینا چاہیں تو وہ ان کا مقابلہ کرے گا، چاہے اسے اپنے دفاع میں انہیں قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے اس پر سب کا اجماع ہے۔''

(فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۳۴/۲۴۲)

اسی طرح اسلام نے مردوزن کو اپنی عزت اور عصمت کے دفاع کا حق بھی دیا ہے۔ یہ بات کہ کس وقت کون سا دفاعی اقدام صحیح اور قانون کے تحت ہوگا اور کون سا اقدام غلط اور غیر قانونی قرار پائے گا اس کا فیصلہ حملہ کی نوعیت اور ان حالات کے پیش نظر ہوگا جن میں حملہ ہوا ہے۔ کسی بھی دفاعی اقدام کے لئے ثبوت کا پایا جانا ضروری ہے۔ دفاع کے سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ جس وقت حملہ ہو اسی وقت دفاع ہوتا ہے۔ حملہ کے بعد دفاع کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس طرح سے اسلام مظلوم کے اندر یہ عزم اور حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی جان، مال، عزت وآبرو، بیوی بچوں، اہل خاندان اور اپنے دین وایمان کو دوسروں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑے بلکہ حسب طاقت جس طرح سے بھی ہو ظالم کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ اسلام معاشرہ کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ظلم کے دفاع کے لئے خود بھی کھڑا ہو، دفاع میں مظلوم کا ساتھ دے اور ظلم کو مٹانے اور مظلوم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

بنیادی ضروریات کی تکمیل کا حق

انسان کی بنیادی ضروریات

اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے انسان کی زندگی کے لئے ضروری اور بنیادی چیزوں کا خاص خیال رکھا ہے اور ان کو حاصل کرنا ہر انسان کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔ اسی اُصول کی طرف یہ قرآنی آیت اشارہ کرتی ہے کہ:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۹﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۲۰﴾

(سورۃ طٰہٰ آیت: 119، 120)

یعنی: سچی بہشتی زندگی کی یہ علامت ہے کہ اَے انسان! تُو اس میں بھوکا نہ رہے اور نہ ضروری لباس سے محروم ہو۔ اور نہ ہی سردی سے ٹھٹھرے اور نہ ہی پیاس کی تکلیف اُٹھائے اور نہ ہی دھوپ کی شدت میں جلے۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک لطیف مثال کے ذریعہ اس پہلو کو سمجھایا ہے:۔

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سوال کرے گا کہ اَے آدم کے بیٹے (یعنی اے انسان) میں (اللہ) بیمار ہوا، اور تُو میری عیادت کے لئے نہ آیا۔ انسان جواب دے گا اَے اللہ مین تیری عیادت کیسے کرتا تُو تو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔ اللہ کہے گا تجھ کو معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا اور تُو نے اس کی عیادت و بیمار پُرسی نہ کی۔ اگر تُو اس کی بیمار پُرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا اللہ پھر سوال کرے گا اَے آدم یعنی اَے انسان میں نے تجھ سے کھانا مانگا تُو نے مجھ کو کھانا نہ کھلایا۔ وہ جواب دے گا اَے میرے ربّ میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا تُو تو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔ اللہ کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اُس کو کھانا نہ کھلایا اگر تُو اس کو کھانا کھلایا ہوتا تو تُو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اللہ پھر سوال کرے گا اَے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے پانی مانگا پر تُو نے نہ پلایا۔ انسان جواب دیگا میں تجھے پانی کیسے پلاتا تُو تو خود مالک ہے تمام جہانوں کا! اللہ جواب دے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تُو نے اُس کو نہ پلایا اگر تُو اس کو پانی پلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔''

(صحیح مسلم، کتاب البرّ والصّلہ والادب)

یہ حدیث قدسی ہر مسلمان کو تمام بنی نوع انسان سے سچی محبت و ہمدردی نیز خیر خواہی کا درس

دیتی ہے اور اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے حاجت مند انسان کی حاجت روائی کو اپنی حاجت روائی قرار دیا ہے۔ضرورت مند انسان کی ضرورت پوری کرنا ہی حقیقی انسانیت ہے۔ مسلمان اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے بنی نوع انسان کو خواہ وہ کہیں کے ہوں بیماریوں ، فاقہ کشی اور پیاس کی مشکلات سے نجات دلانے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جائیں گے اور وہ انہیں وہ سب کچھ دیگا جس کی وہ تمنا کرتے ہیں۔

الغرض اسلام تمام انسانوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً یہ حکم دیتا ہے کہ اُن کی حکومتوں کا نیز اُن کا انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ فرض ہے کہ ہر انسان کے کھانے ،صاف پانی پینے اور لباس نیز موسم کی شدت سے بچانے کے لئے گھر کا انتظام کرے۔

انسانوں کی انہی اغراض کو پورا کرنے کے لئے اسلام میں زکوٰۃ کا نظام جاری ہے جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْھِمْ صَدَقَۃً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَآءِھِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَآءِھِمْ

(مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ)

یعنی اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے جو مالداروں سے لے کر غریبوں میں تقسیم کی جائے گی۔

یہ وہ انسانیت اور حقوق العباد کی ادائیگی کا حقیقی مفہوم ہے جو سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین کو سکھایا تھا۔مگر افسوس کہ بعد میں آنے والے مسلمانوں نے اس مفہوم کو یکسر نظر انداز کر دیا۔انہوں نے اسلام کو ایک ایسے مذہب کی شکل میں پیش کیا کہ جس میں انسان سے ہمدردی اور اس کی خیر خواہی کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔اکثر مسلمان حکمرانوں اور بادشاہوں نے اپنی حکومتوں اور اقتدار کے استحکام اور بقا کے لئے اسلامی تعلیمات کے کلاف رعایا اور عوام الناس کے دلوں میں خوف و دہشت پیدا کرنا ضروری سمجھا۔اور انہی حکمرانوں سے خوف زدہ ہو کر اُس زمانہ کے بہت سے علماء اور فقہاء نے قرآن مجید اور سنت نبوی سے اُن کی مرضی کے مطابق مسائل کو کھینچ تان کر نکالا گویا کہ وہ موم کی ناک کی طرح بن گئے اور انہیں زیادہ نمایاں طور پر پیش کیا جو ان کے جور وظلم اور متشددانہ کاروائیوں کی تائید کرتے ہوں حالانکہ ان کا اسلام

سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اسلام کی تعلیم تو نہایت خوبصورت اور کامل ہے۔ چنانچہ تمدن کے قیام کے لئے جو سب سے پہلی اور اصولی تعلیم حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی وہ چونکہ ہر زمانہ میں قابل عمل تھی اس لئے قرآن مجید میں اس کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ بجز اسلام کے یہ تعلیم اور کسی بھی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں انسان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارا تمدن ایسا ہونا چاہئے کہ جس میں نہ کوئی بھوکا رہے نہ کوئی لباس سے محروم رہے اور نہ کوئی پیاسا رہے اور نہ کوئی بغیر کسی چھپّر کے دھوپ میں پڑا جلتا رہے۔

(سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۹، ۱۲۰)

یعنی روٹی کپڑا اور مکان ہر انسان کا بنیادی حق ہے جو اُسے ملنا چاہئے۔ آج کی مہذّب دنیا اور خصوصاً مغربی ممالک اِن بنیادی حقوق کے مہیا کر دینے کو ہی اپنی ترقی کا منتہا سمجھ رہی ہے جبکہ یہ تو وہ بنیادی اور ابتدائی حق تھا جو آج سے ہزاروں سال قبل حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا اور اسلام نے اسے محفوظ رکھ کر ساری دنیا تک اس تعلیم پہنچایا۔

انسان کی جان کے احترام کے تصور کے ساتھ اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا تصور وابستہ ہے۔ اسلام ہر انسان کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے لئے سعی کرے۔ اس کے لئے وہ خدا کی پوری زمین اور اسکے وسائل کو استعمال کر سکتا ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور خادم جیسی ضروریات شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اسلام نے واضح موقف اختیار کیا ہے۔ وہ ان میں سے کسی کے حصول کا مخالف نہیں بلکہ اس کی اس نے ترغیب دی ہے۔ اسلام رہبانیت سے زندگی گزارنے اور مجرد رہنے کے خلاف ہے اسلئے اس نے انسان کو اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیاوی وسائل کا استعمال کرتے ہوئے زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی وعید کی ہے کہ محض دنیا کے پیچھے بھاگنا آخر میں جہنم کی طرف لے جائیگا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بنی نوع انسان ے لئے دین رحمت بنایا تھا اور

مسلمانوں کو یہ حکم دیا تھا کہ سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اور اولیاء وصوفیاء عظام کے نمونہ پر چلتے ہوئے اسے نرمی اور محبت کے ساتھ دوسروں کو سمجھائیں۔ یقیناً اسلام کی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر مشتمل روحانی واخلاقی تعلیمات انسانوں کے دلوں پر اثر کریں گی۔ نیز عصر حاضر میں اللہ تعالیٰ نے اسی روح کے ساتھ تبلیغ اسلام اور دعوۃ الی اللہ کے لئے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی (1835ء-1908ء) مسیح موعود ومہدی معہود علیہ السلام کو بھیجا جو کہ جماعت احمدیہ کے بانی ہیں۔

۱۔معاشی جدوجہد

اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ اس زمین میں انسان کے رزق کا بھرپور سامان رکھا ہے۔اس پر بسنے والے ہر فرد کا یہ فطری حق ہے کہ اسے حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کی سعی وکوشش کرے ایک جگہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝١٦

(سورۃ الملک:16)

وہی خدا ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع کر دیا کہ اس کے کناروں پر چلو اسکا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝١٣

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝١٤

(سورۃ الجاثیہ:13،14)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا تا کہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تا کہ تم اس کا فضل ورزق تلاش کرو اور شاید کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ اس نے تمہارے لئے وہ سب چیزیں اپنی طرف سے مسخر کر دی جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

(اس سلسلہ کی مزید آیات ملاحظہ ہوں۔ سورۃ طٰہٰ: ۵۴، ۵۵)

نماز جمعہ کی اہمیت اور اس میں شرکت کو لازمی قرار دینے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

(الجمعہ:11)

جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

مطلب یہ کہ نماز ختم ہونے کے بعد تمہیں اجازت ہے کہ اللہ کے فضل کی تلاش میں زمین میں پھیل جاؤ۔ پوری زمین تمہارے لئے ہے۔ اس کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کا تمہیں حق ہے۔

انسان اور دوسری ذی روح مخلوقات میں ایک فرق یہ ہے کہ وہ فطرتاً صاف ستھری اور پاکیزہ غذا چاہتا ہے۔ گندی اور ناپاک غذائیں اسکی فطرت سے میل نہیں کھاتے اور وہ اس کے لئے مضر صحت اور نقصاندہ بھی ہیں۔ جن غذائی اشیاء کو وہ ان کی اصل حالت میں استعمال کرتا ہے وہ بھی صاف ستھری ہونی چاہئے اسلام کے نزدیک انسان کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی سعی سے پاک اور صاف ستھری غذا حاصل کرے۔ یہ تقویٰ اور دینداری کے منافی نہیں ہے۔ البتہ اس سعی میں حلال وحرام کی پابندی ضروری ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۹﴾

(البقرۃ:169)

اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال اور پاکیزہ ہے کھاؤ، اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۲۔لباس

انسان کی بنیادی ضرورتوں میں لباس بھی شامل ہے۔انسان کے لئے لباس کی اہمیت کئی پہلوؤں سے ہے۔یہ اسے جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔جو جانور جہاں پایا جاتا ہے اسکی جسمانی ساخت وہاں کے لئے مناسب اور موزوں ہوتی ہے۔اگر موسم سخت ہوتا ہے تو وہ دوسری جگہ منتقل ہوجاتا ہے۔انسان کا حال اس سے مختلف ہے اس کا جسم موسم کی گرمی اور سختی کو برداشت نہیں کر پاتا۔وہ لباس کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حیوان کے اندر شرم و حیاء کا جزبہ نہیں پایا جاتا۔اس کے برعکس انسان کی فطرت میں شرم وحیاء پائی جاتی ہے اور عریانی اسکے فطرت کے خلاف ہے۔وہ جسم کے قابل ستر حصوں کو لازماً چھپانا چاہتا ہے۔اور ایسا کرنے کا اسے معبود حقیق نے حکم بھی دیا ہے۔اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ لباس انسان کے لئے وجہ زینت و آرائش بھی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

(سورۃ الاعراف:27)

اے بنی آدم ہم نے تم پر لباس اتارا ہے، جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور زینت کے لباس بھی اتارے لیکن تقویٰ کا لباس بہتر ہے، یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اس طرح اسلام نے لباس اور بہتر لباس کی ضرورت واہمیت واضح کی ہے۔وہ اسے انسان کی بنیادی ضرورت مانتا ہے البتہ اسکی ہدایت یہ ہے کہ آدمی اس ظاہری لباس کی فکر میں لباسِ تقویٰ کو فراموش نہ کر بیٹھے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

ترجمہ:اے اولادِ آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنا لباسِ زینت (پہن) لیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے زیادہ خرچ نہ کرو کہ بیشک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا،

۳۔مکان

مکان بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔مکان مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں ہر ایک کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔قرآن مجید نے اس کا ذکر اس طرح سے کیا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴿۸۱﴾

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ﴿۸۲﴾

(سورۃ النحل:81,82)

ترجمہ:اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھر رہنے بسنے کی جگہ بنائے اور تمہارے لئے چوپایوں کی کھالوں سے گھر (خیمے) بنائے کہ تم ان کو ہلکے پاتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے ٹھہرنے کے دن۔اس نے چوپایوں کی اون سے روؤں سے اور بالوں سے ایک مدت خاص تک کے لئے سازوسامان اور اسباب حیات بنائے۔اللہ نے تمہارے لیے اپنی بنائی ہوئی چیزوں میں سائے رکھے اور تمہارے لئے پہاڑوں میں روپوش ہونے کے مقامات رکھے اور اس نے تمہارے لئے لباس بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بھی بنائے جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔اس طرح اللہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے کہ تا کہ تم اس کے فرمانبردار بنو۔

ان آیات میں تین طرح کے مکانات کا ذکر ہے:-

۞۔وہ ٹھکانے جو انسان پہاڑوں اور جنگلوں میں بناتا ہے۔انسان نے تاریخ کے ابتدائی دور میں اسے عام طور پر استعمال کیا ہے لیکن اب وہ زیادہ تر انہیں اپنی جنگی ضروریات کیلئے استعمال کرتا ہے یا وقتی طور پر غیر جنگی مقاصد کے لئے بھی ان کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

۞۔دوسرے مکانات وہ ہیں جو خیموں اور چھولداریوں کی شکل میں بنائے جاتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل ہو سکتے ہیں۔انہیں خانہ بدوش استعمال کرتے ہیں

نیز تفریحات یا فوجی ضرورت کے لئے بھی ان کا استعمال ہوسکتا ہے۔

۞۔ مکانات کی تیسری قسم وہ ہے جن کے بارے میں قرآن نے سکنا کا لفظ استعمال کیا ہے جن میں انسان مستقل رہائش اختیار کرتا ہے، جن سے اسکی رہائشی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور جن میں اسے راحت وسکون محسوس ہوتا ہے۔ یہ تمدنی زندگی کا ایک لازمی جزء ہے۔

ان آیات میں مختلف قسم کے مکانات کے متعلق دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ایک یہ کہ وہ انسان کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور دوسری یہ کہ ان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل واحسان کی ہے۔یعنی جس کے پاس مکان ہے تو گویا اسے اللہ کی ایک نعمت حاصل ہے جس پر اسے اللہ کا شکر کرنا چاہئے۔اور جس کو مکان حاصل نہیں اُسے ضرور اللہ کی اس نعمت کی تلاش میں جدوجہد کرتے رہنا چاہئے تا اسے یہ نعمت بھی ملے۔مکان ایک ضرورت ہے۔اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے کارکنوں کی یہ ضرورت حسب توفیق پوری کرے بلکہ اس کی کوشش ہوگی کہ ریاست کے تمام شہریوں کو یہ نعمت حاصل ہو۔اس میں وہ ممکنہ تعاون کریگی۔اور جن کے پاس اپنا مکان ہے اس پر ان کا حق ملکیت تسلیم کرے گی اور اس کی حفاظت کرے گی۔

۴۔ معاشی خوشحالی

اسلام معاشی خوشحالی کو غلط نہیں سمجھتا بلکہ اس کا وعدہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند رہے اور اسکے ہاتھوں اللہ کے دین کی اقامت ہوجائے تو اسے معاشی خوشحالی ملے گی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَ كَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۷﴾

(المائدہ:67)

اگر وہ (اہل کتاب) قائم کرتے توریت اور انجیل کو اور اس (قرآن) کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا ہے تو اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے پیروں کے نیچے سے بھی۔ ان میں سے کچھ تو راہِ اعتدال پر قائم ہیں لیکن ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو برے کام کر رہے ہیں۔

اسلام نے مال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اسے تسلیم کیا ہے اور اسے زندگی کے قیام و بقا کا ذریعہ کہا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا ۔

(النساء:6)

اپنے اموال، جنہیں اللہ نے تمہارے قیام حیات کا ذریعہ بنایا ہے، نادانوں کے حوالہ نہ کرو۔

مال آدمی کے پاس ہو اور وہ اسے نیکی کے راہ میں خرچ کرے تو وہ قابل رشک ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا حسد الّا فی اثنین رجل اٰتاہ اللہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق و رجل اٰتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یعلّمھا

حسد صرف دو آدمیوں پر جائز ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا اور اس نے اپنے مال کو راہ حق میں لٹانے پر لگا دیا۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت سے نوازا اور وہ اس کے ذریعہ فیصلہ کرتا ہے اور اسکی دوسروں کو تعلیم دیتا ہے۔

(بخاری کتاب العلم۔ مسلم کتاب صلوۃ المسافرین)

حضرت سعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

ان اللہ یحب العبد التقی الغنی الخفی

اللہ تعالیٰ اس بندے سے محبت کرتا ہے جو صاحب تقویٰ ہے، غنی اور تونگر ہے اور پوشیدہ رہتا ہے۔

(مسلم، کتاب الزھد والرقائق)

مطلب یہ کہ وہ غنی جو خاموشی سے اپنی دولت صرف کرتا ہے اسکا اظہار اور نام و نمود نہیں چاہتا بلکہ اپنے آپ کو پسِ پردہ رکھتا ہے وہ اللہ کو بہت محبوب ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا:

نعم المال الصالح للرجل الصالح

(مسند احمد ۴/ ۱۹۳)

مالِ صالح اچھا ہے مرد صالح کے لئے۔

مال جائز طریق سے حاصل ہو اور وہ نیک ہاتھوں میں ہو تو یہ ناپسندیدہ نہیں بلکہ پسندیدہ چیز ہے۔ مال اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی خدمت کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جائز حدود میں کسبِ مال کی کوشش غلط نہیں ہے۔ اسلام تو اس کے مواقع اور سہولیات بھی فراہم کرتا ہے۔ نیز اسکے جائز حصول کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔

۵۔ خادم اور سواری

اسلام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سواری اور خادم بھی انسان کی ضرورت ہے اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ اسے حاصل کرے۔ مستورد بن شدادؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

من كان لنا عاملا فليكتسب زوجة فان لم يكن له خادم فليكتسب خادما فان لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا و فی رواية من اتخذ غير ذٰلك فهو غال۔

(ابوداؤد، کتاب الخراج الفئی والامارۃ)

جو ہمارا عامل ہے وہ بے شادی شدہ ہے تو (بیت المال سے مدد لیکر) شادی کرلے، اگر اس کے پاس خادم نہیں ہے تو خادم حاصل کرلے، اگر اسکا مکان نہیں ہے تو مکان بنالے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو شخص ان کے علاوہ کچھ اور بیت المال سے حاصل کرے گا وہ خائن ہوگا۔ حدیث میں ریاست کے ملازم کو اپنی حقیقی ضروریات پورا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اجازت کچھ حدود و قیود کے ساتھ ہوگی اور اس کا تعلق ریاست کی مالی حالت سے بھی ہوگا۔ اگر کسی کی تنخواہ ہی اسکی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی ہے تو وہ ریاست کے خزانے سے مزید فائدہ اٹھانے کا مجاز نہ ہوگا۔

دنیا مقصود نہ بن جائے

اسلام نے جائز ذرائع سے انسان کو معاشی ترقی حاصل کرنے پر پابندی عائد نہیں کی ہے بلکہ اسلام نے تو ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ اس معاملہ میں شہریوں کو ممکنہ تعاون کرے اور معاشی لحاظ سے کمزور اور نادار افراد کی وہ مدد کرے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام اس بات کی طرف بھی بار بار توجہ دلاتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ محض دنیا کی زندگی ہی انسان کا مقصود بن جائے اور دنیا کمانے کے پیچھے وہ آخرت کو بھول جائے۔ دنیا کی ہوس اور اسکے حصول کی تڑپ میں اپنے معبود حقیقی کی یاد سے غافل ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۰

(المنٰفقون 10)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں۔ اور جو ایسا کریں گے تو وہی وہ لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔

انسان جب دنیا کا غلام بن جائے اور مال و دولت سمیٹنے میں لگ جائے تو آخرت اس کی نگاہ سے اوجھل ہونے لگتی ہے یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ اسلئے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو قناعت سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لیس لابن آدم حق فی سوی ھٰذہ الخصال، بیت یسکنہ و ثوب یواری بہ عورتہ و جلف الخبز و الماء

ابن آدم کا کوئی حق نہیں ہے (اس دنیا میں) سوائے ان چیزوں کے۔ گھر جس میں وہ رہے، کپڑا جس سے وہ قابل ستر چیزوں کو چھپا سکے اور سوکھی روٹی اور پانی۔

(ترمذی کتاب الزھد)

اسی طرح ایک دوسری جگہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

یکفی احدکم من الدنیا خادم و مرکب

(مسند احمد ۵/ ۳۶۰)

تم میں سے کسی بھی شخص کے لئے اس دنیا سے ایک خادم اور سواری کافی ہے۔

ابو ہاشم بن عتیبہؓ نے زندگی کے آخری لمحات میں افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ تمہارے سامنے اموال تقسیم ہوں گے۔تمہارے لئے ان میں سے ایک خادم اور ایک سواری جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے کام آئے کافی ہے میں نے وہ زمانہ پایا اور بہت سا مال جمع کیا۔کاش میں اس عہد پر قائم رہتا جو میں نے آپ سے کیا تھا

(ترمذی ابواب الذھد۔۔ابن ماجہ کتاب الرقاق)

خلاصہ کلام یہ کہ انسان اپنی مادّی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔اسلام ان کی تکمیل کے لئے جائز حدود میں جدوجہد کو صحیح سمجھتا ہے۔اور ریاست کو اس میں تعاون کی ہدایت بھی کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ اسلام بندۂ دنیا بن کر رہ جائے اور آخرت کو فراموش کردے۔

چنانچہ اس ضمن میں سیدنا حضرت مصلح موعودرؓ تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۱۲۶ پر لکھتے ہیں کہ:

’’ہر سچے مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے سارے وجود کو خدا تعالیٰ کے لئے وقف کردے اور اپنی دنیوی حاجات کو بھی دینی حاجات کے تابع کردے۔بظاہر یہ ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتہً اسلام اور دیگر ادیان میں یہی فرق ہے۔اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم علم حاصل نہ کرو، نہ یہ کہتا ہے کہ تم تجارتیں نہ کرو، نہ یہ کہتا ہے کہ صنعت وحرفت نہ کرو۔نہ یہ کہتا ہے کہ تم اپنی حکومت کی مضبوطی کی کوشش نہ کرو۔وہ صرف انسان کے نقطۂ نگاہ کو بدلتا ہے ۔۔۔۔۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے اتباع کی تمام جدوجہد دین کے لئے تھی لیکن یہ نہیں کہ وہ دنیوی نعمتوں سے محروم ہوگئے ہوں۔جن لوگوں کو دین ملے گا دنیا لونڈی کی طرح دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے دوڑتی آئے گی لیکن دنیا کے ساتھ دین کا ملنا ضروری نہیں۔بسا اوقات وہ نہیں ملتا اور بسا اوقات رہا سہا دین بھی ہاتھوں سے جاتا رہتا ہے۔‘‘

انسان کے سماجی و معاشرتی حقوق

سماجی و معاشرتی حقوق

انسان جس معاشرے میں رہتا بستا ہے اس میں بے جان زندگی گزارنا نہیں چاہتا بلکہ موثر اور فعال کردار ادا کرنا چاہتا ہے یہ اس کا فطری حق ہے اور معاشرہ بھی اُسی وقت ترقی کر سکتا ہے جبکہ ہر فرد کو اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ترقی کرنے اور احسن زندگی گزارنے کے مواقع حاصل ہوں اور وہ بعض متعین حقوق رکھتا ہو۔ دنیا کے تمام جمہوری قوانین میں اور مذاہب عالم میں شخصی آزادی (Personal Liberty) کو انسان کا ایک بنیادی حق قرار دیا گیا ہے لیکن کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس حق کے ذریعہ وہ دوسرے کی آزادی پر شب خون مارے اور اسے سلب کر لے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ There Cannot be freedom to destroy freedom۔ اسی طرح قومی اور ملکی مفاد، شخصی مفاد پر مقدم ہے۔ کوئی فرد یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ آزادی سے فائدہ اٹھا کر ملک و قوم کو نقصان پہنچائے۔ شخصی آزادی کے مختلف پہلو ہیں۔ اسلام نے ان سب کے احترام کی تعلیم دی ہے اور ان کے حدود متعین کئے ہیں۔

۱۔ فکر کی آزادی کا حق

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و خرد عطا کی ہے۔ اس کا ایک امتیازہ وصف یہی ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام اس صلاحیت کی نشوونما اور ترقی چاہتا ہے اور اسے دبانے اور کچلنے کی ہر کوشش کے خلاف ہے۔ اسلام نے انسان کو اوہام و خرافات سے نکالا، غور و فکر اور تدبر پر ابھارا اور اس کی ترغیب دی ہے۔ اسلام کے نزدیک کسی معاملہ میں غیر عقلی رویہ اختیار کرنا اور بے دلیل کسی بات پر اصرار کرنا انسانی عظمت کے منافی ہے۔ اسلام نے تقلید اعمیٰ اور بلا سوچے سمجھے آباء و اجداد کی پیروی اور روایت پرستی پر سخت تنقید کی ہے۔ اسلام کے نزدیک یہی اندھی تقلید قوموں کی تباہی کا موجب ہے:

اَمْ اٰتَیْنٰھُمْ کِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَھُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِکُوْنَ﴿۲۲﴾

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۝۲۳

وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۝۲۴

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝۲۵

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۝۲۶

(الذخرف: آیت 22 تا 26)

ترجمہ: کیا ہم نے اس سے پہلے انہیں کوئی کتاب دی تھی جس سے وہ مضبوطی سے چمٹے ہوئے ہیں؟

بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک مسلک پر پایا اور ہم یقیناان ہی کے نقش قدم پر ہدایت پانے والے ہیں۔

اوراسی طرح ہم نے کبھی تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر اسکے خوشحال لوگوں نے کہا کہ یقینا ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک خاص مسلک پر پایا اور یقینا ہم انہی کے نقوشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔

اس (پیغمبر) نے کہا کیا اس صورت یں بھی کہ میں اس سے بہتر چیز لے آؤں جس پر تم نے اپنے آباء کو پایا؟

انہوں نے کہا یقینا ہم ان باتوں کا انکار کرتے ہیں جن کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔

تب ہم نے ان سے انتقام لیا۔ پس دیکھ کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔

اسلام ہر بات کو دلائل سے سمجھنے کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ اسے اپنے مخالفین سے شکایت ہے کہ وہ فہم ودانش سے کام نہیں لیتے اور اس کے دلائل پر غور نہیں کرتے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ښ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۝۱۸۰

(سورۃ الاعراف: 180)

اور یقینا ہم نے جہنم کے لئے جن وانس میں سے ایک بڑی تعداد کو پیدا کیا۔ ان کے دل ایسے ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ تو چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی ہیں جو غافل لوگ ہیں۔

اسلام نے غور وفکر پر زور دینے کے ساتھ ساتھ انسانی عقل کی محدودیت بھی واضح کی ہے اور غور وفکر کے لئے صحیح بنیادیں فراہم کی ہیں۔ اسلام کا یہ منشاء ہے کہ عقل کا اس طرح سے استعمال ہو کہ آدمی راہِ ہدایت پا سکے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اپنی عقل کا صحیح استعمال کرتے ہوئے اس زمانہ کے امام کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۲۔ عمل کی آزادی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا ہے بلکہ حرکت وعمل کی آزادی دی ہے، وہ اپنی آزاد مرضی سے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے لیکن اس آزادی کا بے قید استعمال تباہ کن ہے۔ اس لئے اس پر کسی نہ کسی نوع کی پابندی ضروری ہے۔ اسلام نے انسان کو آزادیٔ عمل کا حق دیا ہے لیکن وہ اسے کسی ایسے اقدام کی اجازت نہیں دیتا جو معاشرہ کے لئے ضرر رساں اور فساد فی الارض کا موجب ہو۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر جو اس دنیا میں آتے رہے ہیں، ان کا ایک خاص ہدف یہ بھی رہا ہے کہ اللہ کی زمین سے فساد اور بگاڑ کا خاتمہ ہو اور نوعِ انسانی کو امن وسکون کی زندگی میسر آئے۔

قرآن کریم سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ قوم ثمود بڑی خوشحال اور تمدنی لحاظ سے اپنے وقت کی ایک بڑی ترقی یافتہ قوم تھی لیکن اس کے لیڈروں نے فساد فی الارض کا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ حضرت صالح نے اس گمراہ قیادت کے خلاف آواز اٹھائی اور قوم کو دعوت دی:

وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ﴿١٥٢﴾ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٣﴾

(الشعراء:152,153)

اور حد سے بڑھ جانے والوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

مدینہ کی اسلامی ریاست خیر وصلاح اور عدل وانصاف کا مرکز اور دنیا کے لیے اعلیٰ ترین نمونہ تھی، لیکن منافقین اسے اپنی مفسدانہ حرکتوں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن مجید نے اسے متعدد مواقع پر بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۙ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١٢﴾
أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٣﴾

(البقرۃ:12،13)

ترجمہ: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو بس اصلاح کرنے والے ہیں ۔خبر دار رہو کہ یہی فساد کرنے والے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

سعی وجدو جہد اور حرکت وعمل انسان کا فطری حق ہے ۔اسلام اس پر رکاوٹ عائد نہیں کرتا البتہ وہ ان کوششوں کے خلاف ہے جو معاشرہ کو فساد اور بگاڑ کی طرف لے جاتی ہیں اور بالآخر اسے تباہی اور بربادی سے ہم کنار کرتی ہیں۔

۳۔اظہار خیال کی آزادی کا حق

آج کی اس جمہوری دنیا میں اظہار خیال کی آزادای کو انسان کا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کا موقعہ ملنا چاہئے ۔دوسروں کو اسے قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار ہے لیکن اس حق کا بے قید استعمال معاشرہ کے لئے سخت نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے، اس لئے اس پر بعض پابندیاں بھی لگائی جاتی ہیں

اسلام کے نزدیک انسان کا یہ فطری حق ہے کہ اس کی زبان بندی نہ ہو، اسے اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت ہو اور وہ انہیں دوسروں کے سامنے پیش کر سکے۔ لیکن اسلام نے اسے بعض حدود کا پابند بھی بنایا ہے۔ یہ حدود ایسے ہیں کہ فرد اور سماج کے لئے ان کی معقولیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے جو حدود عائد کئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

﴿1﴾ اظہار خیال میں آدمی اخلاقی حدود کا پابند ہو اور وہ دوسروں کی عزت نفس کا احترام کرے، اسے رسوا اور بدنام کرنے اور اسکی عزت وآبرو سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔ کذب بیانی، افترا پردازی، طنز وتعریض، دشنام طرازی، بدزبانی اور بدگوئی جیسی اخلاقی خرابیوں سے اجتناب کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۲﴾

(الحجرات آیت:12)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور عورتیں بھی دوسری عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور برے القاب سے نہ پکارو۔ ایمان کے بعد فسق کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو لوگ (ان حرکتوں سے) توبہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

یہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا ایک نمونہ ہے۔ اس سلسلے کی اور اخلاقی تعلمات قرآن وحدیث میں موجود ہیں جنہیں حسب ضرورت قانونی شکل بھی دی جاسکتی ہے اور انکے حدود متعین کیے جا سکتے ہیں۔

﴿2﴾ اظہارِ خیال کے نام پر بے حیائی اور بدکاری کے نشر واشاعت کی اجازت نہ ہوگی جو سوسائیٹی کی اخلاقی اور تہذیب وشرافت کی علم بردار ہووہ کسی حال میں اخلاقی باختگی کی تعلیم وتبلیغ کے لئے جواز فراہم نہیں کرسکتی۔ اس طرح کی ہر کوشش کو وہ سختی سے روک دیگی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۰﴾

(سورۃ النور:20)

ترجمہ: بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کے درمیان بدکاری کا چرچا ہو تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

﴿3﴾ ریاست میں بے چینی اور اضطراب پیدا کرنے، بدامنی پھیلانے اور ملکی مفاد کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہ ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم نے متعدد دفعہ یہود اور منافقین کو تنبیہ وتہدید کی ہے کیونکہ وہ مسلسل اسلامی ریاست کے خلاف سرگرم رہتے تھے۔ وہ مسلمانوں میں غلط افواہیں پھیلاتے اور ان کو ہر ممکن طریق سے تنگ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس

تنبیہ کے بعد منافقین کے حوصلے پست ہو گئے اور ریاست کو نقصان پہنچانا ان کے لئے آسان نہ رہا۔ اور مسلمان بھی اس ضمن میں ہوشیاری سے کام لینے لگے۔

۴۔ خاندان بسانے کا حق

انسان کو اس کا حق ہے کہ وہ خاندانی زندگی گزارے، اس لیے کہ خاندان کی ایک فطری اور سماجی ضرورت ہے۔ مہذب دنیا اس حق کو تسلیم کرتی ہے اسی طرح تمام مذاہب بھی۔ خاندان کی اساس ازدواجی تعلق پر ہے۔ اسلام نے اس تعلق کو وجہ سکون اور نسل انسانی کی بقا اور تسلسل کا جائز طریقہ قرار دیا ہے اور اس سے جو رشتے اور تعلقات وجود میں آتے ہیں ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ اسلام خاندان کو کوئی ناپسندیدہ بوجھ قرار نہیں دیتا جس کے اٹھانے میں انسان ناگواری محسوس کرے، بلکہ یہ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ یہی بات اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

(النحل:73)

اللہ نے تمہارے کئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کئے اور تمہارے جوڑوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے اور کھانے کے لیے تمہیں پاک چیزیں دیں تو کیا پھر بھی وہ باطل پر ایمان لائیں گے اور اللہ کے احسان کا انکار کریں گے۔

اسلام نے خاندان کا ایک پورا نظام عطا کیا ہے۔ اس میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعین کر دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ اس میں چھوٹوں سے شفقت و محبت اور بڑوں کے عزت و احترام کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ اسلام نے معاشرہ کے ہر فرد کو تاکید کی ہے کہ اس نظام کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کرے اور اسے نقصان نہ پہنچنے دے۔

۵۔نجی زندگی میں عدم مداخلت

اسلام نے انسان کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ اسے اپنی نجی زندگی میں آزادی حاصل رہے اور کوئی بیرونی مداخلت اس میں نہ ہو۔اسلام نے بتایا ہے کہ ہر شخص اللہ کے حضور جواب دہ ہے اسلئے کسی کے لئے جائز نہیں کہ کسی کے اعمال کی تفتیش کرے۔ہاں اگر وہ علی الاعلان کسی جرم کا ارتکاب کر رہا ہو یا اسکا عمل کسی دوسرے فرد یا معاشرہ کے لئے ضرر رساں ہو تو وہ قانون کی گرفت میں ضرور آئے گا۔لیکن اسلام یہ بھی سکھاتا ہے کہ حسن ظن کا پہلو ہمیشہ غالب رکھنا چاہیئے دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ تجسس نہ کیا جائے۔کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ لگانا اور چپکے چپکے اس کی خامیوں کو تلاش کرتے پھرنا غیر اخلاقی اور ناشائستہ رویہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۳﴾

(الحجرات:13)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو کثرت گمان سے بچو۔بیشک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کے عیب نہ تلاش کرتے پھرو اور نہ پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی کیا کرو،کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے،سو تم اس سے نفرت کرتے ہو۔اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ توبہ کو بہت قبول فرمانے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کی اصلاح کی خاطر اس کے نجی حالات سے واقف ہونے کی خفیہ کوشش بھی غلط ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ تجسس سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اس سے بگاڑ کا زیادہ اندیشہ ہے۔اگر ایک شخص کے علم میں یہ بات آجائے کہ جس جرم کا ارتکاب وہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر کر رہا تھا اب وہ دوسروں پر کھل گئی ہے تو اس کی شرم اور جھجک ختم ہو جائے گی اور وہ اپنے گناہ میں مزید دلیر ہو جائے گا۔ایک حدیث میں یہی نفسیاتی حقیقت بیان ہوئی ہے چنانچہ حضرت معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

انك اذا اتبعت عورات الناس افسدتهم

جب تم لوگوں کے خفیہ عیوب کے پیچھے پڑ جاؤ گے تو انہیں بگاڑ میں ڈال دو دے۔

(مشکوۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء بحوالہ بیقھی)

یہی بات سربراہ مملکت سے بھی کہی گئی ہے۔حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان الامير اذا ابتغى الريبة فى الناس افسدهم

یقیناامیر جب لوگوں میں ایسی چیزیں ڈھونڈھنے لگے جو شک وشبہ میں ڈالتی ہیں تو ان کو بگاڑ دے گا۔

(مسند احمد ۶ / ۴۔ابوداؤد کتاب الادب)

۶۔خلوت (Privacy) کا حق

آدمی کا گھر اس کی تنہائی اور خلوت کی خاص جگہ ہے۔اس میں بے جھجک گھس پڑنا اسکی تنہائی میں مداخلت ہے ۔اسلام نے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ آدمی دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرے اور صاحب خانہ کی اجازت سے اندر جائے۔اگر تین بار سلام کرنے کے باوجود کوئی جواب نہ آئے یا اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جائے اور اس پر ناگواری نہ محسوس کرے:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۸﴾

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

(النور:28,29)

ترجمہ:اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے علاوہ دوسروے گھروں میں مت داخل ہو جاؤ، جب تک کہ ان سے اجازت نہ حاصل کر لو اور (اسکے لئے) ان میں رہنے والوں کو سلام نہ کر لو۔یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔امید ہے کہ تم اسے یاد رکھو گے اگر تم ان مکانوں میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو ان میں مت داخل ہو

، جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے۔ اگر تم سے واپس لوٹنے کے لئے کہا جائے تو لوٹ جاؤ۔ یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔

اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر کسی کے گھر تانک جھانک کرنا اور اندرونی حالات اور قوائف جاننے کی کوشش کرنا سخت معیوب ہے۔ حدیث ہے کہ رسول اللہؐ مکان پر تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے دروازے کے سراخ سے جھانک کر دیکھا۔ آپ کے ہاتھ میں کنگی نما لوہے یا لکڑی کی کوئی چیز تھی جس سے آپؐ سرِ مبارک کھجلا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں یہ سمجھتا کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو تو اسے میں تمہاری آنکھ میں مار دیتا۔ اجازت لینے کا حکم نگاہ ہی کی وجہ سے تو ہے۔

(بخاری کتاب الدینیات۔ مسلم کتاب الآداب)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لو اطلع فی بیتك احد ولم تأذن له فخذفته بحصاۃ ففقأت عینه ما كان علیك من جناح

(بخاری کتاب الدیات باب من اخذ حقہ او اقتص دون السلطان)

اگر کوئی شخص تمہارے گھر میں جھانکے تم نے اسے اجازت نہ دی ہو۔ اس حرکت پر تم کوئی کنکر مار کر اسکی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

اسی طرح حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو قریب ترین عزیزوں کے گھر میں بھی انکی اجازت لے کر ہی داخل ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم کسی کے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہو اور تین بار سلام کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں ملتا تو تم پھر واپس چلے آؤ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے (Privacy) خلوت میں عدم مداخلت کو کتنی اہمیت دی ہے اور معاشرہ کو اس حق کے احترام کا کس قدر پابند بنایا ہے۔

۷۔ ملک وملت کی خدمت کا حق

ملک وملت کی فلاح و بہبود کی فکر اور اس کیلئے کام کرنا، ریاست یا کسی خاص فرد یا گروہ کے

ساتھ مخصوص نہیں ہے۔اسلام نے ریاست کے ہر شہری کو یہ حق دیا ہے کہ اسے ملک وملت کی خدمت کا موقع میسر ہو اور اس پر غیر ضروری پابندی نہ لگائی جائے۔اسلام نے تعلیمی،سماجی،معاشرتی،اخلاقی،اصلاحی،سیاسی ہر طرح کی خدمت کی ترغیب دی ہے اور اس پر معاشرہ کو آمادہ کیا ہے۔قرآن کریم نے اس کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ﴿۱۱۵﴾

(النساء:115)

ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے اس شخص کے جس نے صدقہ کا حکم دیا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کی۔

قرآن وسنت کے علم کو لوگوں میں عام کرنے کی جدوجہد اسلام کے نزدیک بہترین جدوجہد ہے۔حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تعلّمَ القرآن وَ عَلَّمَهُ

(بخاری کتاب فضائل القرآن باب ۲۱۔ترمذی کتاب ثواب القرآن)

تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو خود قرآن سیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔

آدمی کا تندرست ہونا اور معاشرہ کی فلاح کے لئے کام کرنا اسلام کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

المومن القوی خیر و احب الی اللہ من المومن الضعیف و فی کل خیر

(مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ الخ)

طاقتور اور قوی مومن اللہ کے نزدیک بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے اس مومن سے جو کمزور اور ضعیف ہے (اسکے باوجود) ہر ایک میں خیر ہے۔

اسی طرح اسلام کی یہ اعلیٰ اخلاقی ومنفرد تعلیم ہے کہ افراد اور گروہوں کے لڑائی جھگڑوں کو ختم کرنا اور ان کے درمیان تعلقات کو بحال کرنے کی کوشش کرنا معاشرہ کی بہترین خدمت ہے اور اس نیک کام کا بہت بڑا ثواب ہے۔اس کام کی فضیلت نفل عبادت سے زیادہ ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابوداؤدؓ کی روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا:

الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام و الصدقۃ و الصلوٰۃ قال قلنا بلیٰ ۔قال اصلاح ذات البین وفساد ذات البین ھی الحالقۃ۔

(مسند احمد ۶ / ۴۴۴)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ (نفل) روزہ صدقہ وخیرات اور نماز سے اعلیٰ درجہ کا عمل کون سا ہے۔راوی کا بیان ہے کہ ہم نے کہا کہ ضرور بیان فرمائیے۔آپؐ نے فرمایا وہ ہے آپس کے تعلقات کوٹھیک کرنا اور آپس کے تعلقات کا بگاڑتو (دین ودنیا کو) مونڈ دینے والی چیز ہے۔

دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کا حق بھی ہر ایک کو حاصل ہوگا۔اس کا ثبوت حضرت ام حبیبہؓ کی اس روایت سے ملتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

کل کلام ابن آدم علیہ لا لہ الا امر بالمعروف او نھی عن منکر او ذکر اللہ

(ترمذی کتاب الذھد، باب ماجاء فی حفظ اللسان)

امر بالمعروف، نہی عن المنکر یا اللہ کے ذکر کے سوا ابن آدم جو بھی کلام کرتا ہے وہ اس کے لیے نقصان دہ ہی ہے۔سودمند نہیں ہے۔

اس طرح اسلام ہر شخص کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ معاشرہ کی فلاح اور انسانوں کی خدمت کے لیے اپنی کوشش کرے،اس کے لیے قوت وطاقت اور صلاحیت پیدا کرے اور خدمت کو بڑے اجروثواب کا کام سمجھ کراسے انجام دے۔

قارئین! آیئے اب میں آپ کو اسلامی تعلیمات کی ایک اور امتیازی شان بتاتا ہوں۔اسلام کے علاوہ دیگر جتنے بھی مذاہب ہیں اُن میں مذہبی عبادات کی پیروی کرنے والے لوگ مخصوص ہوتے ہیں اور ہر کوئی ان کی عبادت کا امام نہیں بن سکتا ۔جیسے عیسائیوں میں مقررہ ORDAINED پادری کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی عبادت نہیں کرواسکتا۔اسی طرح ہندوؤں میں بھی خاص نسل کے پنڈت کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نماز نہیں پڑھا سکتا۔سکھوں میں گرنتھی کے سوا کوئی دوسرا آدمی گرنتھ صاحب کا پاٹھ نہیں کرواسکتا۔لیکن اسلام نے امام بننے کے لئے کسی خاص گروہ میں سے ہونے کے اصول کوتوڑ دیا ہے اور امامت کے لئے اس نے کسی خاندان یا

کسی خاص قوم کی خصوصیت نہیں رکھی بلکہ اسلام کے نزدیک ہر انسان جو دیندار ہوا، نماز کا امام بن سکتا ہے۔ اُس کے لئے کسی خاص نظام، کسی خاص نسلی یا کسی خاص خاندان میں سے ہونا ضروری نہیں۔

ملکی عہدوں کی تقسیم میں مکمل مساوات کی تعلیم

اسلام نے جہاں لوگوں کو ملک وملت کی خدمت کرنے کا حق عطا کیا ہے وہیں یہ تاکید بھی کی ہے کہ عہدوں کی تقسیم کے وقت اس کے اہل لوگوں کو مقدم رکھا کرو۔ عہدوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم کا سوال بہت ہی اہم سوال ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق قرآن شریف فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۹﴾

(سورۃ النساء آیت:59)

اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ قومی اور ملکی عہدوں کی تقسیم کے معاملہ میں جو خدا کے نزدیک ایک مقدس امانت کا رنگ رکھتے ہیں صرف ذاتی قابلیت اور ذاتی اہلیت کو دیکھا کرو۔ اور جو شخص بھی اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے کسی عہدہ کا اہل ہو اُسے وہ عُہدہ سپرد کیا کرو خواہ وہ کوئی ہو۔ اور جب تم کسی عہدہ یا ذمہ داری کے کام پر مقرر کئے جاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ لوگوں میں کامل عدل وانصاف کا معاملہ کرو۔

یہ زرّیں تعلیم ہمیشہ اسلامی حکومتوں کا طُرّہ امتیاز رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائیٹی میں بعض بظاہر ادنیٰ سے ادنیٰ لوگ ترقی کر کے عروج کے کمال تک پہنچے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو جو ایک آزاد شدہ غلام تھے کئی فوجی دستوں کا امیر مقرر فرمایا کیونکہ آپ امارت کے اہل تھے ۔ اور پھر زید کی وفات کے بعد آپؐ نے ان کے نوجوان فرزند اسامہ بن زید کو بھی ایک بڑی فوج کا امیر مقرر فرمایا جس میں بعض بڑے بڑے صحابہ بھی شامل تھے جو قدیم دستور کے مطابق عرب معاشرہ میں گویا پہاڑ کی طرح سمجھے جاتے تھے اور جب اس پر بعض ناسمجھ نو مسلموں میں چہ میگوئی ہوئی کہ ایک نوجوان غلام زادہ کو ایسے ایسے

معمّر اور جلیل القدر لوگوں پر امیر مقرر کیا گیا ہے تو آنحضرتؐ نے نہایت غصہ کا اظہار فرمایا۔
(تفصیل کے لئے دیکھیں بخاری ابواب مناقب)

چنانچہ اس قسم کی اور بھی بہت ساری مثالیں ہمیں تاریخ میں مل جاتی ہیں جس سے اسلامی معاشرہ کی خوبصورتی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اسی مبارک تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام میں ہمیشہ بظاہر ادنیٰ ترین لوگوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی حاصل کی اور کبھی کسی شخص کی غربت یا نسلی پستی اُس کی ترقی میں روک نہیں بنی۔

۸۔ تنقید اور اصلاح کا حق

اللہ تعالیٰ کے رسول دنیا میں حق کی تبلیغ اور معاشرہ کی اصلاح کا فرض انجام دیتے ہیں اور ہر خوف وخطر سے بے نیاز ہو کر انجام دیتے ہیں۔ معاشرہ میں جو خرابیاں پائی جائیں ان پر تنقید اور اصلاح کا اسلام نے ہر ایک کو حق دیا ہے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

قل الحق ولو کان مرا — حق بات کہو چاہے وہ کسی کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔

لا تخف فی اللہ لومۃ لائم — اللہ کے (دین) معاملہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کرو۔

(مشکوٰۃ المصابیح کتاب الآداب، باب حفظ اللسان)

حکومت اور ریاست کے اقدامات کی تائید یا اعتراض کے معاملہ میں اسلام نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ اسکی حمایت معروفات میں کی جائے گی۔ اگر حکومت شریعت کے منکرات کو فروغ دے رہی ہو تو اس کے ساتھ تعاون نہ ہوگا اور اس سے دوری اختیار کی جائے گی۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

لا طاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف

معصیت میں اطاعت نہیں ہوگی اطاعت تو معروف میں ہوتی ہے۔

(بخاری کتاب اخبار الآحد۔ مسلم کتاب الامارۃ)

اسی طرح حضرت نواس بن سمعانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق

خالق کی معصیت کے معاملہ میں مخلوق کی بات نہیں مانی جائے گی۔

(مشکوٰۃ المصابیح کتاب الامارۃ والقضاء)

اسلام، فرد کو سماج میں متحرک اور باعمل دیکھنا چاہتا ہے۔اس کے لیے اس نے بہترین راہ نما خطوط بھی فراہم کر دیے ہیں۔ان کی پابندی ہو تو معاشرہ شر و فساد کے خارزار سے پاک ہوسکتا اور امن و امان اور خیر و صلاح کا گلستان بن سکتا ہے۔

۹۔مذہب کی آزادی کا حق

اسلام نے انسان کو جو حقوق دئے ہیں ان کے ذیل میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے؟ اس سوال کو بعض دفعہ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے وہ اسلامی ریاست میں اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور انہیں کوئی حق نہیں دیا جائے گا بلکہ جبراً اسلامی احکام کا پابند بنایا جائے گا۔اسلام کا ہرگز یہ موقف نہیں ہے۔اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ عقیدہ اور مذہب کے لیے جبر کی اجازت نہیں ہے۔پس جو لوگ دین کے معاملہ میں جبر سے کام لیتے ہیں وہ ہرگز اسلامی تعلیمات کی پیروی نہیں کرتے۔اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے اور اب دنیا میں واحد دین حق ہے۔اب اگر خدا سے تعلق قائم ہوسکتا ہے اور سچی ہدایت مل سکتی ہے تو محض اسلام کے ذریعہ اور اسکی تعلیمات کی پیروی کے ذریعہ۔اسلام نے اپنے اس موقف کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور دنیا میں کروڑوں لوگوں نے اس سچائی کو پہچان کر ہی اسلام قبول کیا ہے۔لیکن اسلام کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ اسے قبول کیا جائے بلکہ انسان کو قبول کرنے یا نہ کرنے کی آزادی عطا کرتا ہے۔بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ فطری خواہش تھی کہ سب لوگ اسلام کو اللہ تعالیٰ کے دین کی حیثیت سے قبول کر لیں لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ اللہ کی مشیت کے خلاف ہے اور اگر وہ چاہتا تو خود ہی سب کو بزور

جبراً اپنے دین کا پابند بنا دیتا آخر وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ انسان کو آزادی دی ہے کہ وہ اسکے دین کو چاہے قبول کرے یا نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آزادی دی ہے تو کوئی بھی شخص اسے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴿۱۰۰﴾

(سورۃ یونس:100)

ترجمہ:اور اگر اللہ (ہدایت کے معاملہ میں) اپنی (ہی) مشیت کو نافذ کرتا تو (جس قدر) لوگ زمین پر موجود ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے (پس جب خدا بھی مجبور نہیں کرتا) تو کیا تُو لوگوں کو (اتنا) مجبور کرے گا کہ وہ مومن بن جائیں۔

(ترجمہ از تفسیر صغیر:الحاج حضرت مرزا بشیر الدین محمودؓ)

اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۃ انعام آیت ۳۶ میں پرزور انداز میں کہی ہے۔نیز اللہ تعالیٰ نے تو قرآن کریم میں واضح الفاظ میں یہ اعلان فرما دیا ہے کہ:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ

(سورۃ البقرۃ:۲۵۷)

دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے۔ہدایت،ضلالت اور گمراہی سے الگ واضح ہو چکی ہے۔

اس وضح اعلان کے بعد اب کون عاقل ہے جو یہ مان سکتا ہے کہ اسلام میں دین کے معاملہ میں جبر کی اجازت دی گئی ہے۔ بلکہ اسلام کے معاملہ میں تو مخالفین کا الٹ ہی رویّہ ہے۔ایک انسان دنیا کے کسی بھی نظریۂ حیات کو قبول کرنے کا حق رکھتا ہے تو معقول اور منطقی بات ہے کہ اسے اسلام کے نظریۂ حیات کو اپنانے کا بھی حق ملنا چاہئے۔لیکن مخالفین اسلام اسکے بارے میں یہ رویہ اختیار نہیں کرتے اور وہ آزادیٔ فکر کے حق کو پامال کرتے ہوئے جبر کے تالے انسانوں پر لگاتے ہیں۔ایک ہی معاملہ میں وہ الگ الگ پیمانے اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔اسلام نے کہا ہے کہ یہ جبر اور بندش خدا کے نزدیک سخت ناروا اور مذموم ہے۔اس کی پکڑ سے قیامت کے

روز بچ نہیں سکتے۔(النساء:۱۶۸-۱۷۰)

قرآن مجید نے پیغمبروں اور خدا پرست انسانوں کی تاریخ پیش کی ہے کہ انہیں دین کے مطابق عمل کرنے اور اسے اللہ کے بندوں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ۔مخالفین نے انہیں دعوت وتبلیغ کا حق دینے سے انکار کیا اور لوگوں کو اللہ کے دین کو قبول کرنے سے جبراً روک دیا گیا۔حضرت ابراہیمؑ کو دین حق کی تبلیغ ہی کی وجہ سے آگ میں ڈالا گیا۔حضرت موسیٰؑ کے قتل کا باہم مشورہ ہونے لگا اور آپؑ کے معجزات کے مقابلے کے لیے جادوگر بلائے گئے ۔اسی طرح قرآن نے اصحابِ اخدود کا ذکر کیا ہے کہ انہیں محض اس جرم میں دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا کہ خدائے واحد پر جو زمین وآسمان کا مالک ہے وہ ایمان رکھتے تھے۔(البروج :۵-۱۰)اسی طرح اصحابِ کہف جو چند نوجوان تھے انہیں اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے ایمان کا اظہار کریں اور وہ بستی کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے(الکھف)۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کن نازک حالات سے گزر رہے تھے اور ان کے ساتھ کس قدر سخت رویہ اختیار کیا گیا تھا۔اسلام اس طرزِ عمل یا Persicution کا مخالف ہے۔اسلام نے ہمیشہ انسان کو مذہب کی آزادی کا حق دیا ہے۔رسول کریمؐ نے تو دشمنوں کے بھی مذہبی حقوق کی ہمیشہ حفاظت کی ہے۔چنانچہ فتح خیبر کے دوران مسلمانوں کو توریت کے بعض نسخے بھی ملے ۔یہودی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہماری کتاب مقدس ہمیں واپس کی جائے ۔چنانچہ رسول کریمؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ یہود کی مذہبی کتابیں ان کو واپس کر دو۔مذہبی رواداری کی یہ کتنی عظیم الشان مثال ہے۔

(السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۴۹)

اسی طرح آنحضرتؐ کی زندگی کے اور بھی بہت سارے واقعات ہیں جن سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ ہمیں دوسروں کے مذہبی حقوق کا احترام کرنا چاہئے خواہ دوسرے ہمارے ہم مذہب ہوں یا غیر۔آپؐ نے تو متعدد دفعہ مشرکوں کو اپنی مسجد میں پناہ دی اور نجران کے عیسائیوں کا واقعہ تو مشہور

ہے کہ آپؐ نے انہیں نہ صرف یہ کہ مسجد نبوی کا مکین بنالیا بلکہ جب مسیحی عبادت کا وقت آیا تو صحابہ نے انہیں مسجد میں اپنی عادت کرنے سے منع فرما دیا لیکن آنحضرتؐ نے انہیں مسجد نبوی میں عبادت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(اسباب النزول صفحہ ۵۳)

یہود کا اسلام کے ساتھ کیا رویہ تھا یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یہ یہود بھی مسجد نبوی میں بلا روک ٹوک کے آیا جایا کرتے تھے۔لیکن افسوس ہے کہ اس زمانہ میں بھی ایک طبقہ کا یہی رویہ جماعت احمدیہ کے ساتھ ہے اور سب سے زیادہ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ یہ تمام گھنونی کاروائیاں اسلام کے نام پر ہوتی ہیں جو کہ سراپا دین رحمت ہے۔ یہ رویہ انبیاء کے مخالفین کی سنت ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جماعت احمدیہ انبیاءؑ کی سنت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سچے دین کی سچی تعلیمات کو باوجود مخالفین کی کوششوں کے پھیلا رہی ہے ۔

۱۰۔عدالتی امور میں مکمل مساوات کا حق

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ تمام لوگوں کو یہ حق ہے کہ انہیں شرعی یا ریاستی عدالت سے انصاف ملے اور حکومت ان کے ساتھ عدالتی امور میں مساوات کا سلوک کرے۔عدالتی اور قضائی حقوق کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں اور کن شاندار الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

اِنَّمَا اَھْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اَنَّھُمْ كَانُوا یُقِمُونَ الْحَدَّ عَلَی الْوَضِیعِ وَیَتْرُكُونَ الشَّرِیفَ وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہِ لَو اَنَّ فَاطِمَةَ فَعَلَتْ ذٰلِكَ لَقَطَعْتُ یَدَھَا ۔

(بخاری کتاب الحدود)

یعنی تم سے پہلے اس بات نے کئی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ جب ان میں سے کوئی چھوٹا آدمی جرم کرتا تھا تو وہ اُسے سزا دیتے تھے اور جب کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تھا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے۔اور اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میری لڑکی فاطمہ بھی چوری کریگی تو میں اسلامی طریق پر اُس کے بھی ہاتھ کاٹوں گا۔

قارئین!غور فرمائیں کہ جس جلال کے ساتھ اسلامی مساوات کو قائم کیا گیا ہے اور یہ تعلیم وہ تھی

جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلفاء نے بھی بڑی سختی کے ساتھ مدّنظر رکھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ اوّل، اپنی خلافت کے سب سے پہلے خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

الضعیف فیکم قوی عندی حتّٰی اُرِیْحَ علیہ حقَّہٗ ان شاء اللہ و القوی فیکم ضعیف عندی حتی اٰخذَ الحق منہٗ۔

(ابن ہشام امر سقیفہ بنی ساعدہ)

یعنی اے مسلمانو! سن لو کہ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے لئے اُس وقت تک قوی ہوگا جب تک کہ میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے لیے اُس وقت تک کمزور ہوگا جب تک کہ میں اسے وہ حق جو اُس نے کسی اور کا دبایا ہوا ہو واپس نہ لے لوں۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ ثانی کے متعلق روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ شمالی عرب کے ایک بڑے رئیس جبلہ بن اہیم نامی نے جو مسلمان ہو چکا تھا کسی غریب مسلمان کو غصہ میں آ کر تھپڑ مار دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس واقع کا علم ہوا تو آپ نے جبلہ کو بلا کر فرمایا:۔

’’جبلہ! میں سنتا ہوں کہ تم نے ایک غریب مسلمان کو تھپڑ مارا ہے۔ اگر تم نے ایسی حرکت کی ہے تو خدا کی قسم تم سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔‘‘

(فتوح البلدان حالات جنگ یرموک، بحوالہ سیرت خاتم النبییّن مصنف حضرت مرزا بشیر احمد ایم۔اے صفحہ ۶۸۹)

یہ ہے اسلام میں عدل و انصاف میں مساوات کا معیار کہ مظلوم کو اس کا حق دلانے کے لئے اس بات کی پرواہ نہ کی جائے کہ دوسرا فریق کی کیا حیثیت یا مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے خلافت کی ڈھال کے تلے جہاں جہاں بھی اسلامی حکومتیں قائم کیں وہاں علاقوں کو جیتنے کے ساتھ ساتھ رعایا کے دلوں کو بھی جیتا اور بہت سارے لوگوں کے قبول اسلام کی یہی وجہ بنی کہ انہوں نے دیکھا کہ اسلام سب کو برابر انصاف اور قانونی حقوق دیتا ہے۔

کمزور افراد اور طبقات کے حقوق

کمزور افراد اور طبقات کے حقوق

معاشرے میں جسمانی، دماغی، معاشی اور سماجی لحاظ سے کمزور افراد اور طبقات پہلے بھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں اور دنیا کے ہر ملک میں ہیں۔ کمزوروں کی تاریخ ان کے حقوق کی پامالی کی تاریخ ہے۔ انہوں نے ظلم و زیادتی کے نرغے میں زندگی گزاری ہے اور بنیادی حقوق تک سے انہیں محروم رکھا گیا ہے۔ معاشرے کے کمزور افراد اور طبقات پر جو مظالم ہو رہے تھے اسلام نے شروع ہی سے ان کے خلاف پُر زور آواز اٹھائی، ان کے حقوق کا علم بلند کیا اور انکے محافظ کی حیثیت سے سامنے آیا۔ مذاہب عالم میں اسلام کو یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ اس نے کثرت کے ساتھ کمزوروں کو حقوق فراہم کرنے کی تعلیم دی اور ایسے معاشرہ کی بنیاد رکھی جس میں کمزوروں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہوتی ہو اور زور آوروں کے ظلم کی چکی میں نادار، یتیم، مسکین اور معذور پس نہ رہے ہوں۔ اسلام نے کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انہیں انکے حقوق دینے کی سخت تنقید کی ہے اور اسے ایک بڑی نیکی میں شمار کیا ہے جس کا اجر انسان کو جنت کے رنگ میں ملتا ہے۔ چنانچہ بانیٔ اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی نیکی کا اجر بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: جس شخص میں تین باتیں پائی جاتی ہوں اللہ تعالیٰ اس کی موت کو آسان کر دیتا ہے اور اسے اپنی جنت میں داخل کرتا ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں: کمزوروں کے ساتھ نرمی کرنا۔ والدین سے شفقت کا سلوک کرنا، اور ماتحتوں اور غلاموں اور نوکروں پر احسان کرنا۔

(ترمذی شریف)

قرآن کریم نے وقت کے جابروں اور ظالموں کو سخت تنقید کا ہدف بنایا اور ان کے ظلم پر آخرت کی وعید سنائی۔ اس کے ساتھ کمزور اور محروم افراد کے قانونی حقوق واضح کئے اور افلاس و غربت کی وجہ سے معاشرہ میں جن کا درجہ کمتر تھا، انہیں مساوی اور برابر کا درجہ عطا کیا۔ یہاں ان میں سے بعض کا مختصراً ذکر ہے۔

ا۔عورت کے حقوق

قارئین کرام! آج کا زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے۔اس ترقی یافتہ زمانہ میں کوئی بھی پیچھے رہنا پسند نہیں کرتا۔ اگر مرد کمپیوٹر پڑھ کر اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوتے ہیں تو عورتیں بھی کمپیوٹر سائنس پڑھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔مرد اگر چاند پر پہنچ رہا ہے تو عورتیں بھی اس سے پیچھے رہنا پسند نہ کر کے چاند پر پہنچ رہی ہیں۔الغرض عورتیں ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ چلنے کو اپنا حق سمجھتی ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کی عورتوں کو جو حقوق ملے ہیں کیا گزرے کل کی عورتوں کو وہی حقوق حاصل تھے۔اسکے جواب میں ہر ان پڑھ سے ان پڑھ شخص بغیر سوچے سمجھے یہ جواب دینے پر مجبور ہے کہ ہرگز نہیں۔ بلکہ میں کہوں گا کہ اسلام سے قبل عورتوں کی حالت بہت ہی خطرناک اور دکھ بھری تھی۔آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں عورت کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔یہ عورت کے ساتھ ہر زمانہ میں ظلم ہوتا رہا ہے۔مرد نے اسے برابر کی حیثیت نہیں دی، اسے فروتر سمجھا، اس کے حقوق پامال کیے اور اس کے ساتھ غیر اخلاقی بلکہ بسا اوقات غیر انسانی رویہ اختیار کیا۔عورت اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے یہ سب برداشت کرتی رہی اور شاید کبھی احتجاج کی بھی جرأت نہیں کی۔عورتوں کے ساتھ عرب کی سوسائیٹی میں بدترین سلوک کیا جاتا تھا۔لڑکیوں کو باعثِ ننگ سمجھا جاتا تھا۔مرد کی وفات پر عورتوں کو ترکہ میں بانٹ دیا جاتا تھا۔اور یہاں تک بے حیائی تھی کہ ماؤں کے ساتھ نکاح کر لینا جائز سمجھا جاتا تھا۔اس سے بڑھ کر صنف نازک پر اور ظلم کیا ہوگا کہ بعض قبائل عرب میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔انکی موت کو انکی حیات سے بہتر تصور کیا جاتا تھا۔ان کے مالی حقوق نہ تھے، وراثت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ زندہ بھی ہوتیں تو بوجھ ہی سمجھی جاتیں اور بوجھ ہی سمجھ کر ان کی پرورش ہوتی تھی۔عام تصور میں مرد کو تمام معاشرتی وسماجی حقوق حاصل تھے

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ بلوغ الارب: محمود شکری آلوسی)

اس دور جہالت میں عورتوں کی ناگفتہ بہ حالت اور رسول اللہؐ کے پیدا کردہ انقلاب کی نہایت سچی تصویر سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ نے اپنی ایک نظم میں خوب کھینچی ہے۔ آپ عورتوں سے مخاطب ہوکر فرماتی ہیں:۔

رکھ پیش نظر وہ وقت بہن ! جب زِندہ گاڑی جاتی تھی
گھر کی دِیواریں روتی تھیں جب دنیا میں تُو آتی تھی
جب باپ کی جُھوٹی غیرت کا خُوں جوش میں آنے لگتا تھا
جس طرح جنا ہے سانپ کوئی یُوں ماں تیری گھبراتی تھی
یہ خونِ جگر سے پالنے والے تیرا خُون بہاتے تھے
جو نفرت تیری ذات سے تھی فطرت پر غالب آتی تھی
کیا تیری قدر و قیمت تھی؟ کچھ سوچ! تیری کیا عزت تھی؟
تھا موت سے بدتر وُہ جینا قسمت سے اگر بچ جاتی تھی
عورت ہونا تھی سخت خطا، تھے تُجھ پر سارے جبر روا
یہ جُرم نہ بخشا جاتا تھا تا مرگ سزائیں پاتی تھی
گویا تُو کنکر پتھر تھی احساس نہ تھا جذبات نہ تھے
توہین وہ اپنی یاد تُو کر! ترکہ میں بانٹی جاتی تھی
وہ رحمت عالمؐ آتا ہے تیرا حامی ہو جاتا ہے
تُو بھی انساں کہلاتی ہے سب حق تیرے دلواتا ہے
ان ظلموں سے چھڑواتا ہے
بھیج درود اُس محسن پر تُو دن میں سو سو بار
پاک محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نبیوں کا سردار

اس صورتِ حال کے خلاف اسلام نے آواز اٹھائی، معاشرہ میں انہیں برابر کا مقام دیا اور ان کے خلاف ہر طرح کی دست درازی کو جرم قرار دیا۔قربان جاؤں میرے آقا نبیوں کے شہنشاہ رحمۃ للعلمینؐ پر جنہوں نے آتے ہی بانگ دھل اعلان فرمایا کہ:

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَ کُمْ من خَشْیَۃَ اِمْلاق۔

(سورۃ بنی اسرائیل:32)

نیز خاوندوں کو مخاطب کرتے ہوئے تاکیدی حکم دیا کہ

وَعاشِرُ ھُنَّ بالمعروف

(سورۃ نساء:20)

یعنی تم اپنی بیٹیوں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کرو۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا کیا اثر پڑا؟ اس کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے بخوبی ہوتا ہے کہ:

''مکہ مکرمہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے۔مدینے میں نسبتاً ان کی قدر تھی ،لیکن جب اسلام آیا اور عورتوں کے متعلق آیات نازل ہوئیں تو ہم کو ان کی قدر ومنزلت کا صحیح احساس ہوا۔''

(بخاری، کتاب النکاح، باب ۸۳)

اس سے بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو صرف چند حقوق ہی عطا نہیں کئے بلکہ ان کو معاشرے میں ان کا جائز مقام دلا کر انسانیت کی تکمیل کی ہے۔اسلام نے جائیداد میں عورتوں کا حق مقرر کیا ازدواجی زندگی میں عورت و مرد کے حقوق وفرائض متعین کیے، معاشرہ میں انہیں اپنا رول ادا کرنے کے مواقع فراہم کئے۔عورت کو مرد کا ضمیمہ نہیں قرار دیا بلکہ اس کی انفرادیت کا اعلان کیا اور کہا کہ دونوں خدا کے بندے ہیں اور اس کے سامنے جواب دہ ہیں، ان میں سے جو حسن عمل کا توشہ لے کر اللہ کے حضور پہنچے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس سے خالی ہوگا وہ ناکام و

نامراد ہوگا۔

ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں سے حسن سلوک کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ جو تم کھاؤ انہیں بھی کھلاؤ جو پہنو انہیں بھی پہناؤ۔ اور انکے منہ پہ نہ مارو۔ نیز فرمایا خَیرُکُم خَیرُکُم الاھلہ (ترمزی ابواب المناقب)۔ یعنی تم میں سے سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے اھل و اعیال سے بہترین سلوک کرتا ہے۔ اور کیا ہی خوبصورت انداز میں فرمایا کہ مجھے تین چیزیں بہت ہی پسند ہیں۔ یعنی نماز، خوشبو اور عورت۔ یہی وجہ تھی کہ عورت آپ کے عہد نبوت سے یہی بلند مقام پر پہنچ گئی۔ نکاح کے لئے خود ممتاز بنی مہر کی حقدار قرار دی گئی۔ خاوند کے حق ملکیت کی وارث بنی۔ ایک طرف مرد کو طلاق دینے کی اجازت تھی تو دوسری طرف عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے خلع لے سکتی ہے۔ اور دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے۔ اور خاوند کی وفات پر بیوہ کو شادی کی اجازت ہے۔ اور پردہ میں رہ کر تمام کام سرانجام دینے کی اجازت ہے۔ آنحضرتؐ نے عورتوں کی حق رسی کی اور عزت و منزلت کے اعتبار سے ان کو مردوں کے برابر جگہ دی۔ یہاں تک کہ مستورات کی درخواست پر ان کے لئے الگ علم وعرفان کی مجلس کا انتظام فرمایا تا کہ وہ بھی کما حقہ علم سیکھ کر معاشرہ کا ایک فعال رکن بن سکیں۔

(بخاری کتاب العلم)

اسلام میں عورت کی عفت اور عصمت کی حفاظت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے، کیونکہ ایک عورت کے لئے اس کی عزت ہی اسکی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر قرآن کریم میں:۔

- عورتوں اور مردوں کو نگاہ نیچے رکھ کر چلنے اور ان کے آزادانہ اختلاط کو سختی سے منع کیا گی

(النور:۳۱،۳۲)

- عورت کی عزت وحرمت کو بحال رکھنے کے لئے حجاب کا حکم نازل ہوا۔

(الاحزاب:٦١)

- کسی پاک دامن عورت پر جھوٹی تہمت لگانے والے کو 80 کوڑوں کی سزا کا مستحق

قرار دیا گیا۔

(النور:۵)

❁ زنا کے انسداد کیلئے، غیر شادی شدہ کے لئے سو100 کوڑے اور شادی شدہ کیلئے رجم کو حد کے طور پر مقرر کیا۔

(النور:۳)

عورتوں کی عزت کرنے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تعلیم تو دیگر مذاہب میں بھی دی گئی ہے لیکن اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اس نے جہاں اس تعلیم کو احسن رنگ میں اور کامل طور پر بیان کیا وہیں اس کے ساتھ بعض مثالیں بھی دیں جو انسان کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔نیز بانیٔ اسلام نے خود عملی طور پر مسلمانوں کو عورتوں کی عزت اور قدر کر کے سکھا دیا کہ عورتیں مرد کی غلام نہیں بلکہ زندگی میں ہمسفر ہیں۔ یہ اسلامی تعلیم کا ایک واضح امتیاز ہے جس کا دیگر مذاہب میں فقدان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ عیسائیت کی تعلیمات کو ہی دیکھ لیں۔انجیل میں بھی غیر عورتوں پر نگاہ ڈالنے سے روکا گیا ہے۔لیکن بائبل میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ:۔

''جس کسی نے بُری خواہش سے کسی وعورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔''

(متی باب ۵ آیت ۲۸)

لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ تو کسی غیر عورت کے چہرہ پر نگاہ ہی نہ ڈال نہ اچھی نظر سے اور نہ بری نظر سے۔ کیونکہ اگر تُو نے غیر عورتوں کو دیکھا تو ہو سکتا ہے کہ شیطان تجھے ورغلائے اور تیرے دل میں بدی کا بیج بو دے۔

اسی طرح بائبل میں ایک قابل اعتراض تعلیم یہ بھی ہے کہ:

''کنواری سے مباشرت کرنے والا شخص لازماً اس سے شادی کرے۔''

(خروج باب 22 آیت:16-17)

گویا اگر کسی شخص کو کہیں رشتہ نہ مل رہا ہو تو اس کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔اب قارئین

اس کو پڑھ کرخود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں اس تعلیم کے بعد معاشرہ میں عورت کی کیا عزت باقی رہے گی اور شریر النفس لوگ اس سے معاشرہ میں کس قدر بد چلنی قائم کر سکتے ہیں۔

عرب میں زمانہ جاہلیت میں عورت کی کوئی رائے نہیں ہوتی تھی۔اس کے برعکس آپؐ اپنی ازواج سے مشورے لیا کرتے تھے اور ان پر عمل بھی کیا کرتے تھے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کی زوجہ نے ان کی کسی بات میں دخل دیا تو آپ ناراض ہو گئے۔اس پر ان کی زوجہ نے عرض کیا کہ آنحضورؐ کے گھر جا کر دیکھیں کہ آپ کی بیویاں کس طرح بے تکلفی سے آپؐ کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں اور آپ کو مشورے بھی دیتی ہیں۔

(بخاری کتاب النکاح)

لیکن انجیل کیا کہتی ہے۔دیکھیں:۔

''عورتیں کلیسیا کے مجمع میں خاموش رہیں کیونکہ انہیں بولنے کا حکم نہیں بلکہ تابع رہیں جیسا توریت میں بھی لکھا ہے۔اور اگر کچھ سیکھنا چاہیں تو گھر میں اپنے اپنے شوہر سے پوچھیں کیونکہ عورت کا کلیسیا کے مجمع میں بولنا شرم کی بات ہے۔''

(1 کرنتھیوں باب 14 آیت:35-34)

اسی طرح آپؐ نے سختی کے ساتھ مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ عورت کی شادی کرنے سے قبل اس کی رائے اور مرضی ضرور معلوم کریں۔ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

''کنواری لڑکی کا نکاح کرتے ہوئے اس کی مرضی معلوم کی جائے اگر وہ خاموش رہے تو اسے اس کی رضامندی سمجھا جائے لیکن اگر وہ انکار کردے تو اس پر جبر کرنا ناجائز ہے۔''

(ابوداؤد-نسائی)

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی کنواری لڑکی کی شادی ایک ایسے شخص سے کردی جس سے اسے نفرت تھی۔وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنا حال بیان کیا۔آپؐ نے فیصلہ صادر فرمایا:۔

''تجھے حق ہے چاہے تو (نکاح) فسخ کردے، چاہے تو قائم رہنے دے۔''

(سنن ابوداؤد)

آج جو قوم اپنے آپ کو حقوق نسواں کا سب سے بڑا علمبردار سمجھتی ہے اور اسلام پر اعتراض لگائے نہیں تھکتی انکا اصل چہرہ تو یہ ہے کہ پچھلے کچھ سالوں سے قبل ان کے معاشرہ میں عورت کو ووٹ ڈالنے کا بھی حق نہیں تھا اور بڑی مشقت اور قربانیوں کے بعد ہی یہ حق انہیں نصیب ہوا۔ نہ صرف یہ بلکہ آنحضورت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگی مہمات میں بھی مستورات کو شامل فرماتے تا کہ ان میں جرأت اور دلیری پیدا ہو۔ اپنی ازواج مطہرات میں قرعہ ڈالتے اور جس کا نام آتا اس کو اپنے ہمراہ غزوات میں لے کر جاتے تھے۔ یہ ہے وہ نبی جس نے عورتوں کو ان کے تمام جائز حقوق دلائے اور ان کو معاشرہ میں ایک اہم مقام دلوایا۔ آپ ؐعورتوں کے جذبات کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ اپنی ازواج سے محبت کا سلوک فرماتے تھے اور ان کی دلجوئی فرماتے تھے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آنحضورؐ جب گھر تشریف لاتے تو کام کاج میں ہمارا ہاتھ بٹاتے تھے۔

(بخاری کتاب الادب)

دنیا میں اور کون نبی ہے جس نے عورت کو اتنے بلند مقام پر پہنچایا ہو اور اسے تمام حقوق سے مالا مال کیا ہو۔ بدھؑ تو اپنی عورت کو چھوڑ کر جنگل بھاگ گیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ نے حقارت کی نظر سے دیکھ کر شادی ہی نہیں کی۔ اور ایک مقام پر ماں کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اور رام نے اپنی بیوی کو جنگل میں تنہا چھوڑ دیا۔

اسلام سے قبل عورت کو حق وراثت سے محروم تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام نے پہلی دفعہ اسے وراثت میں حصہ دار بنایا۔

(النساء:۸، ۱۲ تا ۱۳)

اس طرح سے اسلام نے عورت کی الگ ملکیت کا تصور قائم کیا تا کہ وہ معاشرے میں باوقار مقام حاصل کر سکے۔

سیدنا حضرت مصلح موعودؓ اسلام کی اس تعلیم اور حسنِ معاشرت کے بارہ میں بانیٔ اسلامؐ کے

اسوہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

''اسلام ہی ہے جس نے عورتوں کی انسانیت کو نمایاں کر کے دکھایا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورتوں کے بلحاظ انسانیت برابر کے حقوق قائم کئے اور وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ کی تفسیر لوگوں کے خوب ذہن نشین کی۔آپ کے کلام میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق اور ان کی قابلیتوں کے متعلق جس قدر ارشادات ہیں ان کا دسواں حصہ بھی کسی مذہبی پیشوا کی تعلیم میں نہیں ملتا اور یہی مطلب ہے حُبِّبَ إِلَيَّ النِّسَاء کا یعنی عورتوں کی قدردانی اور ان کی خوبیوں کا احساس میرے دل میں پیدا کیا گیا ہے۔''

(حق الیقین از انوار العلوم جلد ۹ صفحہ ۳۰۳)

پس اسلام نے عورت کو جو حقوق عطاء کئے ہیں اگر UNO کے تمام ممبر بھی مل کر یہ حقوق دینے کی کوشش کریں تو ہرگز ہرگز دے نہ سکیں گے۔یہی وجہ تھی کہ اسلام کے دشمن فرانس کے ایک مشہور مورخ اور علم النفس کے ماہر Moso Liban اس بات کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اسلام سے پہلے دنیا میں عورت کی حالت نہایت بدتر تھی۔اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے عورت کی حالت کو درست کیا اور بلند مقام پر فائز کیا۔

(بحوالہ اخبار الفضل 8 رنومبر 1931ء صفحہ:30)

عورتوں کو اُن کے حقوق دلوانے کے لئے اسلام کس قدر کوشاں ہے اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے قرآن کریم میں ایک پوری سورۃ (یعنی قرآن کا ایک باب) ہی عورتوں کے حقوق اور فرائض کے تعلق سے موجود ہے یعنی سورۃ النساء۔ یہ اسلام کی ایک امتیازی شان ہے کیونکہ دین اسلام کو چھوڑ کر دوسرے کسی بھی مذہب میں عورتوں کے بارے میں اُنکی مذہبی یا آسمانی کتب میں کوئی مخصوص باب یا Chapter معین نہیں ہے۔صرف شریعت اسلام یعنی قرآن شریف ہی وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس میں عورت کے حقوق اور مقام کے بارے میں باقائدہ ایک

Chapter مقرر ہے جس کا نام سورۃ النساء ہے۔ ویسے تو قرآن کریم میں متعدد جگہ عورتوں کے حقوق بیان ہوئے ہیں اور قرآن مجید کی ایسی آیات کی تعداد جن میں صرف عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے اُنچاس 49 ہے مگر اس سورۃ مبارکہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو وہ مقام عطا فرمایا ہے جس کا تصور دوسرے مذاہب میں نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم سے پہلے کی تمام کتب کو پڑھ کر دیکھ لیں، اُن میں عورتوں کے حقوق کا پتہ ہی نہیں چلے گا اور نہ کسی کتاب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عورت بھی انسانیت کا ایک جُزو ہے۔ قرآن کریم وہ پہلی کتاب ہے جس نے عورت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور صرف تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ اس پر اتنا زور دیا ہے کہ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ نئے علوم کا ایک دروازہ کھل گیا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان عورتوں کو خصوصاً اللہ تعالیٰ کا بہت شکر گزار ہونا چاہئے اور اس کے عطا کردہ حقوق اور مقام کو شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ دعا اور عبادت کے ذریعہ نیز معروف طریق پر حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مغربی اقوام اکثر اسلام پر قرآن کریم میں عورتوں کے حقوق اور پابندیوں کو لیکر اعتراض کرتے ہیں مگر یہ قرآن کریم پر غور و فکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے وگرنہ قرآن کریم کے عورتوں پر اس قدر احسانات ہیں کہ جسکا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے اور اسکے بدلے خدا تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کریں وہ کم ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ سے عورتوں کو وراثتی۔ تعلیمی۔ اخلاقی۔ روحانی۔ سماجی اور تمدّنی اور سیاسی غرض یہ کہ ہر شعبہ اور میدان میں مردوں کے برابر حقوق عطا فرمائے ہیں۔

اس کے مقابل جب ہم دوسرے مذاہب یعنی کی کتب پر غور کرتے ہیں تو ان میں عورتوں کو مردوں کی ملکیت اور متاع بیان کیا گیا ہے۔ آیئے اب ہم قدیم مذاہب اور تہذیبوں میں عورت کے مقام و مرتبہ اور حقوق کے بارے میں کچھ بات کرتے ہیں اور ان کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے ہیں کہ آیا کس کی تعلیمات افضل ہیں اور کن تعلیمات نے عورت کو اسکے جائز حقوق احسن طور پر دلوائے ہیں۔

قدیم مذاہب میں عورتوں کے حقوق اور اسلامی تعلیمات کے امتیازات

ہندو دھرم اور حقوق نسواں

ہندو مذہب کی مقدس کتب میں بھی عورتوں کے حقوق معین نہیں ہیں بلکہ مردوں کو عورتوں کا خدا قرار دیا گیا ہے۔ ہاں بعض کتب میں عورتوں کی خوبیاں اور ان سے نیک سلوک کرنے کی عمومی نصیحت پائی جاتی ہے۔ عورتوں کے لئے ہندو دھرم شاستروں میں کوئی حق معین و محفوظ نہیں ہے صرف انکی چند خوبیاں اور خامیاں بیان کی گئی ہیں۔ ہندو دھرم میں عورت کو بدی کی جڑ کہا گیا ہے اور اسے نہایت حقیر و ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں لڑکی کے لئے لفظ ''دوھتر'' (دور کردی گئی) اور بیوی کے لئے ''پتنی'' (کنیز) کے الفاظ اور ''ستی'' ہونے کی رسم اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔

(دیکھئے منوسمرتی، ۵:۵، ۱۴، ۹:۱۷ وغیرہ)

ترجمہ: گھر کو روشن کرنے والی۔ نیک اعمال بجالانے والی نیک بخت عورتیں عزت کے قابل ہیں کیونکہ وہ گھر کی لکشمی کہی گئی ہیں۔ اسلئے ان کی خصوصی حفاظت کریں۔

ترجمہ: جہاں عورتوں کی عزت اور ان کا احترام کیا جاتا ہے وہاں فرشتے نازل ہوتے ہیں اور جہاں ان کی تذلیل، ہتک اور حقارت ہوتی ہے وہاں تمام کام بے برکت اور خیر سے خالی ہوتے ہیں۔

ہندو مذہب میں عورت کی سماجی حیثیت کا اندازہ منوسمرتی اور چانکیہ کے اقوال اور ان کے وضع کردہ قوانین اور ان پر مبنی رسم ورواج سے لگایا جاسکتا ہے کہ عورت کو کسی بھی طرح کی ذمہ داری سنبھالنے کے معاملہ میں قطعی طور پر نا اہل قرار دیا گیا۔ اس کی گواہی کو نا قابل اعتبار ٹھہرایا گیا اور اس کو جھوٹ کی پوٹ سمجھا گیا۔ مہابھارت کے شانتی پَرو میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ:۔

''راجہ جہاں صلاح ومشورہ کر رہا ہو وہاں بونوں۔ کُبڑوں۔ لنگڑوں۔ اندھوں۔ احمقوں زنخوں اور عورتوں کو پھٹکنے کی اجازت نہ دی جائے۔''

(انڈین وویمن مرتبہ دیوکی جین صفحہ 48-47)

اسی طرح ہندو مذہب میں عورت کو مرد کے تابع فرمان اور نہایت ذلیل درجہ دیا گیا ہے چنانچہ منوسمرتی میں لکھا ہے کہ:۔

''لڑکی ہو یا جوان یا بوڑھی عورت اسے آزادانہ طور پر گھر کا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے عورت بچپن میں باپ کی، جوانی میں خاوند اور خاوند کی وفات کے بعد اپنے بیٹوں کے ماتحت رہے کبھی

آزاد ہوکر نہ رہے۔‘‘

(منوسمرتی باب ۵ منتر ۱۴۸)

اسی طرح ہندو مذہب میں عورتوں کے لئے الگ سے مذہبی رسوم وعبادات کوئی ضروری قرار نہیں دی گئیں۔منوسمرتی کا فرمان ہے:۔

’’عورتوں کے لئے الگ یگیہ ہے نہ روزہ بلکہ خاوند کی سیوا ہی اس کی عبادت ہے۔‘‘

(منوسمرتی باب ۵ منتر ۱۵۶)

یونانی تہذیب میں عورت کا مقام وحقوق

ترقی وتمدن کے گہوارے یونان میں عورت کو شیطان سے مشابہ قرار دیا گیا اور اہل یونان نے عورت کی ناقدری بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔شوہر کو بیوی پر مکمل اختیار ہوتا تھا۔وہ جب چاہتا عورت کو گھر سے نکال سکتا تھا۔بحیثیت مجموعی باعصمت یونانی عورت کا مرتبہ نہایت پست تھا اس کی زندگی غلامی میں بسر ہوتی تھی۔طلاق کا حق قانوناً اسے ضرور حاصل تھا تاہم وہ عملاً اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائی سکتی تھی۔اگر افلاطون نے عورت کی آزادی اور مساوات کا دعویٰ کیا بھی تو یہ محض زبانی تعلیم تھی اور عملی طور پر عورت کی حالت کو بہتر بنانے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔یونان میں یہ تمثیل عام تھی کہ سانپ کے ڈسنے کا علاج تو ممکن ہے مگر عورت کے شر کا مداوا نہیں ہوسکتا۔سقراط کا قول ہے کہ عورت سے زیادہ فتنہ فساد کی چیز اور کوئی دنیا میں نہیں ہے۔یوحنا کہتا ہے کہ عورت شر کی بیٹی ہے اور امن وسلامتی کی دشمن۔نیز بوزنطی مملکت میں عورت کے قانونی حقوق کچھ نہ تھے۔یونان میں عورتوں کو سب برائیوں کی جڑ قرار دیا گیا۔روم میں جہاں سب سے پہلے جمہوریت کا قیام عمل میں آیا عورت کو قدرے آزادی ضرور ملی مگر انسانی اور قانونی حقوق سے وہ بدستور محروم رہی۔(روم کے مختلف ادوار میں عورت کی سماجی ومعاشرتی حیثیت کے لیے دیکھیے Encyclopedia Britannica: جلد ۱۹، بذیل rome، نیز لیکی: تاریخ اخلاق یورپ صفحہ

۳۵،۴۴ تا ۴۵،۸۱ تا ۸۳،۲۸۹،۲۹۱،۲۹۳،۳۰۱ تا ۳۰۵ وغیرہ: نیز The life of Greece:by Will Durant صفحہ ۵۶۵ تا ۵۶۸)

بابل وایران کی حالت روم و یونان سے چنداں مختلف نہ تھی عورت کو یہاں بھی نہایت بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا بعض دوسرے مذاہب میں بھی صورتحال بہتر نہ تھی۔

عیسائیت میں عورت کا مقام اور حقوق

اسی طرح عیسائی مذہب جو کہ آج حقوق نسواں کا علمبردار بنا ہوا ہے، عورتوں کے بارے میں اسکی تعلیمات بھی ایسی اعلیٰ نہیں ہیں جو اسلام کا مقابلہ کرسکیں۔ بائبل میں عورت کی ابتدائی تخلیق کے بارے میں لکھا ہے:-

''لیکن آدم کے لئے اُس کی مانند کوئی مددگار نہ ملا تب خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور جب وہ سورہا تھا تو اُس نے اُس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکال لی اور اُس جگہ گوشت بھر دیا تب خداوند خدا نے اُس پسلی سے جسے اُس نے آدم میں سے نکالا تھا ایک عورت بنائی اور وہ اُسے آدم کے پاس لے آیا۔ آدم نے کہا اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔ اسلئے وہ ''ناری'' کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی تھی ۔۔۔۔۔۔ اسلئے مرد اپنے باپ اور ماں کو چھوڑ کر اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔''

(پیدائش باب ۲ آیات ۲۱ تا ۲۵)

قرآن کریم میں حضرت آدمؑ کے ذکر کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کے جوڑے کا بھی ذکر کیا ہے جس سے آگے سلسلہ مخلوقات چلا۔ چنانچہ فرمایا:۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۲﴾

(سورۃ النساء آیت:2)

یعنی اے لوگو! اپنے ربّ کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اُس کی جنس سے

ہی اسکا جوڑا پیدا کیا۔ اوران دونوں میں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کر کے دنیا میں پھیلائے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم آپس میں سوال کرتے ہو اور خصوصاً رشتہ داریوں میں یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام زمانہ سلطان القلم، سیدنا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانیؑ تحریر فرماتے ہیں:۔

''وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا یعنی آدم کے وجود میں سے ہی ہم نے اس کا جوڑا پیدا کیا جو حوّا ہے تا آدمؑ کا یہ تعلق حوا اور اس کی اولاد سے طبعی ہو نہ بناوٹی۔ اور یہ اسلئے کیا کہ تا آدم زادوں کے تعلق اور ہمدردی کو بقا ہو کیونکہ طبعی تعلق غیر منفک ہوتے ہیں مگر غیر طبعی تعلق کے لئے بقا نہیں ہے کیونکہ ان میں وہ باہمی کشش نہیں ہے جو طبعی میں ہوتی ہے۔ غرض خدا نے اس طرح پر دونوں قسم کے تعلق جو آدمؑ کے لیے خدا سے اور بنی نوع انسان سے ہونے چاہئے تھے طبعی طور پر پیدا کیے ہیں۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱۷۹)

اسی طرح سیدنا حضرت مصلح موعودؓ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ اُس نے سب انسانوں کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا ہے یعنی مرد اور عورت دونوں ایک جنس سے ہیں۔ دونوں ایک ہی قسم کا دماغ لے کر آئے ہیں۔ ایک ہی قسم کے احساسات لے کر آئے ہیں اور ایک ہی قسم کے جذبات لے کر آئے ہیں۔ دیکھو پہلے فقرہ میں ہی عورت کے حقوق پر کتنا زور دیا گیا ہے اور کس طرح بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ عورت میں دماغ نہیں اور تم جس طرح چاہو اس پر حکومت کر سکتے ہو یا جس طرح چاہو اس سے سلوک کر سکتے ہو۔ عورت بھی تمہاری طرح جذبات اور احساسات رکھتی ہے اور وہ بھی تمہاری طرح دماغ رکھتی ہے ۔اسلئے اُسے اپنے جیسا سمجھو۔ ادنیٰ اور ذلیل قرار نہ دو۔''

(تفسیر کبیر جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۱)

عیسائی اپنے آپ کو حقوقِ نسواں کا سب سے بڑا حامی مانتے ہیں لیکن اُنکے پاک نوشتوں میں عورت کی نسبت لکھا ہے:۔

’’البتہ مرد کو اپنا سر ڈھانکنا نہ چاہئے کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اُس کا جلال ہے مگر عورت مرد کا جلال ہے۔‘‘

(کرنتھیوں باب ۱۱ آیت ۷)

اسلام نے جہاں وراثت میں مرد اور عورت دونوں کو حصہ دار قرار دیا ہے وہیں اس بارے میں عیسائیت کی تعلیم ہے کہ:۔

’’اور بنی اسرائیل سے کہہ کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کا کوئی بیٹا نہ ہو تو اس کی میراث اس کی بیٹی کو دینا۔ اگر اس کی کوئی بیٹی بھی نہ ہو تو اس کے بھائیوں کو اس کی میراث دینا۔ اگر اس کے بھائی بھی نہ ہوں تو تم اس کی میراث اس کے باپ کے بھائیوں کو دینا۔ اگر اس کے باپ کا بھی کوئی بھائی نہ ہو تو جو شخص اس کے گھرانے میں اس کا سب سے قریبی رشتہ دار ہو اسے اس کی میراث دینا۔ وہ اس کا وارث ہوگا اور یہ حکم بنی اسرائیل کے لئے جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا واجبی فرض ہوگا۔‘‘

(گنتی باب 27 آیت 8-11)

بائبل کے اس حکم کے مطابق بیٹیوں کو صرف اس صورت میں حصہ مل سکتا ہے کہ بیٹا نہ ہو۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ پابندی ہے کہ بیٹیاں جن کو اپنے باپ کا ورثہ بیٹے کی عدم موجودگی کی وجہ سے مل رہا ہے، صرف اپنے قبیلہ میں ہی شادی کریں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے کسی اور قبیلہ کے مرد سے ان کو شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ تاکہ ایک قبیلہ کی جائیداد دوسرے میں نہ چلی جائے۔ یہ حکم گنتی باب 36 آیت 1-8 میں بتصریح موجود ہے۔

قارئین! آیئے اب ہم اسلام اور عیسائی مذاہب کی تعلیمات کے مابین ایک موازنہ کر کے دیکھتے ہیں کہ آخر کون سا مذہب ہے جس نے عورتوں کو ان کے واجب حقوق دلوائے اور معاشرہ

میں انہیں عزت کا مقام دلوایا۔عیسائی مذہب کی تعلیمات کے ساتھ موازنہ اسلئے بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے ماننے والے ہی اسلام پر آج کل سب سے زیادہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام عورت کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔(الف سے مراد اسلام اور ع سے عیسائیت ہے)

ا	اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔(النساء:۲۰)
ع	عورتیں کلیسا کی مجلس میں نہ بولیں۔(کرنتھیوں ۱۴/۳۴)
ا	اللہ نے تمہیں (مرد وعورت کو) ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے۔(النساء:۲)
ع	مرد عورت کیلئے نہیں بلکہ عورت مرد کیلئے پیدا ہوئی۔(کرنتھیوں ۱۱/۹)
ا	وہ تمہارے لئے ایک لباس ہیں اور تم ان کے لئے ایک لباس ہو۔(البقرۃ:۱۸۸)
ع	عورتیں سر نہ گوندھیں، سنگار نہ کریں، اچھے اور قیمتی کپڑے نہ پہنیں۔(پطرس ۳/۳)
ا	اور تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔(بخاری)
ع	مرد کے لئے اچھا ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے۔(کرنتھیوں ۱/۷۔۸/۷)
ا	علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔(مشکوٰۃ، ۱:۱، ۷۶)
ع	عورت اپنے مرد ہی سے پڑھے۔(کرنتھیوں ۱۴/۳۵)
ا	تم میں سے بہترین وہ ہے جو خود قرآن سیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے(بخاری) (اس حکم میں عورتیں بھی شامل ہیں)
ع	اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے۔(تمطاؤس ۲/۱۲)
ا	تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اھل خانہ کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا ہے۔ (ابن ماجہ)
ع	عورتیں لمبے بال رکھیں۔بال نہ کٹوائیں۔(کرنتھیوں ۵-۱۶۔۱۱/۱۴)

بائبل میں عورت کی حیثیت اور اس کی حق تلفی

اہل مغرب کی طرف سے عورت کے مقام کے بارہ میں اسلامی تعلیم پر اکثر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں۔ بائبل میں جارحانہ حملوں کے بعد مغلوب اقوام سے ظالمانہ سلوک کا ذکر عام ملتا ہے۔ اسی طرح نئے عہد نامے میں بھی عورتوں کے حقوق کے متعلق کوئی خاص تعلیم نہیں دی گئی ہے جبکہ حضرت مسیح ناصری کے زمانہ میں عورت بہت مظلوم اور بالعموم اپنے بنیادی حقوق سے محروم تھی۔ بائبل نے عورت کو جو حیثیت دی ہے اسکا تفصیلی ذکر مع مکمل حوالہ جات پیش خدمت ہے۔

1	عورت کے ایک گناہ کے نتیجہ میں ساری انسانیت کو گنہگار سمجھا جاتا ہے اور کفارہ کی ضرورت پیش کی جاتی ہے۔ عورت نے جو گناہ کیا اس کا ذکر بائبل میں ہے۔ پیدائش باب 3 آیت:19-1
2	ابرام نے اپنی جان بچانے کے لئے اپنی بیوی کو بہن قرار دیا اور بیوی کی عصمت کو خطرہ میں ڈال دیا۔ (نعوذ باللہ)۔ پیدائش باب 12 آیت 20-10
3	حضرت سارہ پر جھوٹ بولنے کا الزام۔ پیدائش باب 18 آیت:15-13
4	حضرت لوطؑ پر الزام کہ انہوں نے اپنی کنواری بیٹیاں لوگوں کے سامنے بدکاری کے لئے پیش کر دیں۔ (نعوذ باللہ)۔ پیدائش باب 19 آیت:8-4
5	حضرت لوطؑ کی دو بیٹیوں پر اپنے باپ کو شراب پلا کر بدکاری کرنے کا الزام۔ پیدائش باب 19 آیت:38-30
6	ابرام نے حضرت ہاجرہ کی سوتن کے حکم پر ہاجرہ اور اپنے بیٹے کو روٹی اور پانی کی ایک مشک کے ساتھ ویران جنگل میں چھوڑ دیا۔ پیدائش باب 21 آیت:9-18
7	اصحاق نے اپنی جان بچانے کے لئے اپنی بیوی کو بہن بتایا۔ پیدائش باب 26 آیت:6-11
8	یعقوب کی بیوی راخل جو بنی اسرائیل کی ماں کا مقام رکھتی ہے لابن کے بُت چرا کے لے گئی۔ پیدائش باب 31 آیت:33-35

9	یہوداہ نے اپنی بیوہ بہو کے بارہ میں سُن کر کہ وہ حاملہ ہے کہا کہ اسے باہر نکال لاؤ تاکہ وہ جلائی جائے۔ پیدائش باب38 آیت:24
10	سبت کے دن کام کی ممانعت باپ، بیٹا، بیٹی، غلام، لونڈی، چوپایہ سب کے لئے ہے مگر بیوی کے لئے کام کی ممانعت کا کوئی ذکر نہیں۔ خروج باب20 آیت:8-11
11	عبرانی غلام چھ برس کی خدمت کے بعد ساتویں برس آزاد ہوکر چلا جائے لیکن اگر غلام کے آقا نے اس کی شادی کروائی ہو تو غلام اکیلا چلا جائے اور عورت اپنے آقا کے پاس رہے۔ خروج باب21 یت:2-5
12	باپ اپنی بیٹی کو لونڈی ہونے کے لئے بیچ سکتا ہے۔ خروج باب21 ت:7,8
13	کنواری سے مباشرت کرنے والا شخص لازماً اس سے شادی کرے۔ (گویا رشتہ نہ ملنے کی صرت میں یہ نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔) خروج باب22 ت:16,17
14	تو جادوگرنی کو جینے نہ دینا۔ خروج باب22 آیت:18
15	زچگی کے بعد عورت کی طہارت کے قواعد میں لڑکے کی صورت میں عدم پاکیزگی کے دن لڑکی کی پیدائش سے نصف ہیں۔ احبار باب12 آیت:1-5
16	حیض کے ایام میں عورت کو چھونے والا بھی اور اس کے بستر کو چھونے والا ناپاک ہوجاتا ہے اور جس چیز پر وہ عورت بیٹھے یا سوئے وہ بھی ناپاک ہوجائے گی۔ احبار باب15 آیت:24,25
17	کاہن کی بیٹی کو فحشاء کی صورت میں آگ میں جلایا جائے۔ احبار باب21 آیت:9
18	تمہاری لونڈیاں ان قوموں میں سے ہوں جو تمہارے گرد رہتی ہیں احبار باب25 آیت44
19	اگر کسی کو اپنی بیوی پر غیرت آنے لگے حالانکہ وہ بالکل معصوم ہو تو کاہن اس کو لعنت لانے والا کڑوا پانی پلائے اگر وہ عورت معصوم ہوگی تو اس پانی کے برے نتائج سے بچ جائے گی۔ گنتی باب5 آیت:11-28
20	ہارون اور اسکی بہن مریم دونوں نے موسیٰ کی بدگوئی کی لیکن سزا صرف عورت کو ملی اور وہ کوڑھ سے برف کی طرح سفید ہوگئی۔ ہارون کو جو مرد تھا کوئی سزا نہیں ملی۔ گنتی باب12 آیت:1-16

21	بیٹی کو ورثہ اسکے باپ کا صرف اس صورت میں ملے گا کہ مرنے والے کا کوئی بیٹا نہ ہو۔ گنتی باب 27 آیت:8
22	اگر مرد خداوند کی منت مانے یا قسم کھا کر اپنے اوپر کوئی فرض ٹھہرائے تو اس کو پورا کرنا لازمی ہے اگر عورت ایسا کرے تو باپ یا خداوند کی منظوری ضروری ہے۔ گنتی باب 30 آیت:2-15
23	جارحانہ حملوں کے بعد عورتوں اور بچوں کو اسیر کرنا۔ گنتی باب 31 آیت:9
24	جارحانہ حملوں کے بعد شادی شدہ عورتوں کا قتل عام اور کنواری لڑکیوں کو اپنے لئے بچا کر رکھنے کی تلقین۔ چنانچہ 32 ہزار مرد سے ناواقف اور اچھوتی لڑکیاں بنی اسرائیل کے قبضہ میں آئیں۔ گنتی باب 31 آیت:17،18
25	جنگ کے بعد دشمنوں کی کوئی عورت اگر پسند آجائے تو اس سے شادی کرلو اور چاہے تو اسے اپنے گھر لے آؤ۔ استثناء باب 21 آیت:10
26	اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ اور دوسری غیر محبوبہ اور پہلوٹھا لڑکا غیر محبوبہ سے ہو تو پہلوٹھا جو غیر محبوبہ سے ہے دگنے مال کا وارث ہو۔ استثناء باب 21 آیت:15
27	اگر کوئی مرد کسی عورت کو بیاہے اور اسکے پاس جائے اور بعد اسکے اس سے نفرت کرکے شرمناک باتیں اسکے حق میں کہے اور اسے بدنام کرنے کیلئے یہ دعویٰ کرے کہ میں نے اس عورت سے بیاہ کیا اور جب میں اسکے پاس گیا تو میں نے کنوارے پن کے نشان اس میں نہیں پائے۔ تب اس لڑکی کا باپ اور اسکی ماں اس لڑکی کے کنوارے پن کے نشانوں کو اس شہر کے پھاٹک پر بزرگوں کے پاس لے جائے۔۔۔ تب شہر کے بزرگ اس شخص کو پکڑ کر اسے کوڑے لگائیں اور اس سے چاندی کی سو مثقال جرمانہ لے کر لڑکی کے باپ کو دیں اور وہ اسکی بیوی بنی رہے اور وہ زندگی بھر اس کو طلاق نہ دینے پائے۔ پر اگر یہ بات سچ ہو کہ لڑکی میں کنوارے پن کے نشان نہیں پائے گئے تو وہ اس لڑکی کو اس کے باپ کے گھر کے دروازہ پر نکال لائیں اور اس کے شہر کے لوگ اسے سنگسار کریں کہ وہ مرجائے۔ استثناء باب 22 آیت:13-21

28	اگر کسی آدمی کو کنواری لڑکی مل جائے اور وہ اسے پکڑ کر صحبت کرے تو وہ مرد لڑکی کے باپ کو چاندی کی پچاس مثقال دے اور وہ لڑکی اس کی بیوی بنے اور وہ اسے زندگی بھر طلاق نہ دینے پائے۔ استثناء باب 22 آیت:28-29
29	اگر کئی بھائی مل کر رہتے ہوں اور ایک ان میں سے بے اولاد مر جائے تو اسکے شوہر کا بھائی اس عورت کے پاس جا کر اسے اپنی بیوی بنالے۔ اگر بھائی ایسا نہ کرے تو اسکی بھاوج پھاٹک پر جا کر بزرگوں کے پاس شکایت کرے۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو اسکی بھاوج بزرگوں کے سامنے اسکے پاس جا کر اسکی جوتی اتارے اور اسکے منہ پر تھوک دے اور کہے جو اپنے بھائی کا گھر آباد نہ کرے اس سے ایسا ہی کیا جائے گا۔ استثناء باب 25 آیت:5-10
30	جب دو شخص آپس میں لڑتے ہوں اور ایک کی بیوی پاس جا کر اپنے شوہر کو اس آدمی کے ہاتھ سے چھڑانے کے لئے جو اسے مارتا ہو ہاتھ بڑھائے اور اس کی شرمگاہ کو پکڑ لے تو تُو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنا ذرا ترس نہ کھانا۔ استثناء باب 25 آیت:11-12
31	باپ کا اپنی بیٹی کو سوختنی قربانی کے طور پر گذراننا۔ قضاۃ باب 11 آیت:31-39
32	اور ان کو یبیس خلفاء کے باشندوں میں چار سو کنواری عورتیں ملیں جو مرد سے ناواقف اور اچھوتی تھیں وہ ان کو ملک کنعان میں سیلا کی لشکر گاہ میں لے آئے۔ قضاۃ باب 21 آیت:12
33	خداوند کی عید میں بنی بنیمین کو حکم دیا کہ اگر سیلا کی لڑکیاں ناچنے نکلیں تو تم تاکستانوں میں سے نکل کر ایک ایک بیوی اپنے لئے پکڑ لینا او بنیامین کے ملک کو چل دینا۔ قضاۃ باب 21 آیت 19-24
34	حضرت داوٗدؑ نے اپنے جرنیل اور یاہ کی بیوی سے نعوذ باللہ زنا کیا اور اور یاہ کو جنگ میں مروانے کا انتظام کیا۔ 2 سموئیل باب 11
35	اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتّی عورتوں سے محبت کرنے لگا نعوذ باللہ۔ اور اس کے پاس سات سو شاہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔ 1 سلاطین باب 11 آیت:1-3

36	جلاوطنی کے قریب سوسال کے عرصہ میں جن یہود نے غیر یہود لڑکیوں سے شادی کر لی تھی اور بعض کی اولاد بھی تھی ان کی عورتوں کو ان یہود سے جلاوطنی کے اختتام پر الگ کر دیا گیا۔ عزرا باب 10 آیت :11-44
37	بعض یہودیوں نے اپنی غیر اسرائیلی بیویوں سے جھگڑ کر ان کو لعنت کی اور بعض کو مارا اور ان کے بال نوچ ڈالے اور ان کو خدا کی قسم کھلائی کہ تم اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو نہ دینا اور نہ اپنے بیٹوں کے لئے اور نہ اپنے لئے ان کی بیٹیاں لینا۔ نحمیاہ باب 13 آیت :23-25
38	ایک بے حیاء عورت کے شرمناک قصے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ امثال باب 7 آیت :6-20
39	احمق بیٹا اپنے باپ کے لئے بلا ہے اور بیوی کا جھگڑا رگڑا سدا کا ٹپکا۔ امثال باب 19 آیت :13
40	خداوند فرماتا ہے۔ اے اسرائیل کے گھرانے! جس طرح بیوی بے وفائی سے اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اسی طرح تو نے مجھ سے بیوفائی کی ہے۔ یرمیاہ باب 3 آیت :20
41	شاہ یروشلم داؤد کے بیٹے واعظ کی باتیں۔ میں نے بڑے بڑے کام کئے میں نے اپنے لئے عمارتیں بنائیں اور میں نے اپنے لئے تاکستان لگائے میں نے اپنے لئے باغیچے اور باغ تیار کئے۔۔۔۔۔۔ میں نے گانے والوں اور گانے والیوں کو رکھا اور بنی آدم کے اسباب عیش یعنی لونڈیوں کو اپنے لئے کثرت سے فراہم کیا۔ واعظ باب 2 آیت :4-8
42	خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا اور اس نے فرمایا تو بیوی نہ کرنا اس جگہ تیرے ہاں بیٹے بیٹیاں نہ ہوں کیونکہ خداوند اس بیٹوں بیٹیوں کی بابت جو اس جگہ پیدا ہوئے ہیں اور ان کی ماؤں کی بابت جنہوں نے ان کو ولادت دی اور ان کے باپوں کی بابت جن سے وہ پیدا ہوئے یوں فرماتا ہے کہ وہ بُری موت مریں گے۔ یرمیاہ باب 16 آیت :1-4
43	جب خداوند نے شروع میں ہوسیع کی معرفت کلام کیا تو اسکو فرمایا کہ جا ایک بدکار بیوی اور بدکار کی اولاد اپنے لئے لے کیونکہ ملک نے خداوند کو چھوڑ کر بڑی بدکاری کی ہے ہوسیع باب 1 آیت 2

44	خداوند نے مجھے فرمایا جااس عورت سے جواپنے یار کی پیاری اور بدکار ہے محبت رکھ جس طرح کہ خداوند بنی اسرائیل سے جوغیر معبودوں پر نگاہ کرتے ہیں اور کشمش کے کلچے چاہتے ہیں محبت رکھتا ہے۔ ہوسیع باب 3 آیت:1
45	یوحنا کی انجیل میں ایک واقع لکھا ہے جوانجیل کی اخلاقی تعلیم کومنفی رنگ میں پیش کرتا ہے: پھر تیسرے دن قاناۓ گلیل میں ایک شادی ہوئی اویسوع کی ماں وہاں تھی اور یسوع اوراسکے شاگردوں کی بھی اس شادی میں دعوت تھی اور جب مے ختم ہوچکی تویسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ انکے پاس مے نہیں رہی۔ یسوع نے اس سے کہا اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ یوحنا باب 2 آیت:1-4
46	عورتیں کلیسیا کے مجمع میں خاموش رہیں کیونکہ انہیں بولنے کا حکم نہیں بلکہ تابع رہیں جیسا توریت میں بھی لکھا ہے۔ اوراگر کچھ سیکھنا چاہیں تو گھر میں اپنے اپنے شوہر سے پوچھیں کیونکہ عورت کا کلیسیا کے مجمع میں بولنا شرم کی بات ہے۔ 1 کرنتھیوں باب 14 آیت:3-35
47	البتہ مرد کواپنا سرڈھانکنا نہ چاہئے کیونکہ وہ خدا کی صورت اوراس کا جلال ہے مگر عورت مرد کا جلال ہے۔ اس لئے کہ مرد عورت سے نہیں بلکہ عورت مرد سے ہے۔ اور مرد عورت کے لئے نہیں بلکہ عورت مرد کے لئے پیدا ہوئی۔ 1 کرنتھیوں باب 11 آیت:1-18
48	جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھواس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اوراس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہے میرے بھائی؟ اوراپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔ کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور میری بہن اور ماں ہے۔ متی باب 12 آیت:46-50

یہ ہیں وہ حقوق اوراختیارات جو بائبل نے عورت کودئے ہیں اورانہی آیات سے یہودیوں

اور عیسائیوں کے نزدیک عورت کا مقام ومرتبہ بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ نہایت ہی شرمناک رویہ ہے کہ وہ لوگ جن کی مذہبی کتب میں اس قسم کی تعلیم ہے، اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے عورت کے حقوق نہیں دیئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پوری بائبل پڑھ کر دیکھ لیں۔ نہ تو عہد نامہ قدیم اور نہ جدید، کوئی بھی عورت کے مقام اور ان سے حسن معاشرت کے بارے میں مفید سبق نہیں دیتا۔ بلکہ متعدد مقامات پر تو عورتوں کے جارحانہ قتل کے قصّے بلاتنقید بیان کئے گئے ہیں۔ ان مقامات کو بیان کرنا مضمون کو تویل کرنے کا موجب ہوگا اسلئے خاکسار صرف ان آیات کے حوالوں پر اکتفاء کرتا ہے تا کہ قارئین ان پر بھی نظر کر کے جان سکیں کہ فساد اور قتل وغارت کو کون بڑھاوا دیتا ہے۔

عورتوں کا قتل عام

(گنتی باب 25 آیت: 8-7)
(گنتی باب 31 آیت: 17و35)
(استثناء باب 7 آیت: 16)
(1 سموئیل باب 27 آیت: 9و11)
(قضاۃ باب 21 آیت: 11-10)
(یشوع باب 8 آیت: 25)
(1 سموئیل باب 15 آیت: 3-1)
(استثناء باب 2 آیت: 34)
(استثناء باب 3 آیت: 6)
(استثناء باب 20 آیت: 14-13)
(1 سموئیل باب 22 آیت: 19)
(یشوع باب 6 آیت: 21)
(استثناء باب 20 آیت: 16)

الغرض اسلام سے قبل عورتوں کی تحقیر اور ان کے حقوق کی پامالی اور ان پر ہونے والے مظالم کی تاریخ اتنی بھیانک اور خوفناک ہے کہ زبان ان کے ذکر سے اور کان ان کے سننے سے اور

ہاتھ انہیں تحریر کرنے سے اور دل ان کے احساس سے لرز اُٹھتے ہیں۔

قارئین ،اسلام میں مرد و عورت میں مساوات اس لحاظ سے بھی قائم ہے کہ جائداد اور دیگر دنیاوی حقوق کے ساتھ ساتھ روحانیت میں بھی عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق حاصل ہیں اسلام میں عورتوں کو جہاد میں مردوں کے ساتھ شامل ہونے کی بھی اجازت دی گئی ہے اور اسی طرح دیگر عبادات میں حصہ لینے کا حق بھی دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں مردوں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ عورتوں سے انکا یہ حق نہ چھینیں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ بعض لوگ عورتوں کو مسجد میں آکر نماز باجماعت پڑھنے سے روکتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کی لونڈیوں کو اللہ کے گھروں میں آنے سے مت روکو۔

(ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ)

بعض مخالفین اور خصوصاً آج کل اہل یورپ اسلام پر یہ اعتراض لگاتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو پردہ کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے ان کو ترقی کے مواقع نصیب نہیں ہوتے یا انکی آزادی غصب ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ لیکن حقیقت میں پردہ عورتوں کی عصمت اور پاکدامنی اور زینت کی حفاظت کی غرض سے ہے نہ کہ ان پر ناجائز ظلم۔ مغربی معاشرہ شیطان کے زیر اثر آکر یہ اعتراضات لگاتا ہے اور آج کسی شخص سے انکی اخلاقی حالت چھپی ہوئی نہیں۔ اگر اسی کا نام ترقی ہے تو یہ ترقی ان کو ہی مبارک۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اَلنَّظْرُ سَھْمٌ مِّنْ سِھَامِ اِبْلِیْس یعنی مرد اور عورتوں کی نظر بازی ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے جو نظر بازی کے موقع پر شیطان مرد اور عورت دونوں کے دلوں میں پیوست کرتا ہے اور جو بدی کے زہر سے آلودہ ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض اسلام پر یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو مرد کی نسبت نصف حصہ دے کر اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن اصل میں یہ حکم پر از حکمت ہے۔ عورت کو مرد کی نسبت نصف حصہ دینے میں کیا راز ہے؟ اس بارے میں امام الزمان سیدنا حضرت مسیح موعود و

مہدی معہودؑ کا ارشاد ہے کہ:

''قرآن شریف نے مرد سے عورت کا حصہ نصف رکھا ہے اس میں بھید یہ ہے کہ نصف اس کو والدین کے ترکہ میں سے مل جاتا ہے اور باقی نصف وہ سسرال میں سے جا لیتی ہے۔ اور پھر اس کے نان ونفقہ لباس و پوشاک کا ذمہ وار بھی اس کا خاوند ہوتا ہے۔ اس طرح سے عورت مرد سے بڑھ جاتی ہے۔''

(الحکم ۲۶ مارچ/۱۹۰۸ء)

اسلام سے قبل یہ رواج عام تھا کہ والدین جہاں چاہتے لڑکی کی شادی کر دیتے تھے۔ اسکی مرضی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا اور عورت کو ان کی بات ماننی پڑتی تھی۔ لیکن اسلام نے سختی کے ساتھ تاکید کی کہ عورت کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں ہوسکتی اور یہاں تک کہا کہ اگر عورت کی مرضی کے بغیر اس کی شادی ہو تو وہ باطل ہے۔ کتنا بڑا حق ہے جو قرآن کریم نے عورتوں کو دیا ہے۔

پھر قرآن کریم نے بچے کا دودھ چھڑانا بھی عورت کی مرضی پر رکھا ہے اور اسے ایسی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اُسکی مثال اور کسی مذہب کی کتاب میں نہیں ملتی۔ پھر اسلام نے عورت کو الگ گھر کا حق دیا ہے۔ اُسکا مہر مقرر کیا ہے اور کہا ہے کہ عورت اپنی جائیداد کی آپ وارث ہے یورپ جو اپنے آپ کو حقوق نسواں کا سب سے بڑا حامی کہتا ہے، اُس نے بھی یہ حق عورت کا آج سے ساٹھ ستر سال قبل ہی تسلیم کیا ہے ورنہ وہاں پر بھی اس سے پہلے عورت کی جائیداد اسکی اپنی جائیداد تسلیم نہیں کی جاتی تھی بلکہ اُسے بیچنے کا حق بھی شوہر ہی کو حاصل تھا۔

لیکن اسلام نے عورت کی جائیداد کو اُس کی ذاتی ملکیت قرار دیا ہے اور اس پر اتنا زور دیا ہے کہ صحابہؓ کو شبہ پڑ گیا کہ کیا مرد کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ عورت کی جائیداد میں سے کچھ اُس کی مرضی سے ہی لے لے چنانچہ اس کے لئے اسلام نے علیحدہ حکم دیا اور بتایا کہ تم عورت کا خوشی سے دیا ہوُا تحفہ استعمال کر سکتے ہو۔

آج کل مغربی دنیا میں عورت کی حفاظت اور اس سے حسن سلوک کا بڑا شور مچا ہوا ہے اور اسکے لئے مختلف تحریکات زور شور سے اس کام کا پرچار کر رہی ہیں۔ اور ان کی زبان پر ایسے محاورے بھی رائج پاگئے ہیں جو عورتوں کے حقوق کے بارہ میں ہیں جیسے:۔

Ladies first اور Glass with care

لیکن اگر اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ الفاظ تو ہمارے پیارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے ۱۴۰۰ سال قبل عورت کے حق میں استعمال فرمائے تھے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب ایک دفعہ آپؐ اپنی زوجہ مطہرہ حضرت صفیہؓ کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے کہ اچانک اونٹ کا پاؤں پھسلا اور آپ دونوں گر پڑے۔ حضرت ابوطلحہؓ فوراً حضورؐ کی طرف بڑھے آپؐ نے فرمایا:۔

عَلَيْكَ بِالْمَرْاَةِ. اَلْمَرْاَةُ اَلْمَرْاَةُ

کہ پہلے عورت کا خیال کرو یعنی **Ladies first**

پھر ایک دفعہ کچھ ازواج مطہرات آنحضورؐ کے ساتھ سفر میں ہمراہ تھیں۔ ایک حبشی غلام انجش نامی حُدّی پڑھنے لگا۔ جس کی وجہ سے اونٹ تیز چلنے لگے اور خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ازواج مطہرات میں سے جو اونٹوں پہ سوار تھیں گر نہ جائیں۔ اس موقعہ پر آپؐ نے فرمایا:۔

رُوَيْدَكَ سَوْقاً بِالْقَوَارِيْرِ

(مسلم کتاب الفضائل)

یعنی دیکھنا یہ شیشے اور آبگینے ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں یعنی **Glass with Care**

پس آنحضورؐ نے عورت ذات کو پستیوں سے اٹھا کر بلندیوں تک پہنچا دیا اور وہ مردوں کے شانہ بشانہ معاشرہ میں سر اٹھا کر چلنے لگی۔ عورتوں نے علم میں بھی اتنی ترقی کی کہ ان میں سے بعض مسلمانوں کو دین کا علم سکھانے لگیں اور بعض تو مشہور صوفی بھی بنیں۔ چنانچہ ایک موقعہ پر آنحضرتؐ نے بھی فرمایا تھا کہ آدھا دین حضرت عائشہؓ سے سیکھو۔ آپؐ نے عورتوں کے حقوق کی

حفاظت فرمائی اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا:۔

''جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی مردوں پر حقوق ہیں''

آپؐ نے عورتوں کو وراثت کا حق دلوایا۔عورتوں کے حقوق کے لئے آپؐ کے احسانات کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ مسٹر کریبٹس لکھتا ہے:۔

''محمدؐ نے عورتوں کے حقوق کی ایسی حفاظت کی ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی تھی۔اس کی قانونی حیثیت قائم ہوئی جس کی بدولت وہ مال وراثت میں حصہ کی حقدار ہوئی۔۔۔۔''

(بحوالہ نقوش رسول نمبر صفحہ 864)

اسی طرح ہندوستان کی مشہور مصنفہ کملا دیوی لکھتی ہیں:۔

''آپؐ نے عورتوں کی مٹی ہوئی عزت کو بچایا۔اور اس کے حقوق مقرر کئے۔آپؐ نے اس دکھ بھری دنیا میں شانتی اور امن کا پرچار کیا اور امیر وغریب سب کو ایک سبھا میں جمع کیا''

(الامان دہلی بحوالہ نقوش رسول نمبر صفحہ ۴۵۱)

امام الزمان سیدنا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود ومہدی معہود علیہ السلام اسلام میں عورتوں کے حقوق کے متعلق فرماتے ہیں:۔

''عورتیں یہ نہ سمجھیں کہ ان پر کسی قسم کا ظلم کیا گیا ہے کیونکہ مرد پر بھی اس کے بہت سے حقوق رکھے گئے ہیں بلکہ عورتوں کو گویا بالکل کُرسی پر بٹھا دیا ہے اور مرد کو کہا ہے کہ ان کی خبر گیری کر۔اس کا تمام کپڑا کھانا اور تمام ضروریات مرد کے ذمّہ ہیں۔''

(ملفوظات جلد پنجم صفحہ ۳۰)

نیز آپ علیہ السلام اپنی جماعت کو تاکیدی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''جو شخص اپنی اہلیہ اور اس کے اقارب سے نرمی اور احسان کے ساتھ معاشرت نہیں کرتا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔۔۔۔ ہر ایک مرد جو بیوی سے یا بیوی خاوند سے خیانت سے پیش آتی ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے''

(کشتی نوح صفحہ ۱۹)

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۃ المسیح الثانی کا ایک اقتباس اسی ضمن میں پیش ہے:۔

''اسلام کی سچائی کا یہ کس قدر زبردست ثبوت ہے کہ ہزاروں سالوں کی انسانی زندگی کے بعد اس نے پہلی مرتبہ مرد اور عورت کے حقوق کو تسلیم کیا اور اس کے جاری کرنے کی اُس وقت خبر دی جبکہ ابھی مسلمانوں کو حکومت بھی نہ ملی تھی۔ اور اس کے باوجود ظالم دشمن اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمیں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت نہیں کی گئی۔''

(تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۳۴)

غرض اسلام نے عورت کے حقوق کی جس طرح حفاظت کی ہے ویسی حفاظت اور کسی مذہب نے نہیں کی۔ اور اس بات کا اعتراف بعض مستشرقین نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ پی ایئر کریائٹس لکھتے ہیں:۔

"Muhammad(saw),assured to the mothers,wives and daughters of Islam a rank and diginity thirteen hundred years ago, not yet generally assured to women by laws of the west"

(Muhammad and teachings of Quran by john Davenport p.126)

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تیرہ سو سال قبل اسلام میں ماؤں بیویوں اور بیٹیوں کے لئے وہ مقام اور وقار یقینی بنا دیا جو ابھی تک مغرب کے قوانین میں عورت کو نہیں مل سکا۔

اسی طرح ایک اطالوی مستشرقہ پروفیسر ڈاکٹر وگلیری نے اسلام میں عورت کے تحفظ حقوق اور مثالی مقام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''اسلامی شریعت کے آنے سے پہلے تعدّد ازدواج پر کوئی قید نہ تھی اور اسلامی قانون نے بہت سی پابندیاں لگا کر مسلمانوں کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کو جائز رکھا۔ اسلام نے ان مشروط اور عارضی نکاحوں کو ناجائز قرار دیا جو دراصل حرام کاری کو جائز بنانے کے مختلف بہانے

تھے مزید برآں اسلام نے عورتوں کو ایسے حقوق عطا کئے جو انہیں پہلے کبھی حاصل نہ تھے ۔۔۔۔۔گو سماجی اعتبار سے یورپ میں عورت کو بڑا درجہ حاصل ہے لیکن اگر ہم چند سال پیچھے جائیں اور یورپ میں عورت کی خود مختاری کا موازنہ دنیائے اسلام کی خود مختاری سے کریں تو معلوم ہوگا کہ یورپ میں عورت کی حیثیت کم از کم قانونی لحاظ سے بہت ادنیٰ رہی ہے اور بعض ملکوں میں اب تک یہی صورت باقی ہے۔''

(An Interpretation of Islam کا اردو ترجمہ اسلام پر نظر صفحہ 37,41)

۲۔بیوی کے حقوق

میاں بیوی کا تعلق انسانوں کے درمیان قریب ترین تعلق ہے اور خاندان کی اساس ہے اسلام نے اس تعلق کا احترام کرنے اور اسے استوار رکھنے کی ہدایت کی ہے اور مرد سے کہا ہے کہ بیوی کی کوئی بات ناپسند ہو تو اسے نظر انداز کر کے اسکے ساتھ معروف کے مطابق رویہ اختیار کرے۔وہ رویہ معروف کہا جائے گا جسے ہر شریف اور مہذب انسان معقول کہے اور جسے معاشرہ پسندیدہ نظر سے دیکھے۔قرآن مجید کی ہدایت ہے کہ:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿٢٠﴾

(النساء:20)

بھلے طریقے سے ان کے ساتھ برتاؤ کرو اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھی ہوئی ہو۔

رسول اللہؐ نے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔حضرت معاویہ قشیریؓ نے آپؐ سے بیوی کے حقوق دریافت کیے تو آپؐ نے فرمایا:

ان تطعمها اذا طعمت و تکسوها اذا اکتسیت ولا تضرب الوجه ولا تقبّح ولا تهجر الا فی البیت

(ابوداؤد کتاب النکاح)

جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ (غصہ سے بے قابو ہوکر) اس کے منہ پر مت مارو۔ اسکو برا بھلا مت کہو اور (اگر اس سے کنارہ کشی کرنی ہو تو اسے گھر سے مت نکالو بلکہ) گھر ہی کے اندر اس سے علیحدہ رہو۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں انسان کا جو معیار ہے وہی اس کی بیوی کا بھی ہونا چاہئے۔ خود اعلیٰ معیار کے ساتھ رہنا اور اسے کم تر معیار کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ میل جول اور تعلقات میں شریفوں کا سا برتاؤ کرنا چاہئے۔ جہالت اور بربریت کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

اکمل المؤمنین ایمانا احسنهم خلقا و خیارکم خیارکم لنساءهم

(ترمذی، ابواب الرضاع)

مومنوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہوں۔ تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہوں۔

مطلب یہ کہ اخلاق کی بلندی ہی سے ایمان کا اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے، جو شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرے وہ معاشرہ کا بہترین فرد ہے۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ جو لوگ بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

(ابوداؤد کتاب النکاح)

اسکے مقابل پر بائبل کی کیا تعلیم ہے؟ وہ بھی ذرا ملاحظہ ہو:

اگر کسی کو اپنی بیوی پر غیرت آنے لگے حالانکہ وہ بالکل معصوم ہو تو کاہن اس کو لعنت لانے والا کڑوا پانی پلائے اگر وہ عورت معصوم ہوگی تو اس پانی کے برے نتائج سے بچ جائے گی۔

(گنتی باب 5 آیت:28-11)

اب ہر عاقل خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ آخر کون سی تعلیم اپنے اندر ایک امتیازی شان کی حامل ہے اسلام نے بیویوں کے انفرادی تشخص کو تسلیم کرکے ان کے فرائض کے ساتھ ساتھ ان کے حقوق

بھی بیان کیے ہیں۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی زندگی میں فرائض اور حقوق کی حد بندی کرتے ہوئے بھی بیویوں کے الگ وجود کو تسلیم کرایا۔چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں:۔

الدنیا کلھا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحہ

(مشکوٰۃ المصابیح،۲:۱۵۸)

یعنی ساری کی ساری دنیا نعمت ہے اور دنیا کی سب سے بہترین نعمت بیوی ہے۔

غیر مسلم اکثر اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے مرد کو ایک سے زائد شادی کی اجازت دی ہے جس کی وجہ سے بیوی کو اسکے جائز حقوق نہیں مل پاتے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نے جہاں مرد کو ایک سے زائد شادی کرنے کی اجازت دی ہے وہیں دوسری طرف اسے سختی کے ساتھ اپنی تمام بیویوں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین بھی فرمائی ہے۔اور اس سلسلہ میں بانیٔ اسلام نے اپنا نیک اسوہ بھی مسلمانوں کے لئے بطور مشعل راہ کے چھوڑا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نے کثرت ازواج کی تعلیم دے کر عورتوں کے حقوق کو قائم کیا ہے۔دراصل اسلام سے قبل بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی لوگ لا تعداد بیویاں کر کے انہیں اپنے گھروں میں رکھ چھوڑتے تھے۔(دیکھیے Encyclopedia Britannica،بذیل مادہ)۔لیکن اسلام نے اس کی ایک خاص تعداد یعنی چار،بعض مصلحتوں کی بناء پر مقرر فرمادی۔(النساء:۴)،مگر اس میں یہ شرط رکھی کہ ایسا اسی صورت میں کیا جائے جبکہ مرد اپنی بیوی سے معاملے،سلوک،مروت ،احسان اور محبت میں مساوات قائم رکھ سکتا ہو،اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر صرف ایک بیوی ہی کافی ہے۔(النساء۱۳۰)

گویا اسلام نے تعدد ازواج کو مخصوص حالات اور مخصوص شرائط کی موجودگی میں چار کی تعداد تک محروم کر کے ایک طرف تو عورتوں کو بھی ان کے جائز حق سے محروم نہیں کیا اور دوسری طرف مسلم معاشرے کو پاک بازی کی خوش گوار اور پرسکون زندگی اختیار کرنے کے لئے ایک عمدہ طریقے کی تعلیم دی۔بہر حال یہ تو ایک لمبی بحث ہے کہ اسلام نے کیوں ان حالات اور شرائط کے ساتھ ایک سے زائد شادی کی اجازت دے رکھی ہے لیکن اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کا ارشاد

پیش کرنا خالی از حکمت نہ ہوگا۔حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من کانت لہ امراتانِ فمال الیٰ احدھما ،جاء یوم القیٰمۃ وشقّہ مائل

(بخاری کتاب النکاح)

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہوتو وہ شخص قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ گرا ہوا ہوگا۔

اب دیکھیں کہ یہ کتنی سخت وعید ہے اور کتنے ہی عظیم عذاب کا مرتکب ہوگا وہ شخص جو اپنی کسی بیوی سے ناانصافی کرے۔لیکن بائبل میں تو اسکے الٹ ہی معاملہ ہے جہاں مساوات کو بالائے طاق رکھ کر یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ:

''اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں،ایک محبوبہ اور دوسری غیر محبوبہ اور پہلوٹھا لڑکا غیر محبوبہ سے ہوتو پہلوٹھا جو غیر محبوبہ سے ہے دگنے مال کا وارث ہو۔''

(استثناء باب 21 آیت:15)

سیدنا حضرت مصلح موعودؓ اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''پھر بیوی کے حقوق ہیں۔اسلام نے اُن کی بھی تفصیلات بیان کی ہیں اور ہدایت دی ہے کہ بیوی کے ساتھ محبت اور پیار کا سلوک ہونا چاہئے۔بیوی سے محبت تو سب کرتے ہیں، بلکہ بعض لوگ اپنی بیویوں پر عاشق ہوکر اپنے مذہب کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔مگر سوال یہ ہے کہ اُن کے مذہب نے اُن کا کیا حق رکھا ہے؟ محبت تو ایک فطرتی چیز ہے اور فطرت گمراہی کی طرف بھی لے جاتی ہے اور ہدایت کی طرف بھی لے جاتی ہے۔اصل سوال مذہب کا ہے مگر دوسرے مذاہب نے بیوی کے کوئی حقوق مقرر نہیں کئے۔اسلام نے ہی یہ حکم دیا ہے کہ بیوی کو مارو پیٹو نہیں بلکہ اُس کی دلجوئی کرو۔پھر فرمایا اُسکے کھانے کی ذمہ داری تم پر ہے۔اب تک یوروپ میں یہی دستور رہا ہے کہ بیوی کا مال خاوند کا ہوتا ہے اور وہ جس طرح چاہے اسے خرچ کرسکتا ہے خواہ وہ اُسے لُٹادے یا رکھ لے۔عورت کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔مگر اسلام نے اُسے یہ

حق دیا ہے کہ وہ اس کی آپ مالک ہے وہ جس طرح چاہے اسے خرچ کرے اور جس کو چاہے دے وہ خود اس کی ذمہ وار ہے۔لیکن مرد اس کا کفیل ہے۔''

(تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ ۳۰۵)

(نوٹ:- اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ آگے نکاح کے باب میں روشنی ڈالی گئی ہے)

۳۔بیوہ کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے حقوق

میاں بیوی کے درمیان بڑا جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ان کے مفادات بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے عورت جذباتی طور پر سب سے زیادہ اپنے شوہر سے قربت محسوس کرتی ہے اور زندگی کے سفر میں اس کی رفاقت کو سب سے زیادہ اہم تصور کرتی ہے۔عورت کی حیثیت یوں بھی کمزور رہی ہے اور جب اس کا یہ سہارا ختم ہو جاتا ہے تو اس کی حیثیت اور زیادہ مجروح ہو جاتی ہے۔بیوہ ہونے پر وہ اپنی حفاظت اور نگہداشت کرنے والے سے محروم ہو کر ہر طرف سے ظلم وستم کا نشانہ بن جاتی ہے۔عورت اگر بیوہ ہوتی ہے تو خدا کی قدرت اور حکمت کے تحت ہوتی ہے۔اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا،لیکن دنیا کی بیشتر قوموں کے نزدیک عورت کے لیے بیوگی بہت بڑا داغ تھی۔بیوہ عورت کو منحوس اور بدقسمت سمجھا جاتا تھا اور معاشرہ میں ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔لوگوں کے درمیان اس کی قدرومنزلت باقی نہ رہتی اور اس کی عزت وآبرو ختم ہو جاتی۔اس کے اندر اپنی محرومی اور بدنصیبی کا اتنا شدید احساس پیدا ہو جاتا کہ اکثر اوقات وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی اور زندہ بھی رہتی تو اس طرح کہ موت اس زندگی سے بہتر ہوتی۔چنانچہ تورات میں بھی لکھا ہے کہ:

''یہوداہ نے اپنی بیوہ بہو کے بارہ میں سُن کر کہ وہ حاملہ ہے کہا کہ اسے باہر نکال لاؤ تاکہ وہ جلائی جائے۔''

(پیدائش باب 38 آیت:24)

آج بھی دنیا کے بہت سارے معاشروں میں بیوہ کا یہی حال ہے۔اس پہلو سے بیوگی عورت کے لیے ایک سماجی اور نفسیاتی سانحہ ہے۔جس عورت کے ساتھ یہ سانحہ پیش آئے ،اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ وہ ہمارے حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔رسول اللہؐ نے بیواؤں اور مسکینوں کی خدمت اور تعاون کرنے اور اس سلسلے میں تگ ودو کو راہِ خدا میں جہاد اور شب وروز کی نفل عبادت کے برابر قرار دیا ہے۔چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

الساعی علی الارملة و المسکین کالمجاهد فی سبیل الله و احسبه قال و کالقائم لا یفترو کالصائم لا یفطر

(بخاری کتاب الادب باب الساعی علی المسکین۔مسلم کتاب الزھد)

بیوہ اور مسکین کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جو خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرتا ہے راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو مسلسل خدا کی یاد میں کھڑا رہتا ہے اور لگاتار روزے رکھتا ہے۔

اسلامی قانون کے تحت عورت بیوہ ہونے کی وجہ سے اپنے قانونی حقوق سے محروم نہیں ہوتی شوہر کے ترکہ یا وراثت میں اس کا حصہ متعین ہے۔اگر اس کا کوئی ذریعہ آمد نہیں ہے تو شوہر کے بعد اس کا نان ونفقہ اس کی اولاد یا ماں باپ پر لازم ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بیوہ عورتوں سے حسن سلوک کی تعلیم دیتے ہوئے بیوہ کا یہ حق قرار دیتا ہے کہ وہ شوہر کی وفات کے بعد کم سے کم ایک سال تک اسکے گھر میں رہ سکتی ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے :۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۱﴾

(البقرة:241)

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے حق میں ایک سال تک فائدہ پہنچانے یعنی ان کو (گھروں سے) نہ نکالنے کی وصیت کر جائیں۔لیکن اگر وہ (خود بخود) چلی جائیں تو وہ اپنے متعلق جو پسندیدہ بات کریں اُس کا تمہیں کوئی گناہ نہیں اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں صاف طور پر مرد کے وارثوں کو بیوہ کو فائدہ پہنچانے کے لئے پابند کیا گیا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ بیشک اگر شوہر کا مکان کی اور وارث کے حصہ میں آیا ہو مگر بیوہ بیوی کو ایک سال تک اس میں رہنے کا حق حاصل ہے نیز وہ اپنے متعلق فیصلہ کرنے میں خود مختار ہے کہ آیا اُس نے ایام عدت کے بعد اُس مکان میں رہنا ہے یا نہیں۔

بیوہ کے متعلق سب سے اہم بات یہ کہ اسے دوسرے نکاح کا حق ہے۔ یہ حق اور کسی مذہب نے بھی عورت کو فراہم نہیں کیا۔ انجیل نے تو منع کیا ہے کہ کوئی بیوہ سے شادی نہ کرے اسی طرح ہندو مذہب نے تو حد ہی کردی اور بیوہ کو اپنے شوہر کے ساتھ جل جانے کی تعلیم دی جسے عام طور پر ستی پرتھا کہا جاتا ہے۔ اسلام کی یہ امتیازی تعلیم ہے کہاس نے **بیوہ کو یہ حق دیا کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے دوبارہ ازدواجی زندگی شروع کرے۔** اسلامی معاشرہ میں بیوہ سے ایام عدت کے ختم ہونے کے بعد نکاح کا رواج رہا ہے اور یہ بیوہ عورت کے بہت سے مسائل کا حل ہے۔ لیکن یہ تعلیم ایسی خوبصورت شکل میں دیگر مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ ہندو مذہب نے اگر بیوہ کو دوسری شادی کا حق دیا بھی تو اسکی کیا صورت بیان کی ہے، قارئین خود ہی ملاحظہ فرمائیں:۔

’’جس لڑکی کا خاوند مر جائے تو پھر اس کنیا (عورت) کو چاہئے کہ کسی شخص واحد سے بیاہ نہ کرے۔ وہ عمر بھر ایک کی نہ ہو رہے۔ بلکہ دس بارہ مختلف نوجوانوں سے تا دمِ آخر مضبوط اولاد حاصل کرتی رہے۔‘‘

(ستیارتھ پرکاش باب ۴ دفعہ ۱۱۸ صفحہ ۱۹۱)

اسی طرح آریہ مذہب میں اور بھی بہت ساری ایسی تعلیمات ہیں جن کو لکھنے میں بھی شرم آتی ہے۔ مثلاً نیوگ کے بارے میں عموماً لوگ جانتے ہی ہیں کہ یہ کیسی بیہودہ اور غیر فطری تعلیم ہے جس کے مطابق خاوند بیٹا پانے کے لئے اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے پاس بھی بھیج سکتا ہے بلکہ آریوں کی کتاب میں تو لکھا ہے کہ بھیجنا ضروری ہے کیونکہ بیٹے کی پیدائش کے بغیر مُکتی یعنی نجات نہیں مل سکتی۔ ہماری تو رب سے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو ہدایت دے۔ آمین

۴۔ یتیموں کے ساتھ حسن سلوک اوران کے حقوق

یتیم اصطلاحاً اس نابالغ بچہ کو کہا جاتا ہے جسے اپنے باپ کا سایہ نصیب نہ ہو لیکن جس بچہ کی ماں نہ ہو اسے بھی اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے یتیم کہا جا سکتا ہے۔ کسی بھی بچہ کے لئے یتیمی سب سے بڑا سانحہ ہے۔ ماں باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے بچہ اپنے قریب ترین ہمدردوں اور حقیقی سرپرستوں سے محروم ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں بہت ساری چیزوں کے لیے دوسروں کا محتاج بن جاتا ہے۔ دوسروں کے لیے آسان نہیں ہوتا کہ وہ کسی اور کے بچے کو اپنا بچہ سمجھ کو پیار کریں اور اسکی تمام ضروریات پوری کریں۔ لیکن جو شخص یہ مشکل کام انجام دے اسے آخرت میں رسول اکرم ﷺ کی قربت اور معیت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سہل بن سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

انا و کافل الیتیم فی الجنۃ ھٰکذا و قال باصبعیہ السبابۃ و الوسطیٰ

(بخاری کتاب الادب، باب فضل من یعول یتیما)

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح قریب ہوں گے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یتیموں کے مال اُن کو دینے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ

(سورۃ النساء آیت ۳)

یعنی اور یتیموں کو ان کے مال دے دو۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے جماعت احمدیہ کے پہلے خلیفہ سیدنا حضرت حافظ الحاج حکیم نورالدینؓ خلیفۃ المسیح الاول فرماتے ہیں:

’’مظلوموں میں یتیم بڑا مظلوم ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے :وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ (انعام :۱۵۳)۔‘‘

(حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ۶)

اگر یتیم سے قرابت اور رشتہ داری کا تعلق نہ ہو تو بھی اسکی پرورش اور نگہداشت پر وہی اجر و ثواب ملے گا جو کسی قرابت دار یتیم کی کفالت پر ملتا ہے۔ اسے بھی رسول اللہؐ نے قیامت میں اپنی رفاقت کی بشارت دی ہے۔

(مسلم کتاب الذھد، باب فضل الاحسان علی الارملۃ)

اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ مالک بن الحارثؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول کریمؐ کو یہ فرماتے سنا کہ:

من ضم یتیما بین ابوین مسلمین الی طعامہ و شرابہ حتی یستغنی عنہ وجبت لہ الجنۃ

(مسند احمد ۴/ ۳۴۴)

جو شخص کسی یتیم کو جو مسلمان ماں باپ سے ہو، اپنے کھانے پینے میں اس وقت تک ساتھ رکھے جب تک کہ وہ (بڑا ہو کر) اس سے بے نیاز ہو جائے تو اسکے لئے جنت واجب ہو گی۔

اسی سلسلہ کی ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من عال ثلثۃ من الایتام کان کمن قام لیلہ و صام نہارہ وغدا وراح شاھرا سیفہ فی سبیل اللہ و کنت انا و ھو فی الجنۃ اخوان کما ان ھاتین اختان والصق اصبعیہ السبابۃ والوسطی

(ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حق الیتیم)

جو شخص تین یتیموں کی پرورش کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے رات میں قیام کیا، دن میں روزہ رکھا اور صبح و شام اپنی تلوار لیے ہوئے خدا کی راہ میں جہاد کرتا رہا۔ میں اور وہ جنت میں اس طرح قریب ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں ہیں۔ یہ کہہ کر آپؐ نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی ملائی۔

اب وہ کون مسلمان ہوگا جو جنت میں آنحضرتؐ کی رفاقت نہ چاہتا ہوگا۔ اتنے بڑے انعام کے لئے تو ضرور مخلص مسلمان یتیموں کی پرورش کریں گے اور کرتے بھی ہیں کیونکہ یہ ایک ایسی اعلیٰ تعلیم ہے کہ جو دیگر مذاہب میں اس شدت کے ساتھ نہیں پائی جاتی۔ صرف اسلام ہی نے اپنے ماننے والوں کو سکھایا ہے کہ یتیم بچوں کی پرورش کرو کیونکہ یہ معاشرہ کے لئے بھی فائدہ مند

ہے اور اجر وثواب کے لحاظ سے بھی اعلیٰ عمل ہے۔عورت اور یتیم کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی اور حق تلفی سے آنحضرتؐ نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے:

اللھم انی احرج حق الضعیفین الیتیم و المرأۃ

(مسند احمد ۲/۴۳۹۔ابن ماجہ کتاب الادب)

اے اللہ جو شخص ان دو کمزوروں ،یتیم اور عورت کا حق ضائع کرے میں اسے خطا کار اور مجرم ٹھہراتا ہوں (اور اس سے بچنے کی تاکید کرتا ہوں)

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یحسن الیہ و شر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یساء الیہ

(ابن ماجہ کتاب الادب، باب حق الیتیم)

مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت دلی کی شکایت کی تو آپؐ نے اسے فرمایا:۔

اگر نرم دلی چاہتے ہو تو مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو۔

(مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۶۳ بیروت)

یتیم کم سمجھ اور نا تجربہ کار ہوتا ہے اور اسے اپنے نفع ونقصان کا پوری طرح احساس نہیں ہوتا اسلئے بآسانی اس کا حق مارا جا سکتا ہے۔اسلام نے سختی سے اسکی ممانعت کی ہے۔اس نے کہا کہ یتیم کے مال میں اگر تصرف ہو تو بھلے طریقے سے ہو اور اسے ترقی دینے کی کوشش کی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡيَتِيۡمِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ حَتّٰى يَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ

(بنی اسرائیل:۳۶)

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہترین ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔

یتیموں سے حسن سلوک سے متعلق اسلام نے جو تعلیم دی ہے وہ تمام مذاہب سے منفرد اور افضل ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں سیدنا حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:۔

''اس آیت میں (سورۃ بنی اسرائیل:۳۶) اسلامی نظام کا ایک اور ایسا حکم بیان کیا گیا ہے جس میں اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز اور منفرد ہے۔ یتیموں سے حسن سلوک کا حکم تو سب مذاہب میں ملتا ہے لیکن یہ حکم کہ ان کیا موال کی حفاظت کرو اور ان کو پڑھانے کی کوشش کرو کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔ گویا اس آیت میں ایک عام کورٹ آف وارڈز مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی نا بالغوں کی جائداد کی حفاظت کرنے والا محکمہ۔ آج کل مغربی حکومتوں کے تحت اس حکم پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر اس خیال کی بنیا اسلام ہی نے آج سے تیرہ سو سال پہلے قائم کی ہے۔''

(تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۳۳۲)

جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں اور اسے اسکا حق واجب طور پر ادا نہیں کرتے اُنہیں اللہ تعالیٰ نے جہنم کی وعید ان الفاظ میں سنائی ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ‌ؕ وَسَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا ۝۱۱

(النساء:11)

یقیناً وہ لوگ جو یتیموں کے مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

رسول اللہ ؐ نے سات گناہوں کو موبقات (ہلاک کر دینے والے گناہ) سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں سے ایک یتیم کا مال کھانا بھی ہے۔

(بخاری کتاب الحدود)

ایک جگہ یتیموں کے سرپرستوں سے قرآن مجید نے کہا کہ تم ان کے مال کے محافظ اور نگراں ہو ،تمہارا کام اسکی حفاظت اور نگہداشت ہے۔ جب وہ بلوغت کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کا مال تم انہیں سونپ دو۔ اگر خدا نے تمہیں وسعت اور فراخی عطا کی ہے تو بہتر ہے کہ کسی معاوضہ کے بغیر ان کی خدمت کرو۔ لیکن اگر تنگ دست اور حاجت مند ہو تو دستور کے مطابق اپنی اجرت اور معاوضہ تو لے سکتے ہو لیکن بے دردی سے اڑا نہیں سکتے ۔(النساء آئت ۷) اسی طرح قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہ اصول بھی سکھلایا ہے کہ یتیم کے مال کے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا جائے جو اس کے حق میں مفید اور بہتر ہو۔ (البقرۃ:۲۲۱)

حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ میں بالکل غریب اور نادار ہوں ۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے، البتہ ایک یتیم کی پرورش کرتا ہوں ،کیا میں اس کے مال سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں؟ اس پر آپؐ نے فرمایا:

کل من مال الیتیم غیر مسرف ولا مبادر ولا متاثل

(ابوداؤد کتاب الوصایا، باب ماجاء فی مالولی الیتیم)

یتیم کے مال سے تم کھا سکتے ہو لیکن نہ تو ضرورت سے زیادہ اور نہ جلدی جلدی اور نہ اس طرح کہ اس کا اصل سرمایہ ہی ختم ہو جائے۔

۵۔غلاموں اور محکوموں کے ساتھ حسن سلوک

اور ان کے حقوق

دنیا میں قدیم ترین زمانے سے غلامی کا رواج رہا ہے اور جب سے اسکا رواج ہے غلاموں کے ساتھ ظلم و زیادتی بھی ہوتی رہی ہے۔ غلام کو ہمیشہ سے نہ تو اپنی ترقی کے لئے جدوجہد کی آزادی تھی اور نہ کسی چیز پر اسکا حق ملکیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی جان و مال، اسکی صلاحیتوں اور اسکے اوقات پر اسکے مالک کا پورا اختیار ہوتا تھا وہ جس طرح چاہتا اس سے معاملہ کرتا۔ بعض اوقات تو ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور انکو شکوہ و شکایت کی بھی

اجازت نہ ہوتی تھی۔ جو شخص ایک دفعہ غلام بن جاتا اس کی پھر اولاد بھی غلام ہی رہتی۔ اسی طرح بادشاہوں نے رعایا کے ساتھ، حاکموں نے محکوموں کے ساتھ، امیروں اور رئیسوں نے نوکروں اور خادموں کے ساتھ، زور آوروں اور طاقت وروں نے زیر دستوں اور کمزوروں کے ساتھ ہر طرح کی ظلم و زیادتی کی اور ان کے جائز حقوق کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں غلامی کا رواج بڑھتے بڑھتے کم و بیش تمام دنیا کے ممالک میں جاری ہو چکا تھا لیکن خصوصاً عرب میں غلام بنانے کا رواج اپنے عروج پر تھا۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل عرب میں ہزاروں غلام پائے جاتے تھے۔ عرب کے لوگ خصوصیت کے ساتھ غلاموں کو سخت حقیر و ذلیل سمجھتے تھے اور ان سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا کرتے تھے۔ اسلام نے دور آغاز سے ہی اس کے خلاف آواز بلند کی۔ آنحضورؐ نے جب خدا سے الہام پا کر نبوت کا دعویٰ کیا تو آپؐ کی ابتدائی تعلیم میں یہ بات داخل تھی کہ غلاموں کے ساتھ محبت کا سلوک کیا جائے۔ آپؐ نے ذاتی طور پر غلام سازی کے اس عمل کو بھی روکا اور جو غلام پہلے سے عرب معاشرے میں موجود تھے ان کی آزادی اور معاشرے میں ان کے باوقار مقام کے لئے بھی اپنا اسوۂ حسنہ قائم فرمایا۔ چنانچہ تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ آپؐ نے غلاموں کو ان کے جائز اور فطری حقوق عطا کیے جانے کی تبلیغ فرمائی اور متعدد عبادتوں میں غلاموں کی آزادی کو شامل کیا اور غلاموں کو اپنے جیسا انسان سمجھنے اور ان کی جائز ضروریات پورا کرنے کی بار بار تاکید فرمائی حتیٰ کہ اپنی آخری وصیت تک میں اسے پھر دہرایا۔ آپؐ نے خود اپنے غلام حضرت زیدؓ کو آزاد کر کے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا اور ان سے اپنے حقیقی بیٹوں جیسا سلوک فرمایا۔ اسی طرح اپنی خادمہ ام ایمنؓ کو آپؐ ہمیشہ یا امہ (اے امی) کہہ کر پکارتے تھے۔ (ابن سعد، ۸:۶ ۲۳۳، تذکرۂ ام ایمنؓ) انہیں آپؐ نے اپنے اہل بیت میں سے شمار کیا اور انہیں خاتون جنت قرار دیا۔ (کتاب مذکور)، علاوہ ازیں انہیں آزاد کر کے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے بیاہ دیا۔

پس آپؐ نے نہ صرف یہ کہ موجود الوقت غلاموں کی حالت کو سنوار کر غلام و آقا کے فرق کو مٹایا

،انکی حالت کی بہتری اور آزادی کا انتظام فرمایا بلکہ آئندہ کے لئے ایسی اصلاحات فرمادیں کہ غلام بنانے کا ظالمنانہ طریق ہی ختم ہو گیا۔جوں جوں اسلام ترقی کرتا گیا غلاموں کی حالت بتدریج بہتر ہوتی چلی گئی۔یہاں تک کہ اسلام نے غلاموں کو قریبی عزیزوں کی طرح قرار دیا چنانچہ خادموں اور آقاؤں کی درمیانی خلیج کو اُڑانے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

ان خولکم اخوانکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیتعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فاعینوھم

(بخاری کتاب العتق باب قول النبیؐ العبید اخوانکم، مسلم کتاب الایمان باب صحبۃ الممالیک)

یعنی یقیناً تمہارے خادم تمہارے بھائی ہیں۔اللہ نے انکو تمہارے تحت کر رکھا ہے۔پس جس کسی کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے وہ کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ان پر کام کا اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ اسے وہ اٹھا نہ سکیں۔اور اگر کبھی مجبوراً انہیں کوئی ایسا کام دینا پڑے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو تو پھر اُس کام کے پورا کرنے میں خود بھی ان کی مدد کیا کرو۔

یہ حدیث جیسا کہ اس کے الفاظ اور اسلوبِ بیان سے ظاہر ہے ایک نہایت اہم اور اصولی حدیث ہے اور ''اُن کی مدد کیا کرو'' کے الفاظ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کام ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ اگر وہ خود آقا کو کرنا پڑے تو وہ اُسے اپنے لئے موجب عار سمجھے بلکہ ایسا ہونا چاہئے کہ جسے خود آقا بھی کرسکتا ہو اور کرنے کو تیار ہو۔یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اُوپر کی حدیث میں جو خَوَل کا لفظ آیا ہے وہ عربی محاورہ کے مطابق نوکروں اور خادموں اور غلاموں اور اسی قسم کے دوسرے حاشیہ نشینوں سب پر بولا جاتا ہے۔اس طرح اس حدیث میں گویا ایک نہایت وسیع مضمون مدنظر رکھا گیا ہے۔

محسن انسانیت نبی کریمؐ نے انسانیت کو جن طوقوں سے نجات دلائی ان میں سے ایک غلامی کا طوق بھی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ غلامی کے خاتمہ کا یہ اعلان کروایا کہ:۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۞

سورۃ الانفال:69

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ سوائے اس کے کہ خونریز جنگ ہو اور مدمقابل دشمن تمہارے آدمی قید کرے بلاوجہ کسی کو قیدی نہیں بنایا جاسکتا۔

نبی کریمؐ نے مسلمانوں کو غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور انہیں آزاد کرانے کی سخت تلقین کی اور ان کے سامنے اپنا اسوہ حسنہ بھی چھوڑا۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

للمملوك طعامه و كسوته ولا يكلف الا ما يطيق

(مسلم کتاب الایمان باب اطعام المملوک مما یاکل)

غلام کا حق ہے کہ اسے کھانا اور لباس فراہم کیا جائے اور اسے اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ غلام کے ساتھ زیادتی ہو تو اسے آزاد کر دیا جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لطم مملوكا او ضربه فكفارته ان يعتقه

(مسلم کتاب الایمان۔ مسند احمد ۲/۶۱)

جو اپنے غلام کو منہ پر تھپڑ یا کسی اور جگہ مارے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:۔ جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے۔ اور جو شخص (غلام کا) ناک، کان یا کوئی دوسرا عضو کاٹے گا تو اس کے بدلے میں اس کا بھی وہی عضو کاٹا جائے گا اور جو آدمی اپنے غلام کو خصی کرے گا۔ اسے بھی اس کے بدلے میں خصی کیا جائے گا۔

(سنن نسائی جلد ۳ صفحہ ۳۰۴)

نیز فرمایا کہ: اگر دن میں ستر مرتبہ بھی خادم غلطی کرے تو معاف کر دیا جائے۔

(ترمذی ۴:۳۳۶، حدیث ۱۹۴۹)

حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے غلام کوڑے سے مار رہا تھا۔ پیچھے سے کسی کی

آوازسنی۔ابومسعود! خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی کہ تمہیں اس پر حاصل ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو رسول اللہؐ موجود تھے، میں نے کوڑا زمین پر ڈال دیا اور کہا کہ اس کے بعد کسی غلام کو کبھی نہیں ماروں گا اور یہ غلام آج سے آزاد ہے۔آپؐ نے فرمایا اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں چھو جاتی۔

(مسلم کتاب الایمان۔ابوداؤد کتاب الادب)

اس واقع سے ملتے جلتے اور بھی بہت سارے صحابہ کے واقعات ہمیں حدیث میں ملتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہؐ کا اسوہ حسنہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔چنانچہ رسول کریمؐ کے ایک خادم حضرت انس بن مالکؓ تھے۔ان کا بیان ہے کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے۔آپؐ نے کبھی مجھے اُف تک نہیں فرمایا اور کسی کام کیلئے جو میں نے کیا آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ کیوں کیا اور نہ کسی کام کے لئے جو میں نے نہ کیا ہو اور چھوڑ دیا ہو آپؐ نے نہ فرمایا کہ کیوں نہیں کیا۔

(بخاری کتاب الادب باب 39 ومسلم کتاب الفضائل باب 13)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام پر جھوٹا الزام لگانے اور اسے بدنام کرنے پر سخت وعید سنائی ہے۔حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قذف مملوکہ وھو برئ مما قال جلد یوم القیامة الا أن یکون کما قال

(بخاری کتاب الحدود،مسلم کتاب الایمان)

جو اپنے غلام پر تہمت لگائے اور جو بات کہی گئی ہے غلام اس سے بری ہو تو بروز قیامت اسے کوڑے لگائے جائیں گے سوائے اسکے کہ وہ الزام درست ہو۔

''اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:۔خادم کے مالک پر تین حق ہیں۔اول یہ کہ جب وہ نماز پڑھ رہا ہو تو اسے جلدی نہ ڈالے۔دوسرے کھانا کھاتے ہوئے اسے کھانے سے نہ اٹھائے اور تیسرے اسے بھوکا نہ رکھے بلکہ سیر کر کے کھانا کھلائے۔

(مجمع الزوائد للھیثمی جلد ۸ صفحہ ۱۶۳)

پھر فرمایا:۔تم ان غلاموں کی اپنی اولاد کی طرح عزت کرواور جوخود کھاتے ہواس میں سے ان کو کھلاؤ۔

(بخاری کتاب العتق 2366)

نبی کریمؐ نے غلاموں کے حقوق کا بھی تحفظ فرمایا۔چنانچہ اسلام سے پہلے غلام کوطلاق دینے کا حق نہیں ہوتا تھالیکن آپؐ نے غلام کا یہ حق بھی قائم فرمادیا۔

(ابن ماجہ کتاب الطلاق باب طلاق العبد)

آپؐ کوغلاموں کی بہبود کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ کوان کے حق میں لفظ غلام کا استعمال بھی پسند نہ تھا۔چنانچہ آپؐ نے غلاموں میں عزت نفس پیدا کرنے کے لئے اوراحساس کمتری کودور کرنے کے لئے نیز آقا کے تکبر کومٹانے کی غرض سے یہ حکم دیا کہ:۔

''اے مسلمانو!تم یوں نہ کہا کروکہ میراغلام۔میری لونڈی۔بلکہ میرالڑکااور میری لڑکی کہہ کر پکارا کرو۔اورفرمایا کہ غلام بھی اپنے آقا کوربؔ یعنی مالک نہ کہا کرے۔بلکہ سیداور بزرگ کہہ کر پکارا کرے۔''

(بخاری کتاب العتیق)

آنحضورصلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات کی تعمیل میں صحابہ بڑے انہماک سے غلاموں کا خیال رکھتے تھے۔اسکی ایک مثال حضرت علیؓ ہیں۔آپؓ بازار سے لباس خریدتے اورغلام کوبھی پسند کرنے کا اختیار دیتے اور جوبچتا خود زیب تن فرماتے۔

(اسدالغابہ حالات حضرت علیؓ)

غلامی کے مسئلہ کاتعلق جنگی قیدیوں سے بھی ہے۔مسلمانوں کوجب اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں فتح عطافرمائی تواُس وقت سترؔ کفار مکہ قیدی ہوئے۔یہ لوگ وہ تھے جنہوں نے مکہ میں مسلمانوں پر بہت سخت مظالم ڈھائے تھے جس کی وجہ سے حضورؐاور دیگر مسلمانوں کووہاں سے ہجرت کرنی پڑی تھی۔اُس زمانے کے دستور کے مطابق توبدر کے جنگی قیدیوں کی سزاموت تھی۔لیکن نبی کریمؐ نے کفارقریش کے ان قیدیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی اوران کی جان بخشی ورنہ کئی

صحانہ آپؐ کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ یہ سرداران کفر اس لائق ہیں کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ آپؐ نے ان سے ان کی استطاعت کے مطابق فدیہ لیا اور آزاد کر دیا۔ اور جو فدیہ دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے انہیں بغیر فدیہ کے ایسے ہی آزاد کر دیا۔

(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام جلد ۲ صفحہ ۲۸۸)

ہوسکتا ہے کہ موجودہ دور میں یہ مسئلہ نہ اٹھے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اسلام نے غلامی کو بالکل ختم کر دیا یا اسے سیاسی حالات پر چھوڑ دیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنا اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی ہے اتنا اور کسی مذہب نے نہیں دی۔ اسلام نے مکاتبت کا طریقہ رائج کیا (سورۃ النور: ۳۴) جس سے غلاموں کے لئے اپنی آزادی حاصل کرنا بہت سہل ہو گیا۔ اسی طرح بعض گناہوں اور غلطیوں کے کفارے میں غلام کو آزاد کرنا بھی شامل کیا گیا۔ مثلاً کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرنا (النساء: ۹۳) قسم توڑنا (المائدہ: ۹۰) بیوی کو ماں قرار دے کر اس سے رجوع کرنا (المجادلہ: ۴)۔ ان سب تدبیروں کے علاوہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی، اس پر نا قابل برداشت بوجھ ڈالنے سے منع کیا اور اس کے حقوق متعین کئے اور اسکی ذمہ داریوں کی وضاحت کی۔

اسلام کی اس خوبصورت تعلیم کا جب ہم دیگر مذاہب سے موازنہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اسلامی تعلیمات دیگر کے مقابل پر منفرد و اعلیٰ ہیں۔ چنانچہ یہودیوں کی مقدس کتاب توریت میں بھی غلاموں کو آزاد کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور مگر یہ حکم صرف عبرانی غلاموں پر صادر آتا ہے۔ نیز یہ تعلیم اتنی اعلیٰ نہیں ہے کہ اسلام سے اس کا مقابلہ ہو سکے۔ قارئین خود ہی توریت کی تعلیم ملاحظہ فرمائیں:۔

''اگر تمہارے لوگوں میں سے کسی عبرانی مرد یا عورت تمہارے ہاتھ بیچے جائیں تو اُس شخص کو تمہاری خدمت چھ سال تک کرنی چاہئے۔ تب ساتویں سال تمہیں اسے اپنے سے آزاد کر دینا چاہئے۔'' (استثناء باب ۱۵ آیت ۱۲)

''عبرانی غلام چھ برس کی خدمت کے بعد ساتویں برس آزاد ہو کر چلا جائے لیکن اگر غلام کے آقا نے اس کی شادی کروائی ہو تو غلام اکیلا چلا جائے اور عورت اپنے آقا کے پاس رہے۔''

(خروج باب 21 آیت:5-2)

اسی طرح استثناء میں یہود و نصاریٰ کو غلام بنانے کی ترغیب دی گئی ہے اور کہا ہے کہ جس قوم پر فتح پاؤ ان کے مردوں کو قتل کر دو اور عورتوں بچوں کو قیدی بنا لو۔

جہاں اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے اور انہیں چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پہنچانے سے بھی منع کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ سکھایا کہ وہ بھی تمہارے بھائی ہیں اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اور اسی طرح رسول اللہؐ نے بھی اپنے اسوہ کے ذریعہ دکھا دیا کہ کس طرح ایک غلام کو بیٹا بنا کر رکھا جاتا ہے۔ دوسری طرف توریت نے ایک عجیب سی بات کہی ہے کہ اگر کوئی غلام تمہارے آزاد کرنے کے باوجود تمہارے خاندان کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ تم:

''اُس خادم کو اپنے دروازے کے سے کان لگانے دو اور ایک سوئی سے اُس کے کان میں سوراخ کرو پھر وہ ہمیشہ کے لئے تمہارا غلام ہو جائیگا۔ تم لونڈیوں کے لئے بھی یہی کرو جو تمہارے ہاں رہنا چاہتی ہیں۔''

(استثناء باب ۱۵ آیت ۱۷)

اسی طرح جہاں ایک طرف اسلام غلامی کو ختم کرنے کے لئے کوشاں ہے تو دوسری طرف بائبل میں اس کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:

''باپ اپنی بیٹی کو لونڈی ہونے کے لئے بیچ سکتا ہے۔''

(خروج باب 21 آیت:7-8)

قارئین! آنحضرتؐ نے غلاموں کو ان کے جائز حقوق دلانے کے سلسلہ میں جو اہم انتظامی اقدامات فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپؐ نے لوگوں کو ان کے نکاح کی ترغیب دلائی اور ان کے مابین جبری تفریق کو بالکل باطل ٹھہرایا (ابن ماجہ: السنن باب الطلاق)۔ انہیں مال

غنیمت میں سے حصہ عطا کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے غلاموں کے جو حقوق قائم فرمائے اور عملی طور پر ان سے حسن سلوک کر کے دکھایا اسکے تذکرہ کے لئے تو ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ مختصراً یہ کہ آپؐ نے غلاموں کو پستی سے اٹھا کر بلند ترین مقام پر فائز کر دیا۔ یہاں تک کہ غلام استاد بن گئے اور آزاد افراد ان کی شاگردی کو قابل فخر سمجھنے لگے۔ غلام سپہ سالار بنے اور بڑے بڑے صحابہ ان کے ماتحت ہوتے تھے۔

غلاموں کی بہبود کے لئے جو آنحضورؐ کو ساری زندگی احساس رہا آخری وقت میں بھی اسی کی وصیت کی۔ چنانچہ آخری وقت میں بھی آپؐ نے غلاموں سے حسن سلوک کے متعلق ہی وصیت کی۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ جب آپؐ پر موت کا غرغرہ طاری تھا تو آخری الفاظ جو آپؐ کی زبان مبارک سے سنے گئے وہ یہ تھے۔ الصلوۃ و ما ملکت ایمانکم یعنی نماز اور غلاموں کے بارے میں میری تعلیم کو نہ بھولنا۔

(ابن ماجہ ابواب الوصیۃ)

مذکورہ بالا احادیث کا تعلق اصلاً غلاموں سے ہے، لیکن ان کی روشنی میں ملازموں، مزدوروں اور ماتحت طبقات کے سلسلے میں حسبِ ذیل اصول وضع کیے جا سکتے ہیں:۔

۞۔ ملازم کی تنخواہ اتنی ضرور ہو جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔

۞۔ مالک کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ملازم کو زدوکوب کرے یا اسے جسمانی سزا دے۔ اگر اس سے یہ غلطی سرزد ہو جائے تو اس پر تاوان لگایا جائے گا۔

۞۔ مالک کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ملازم پر جھوٹے الزامات لگا کو اسے بدنام کرے یا اس کی ملازمت ختم کر دے۔

غلاموں کے حقوق کے تحفظ اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق اسلامی تعلیمات کے امتیازات کو بعض حقیقت پسند مستشرقین نے بھی قبول کیا ہے۔ چنانچہ انہی میں سے ایک مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر ڈاکٹر وگلیری بھی ہیں۔ آپ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:۔

''غلامی کا رواج اسی وقت سے موجود ہے جب سے انسانی معاشرے نے جنم لیا اور اب تک بھی باقی ہے۔مسلمان خانہ بدوش ہوں یا متمدن ان کے اندر غلاموں کی حالت دوسرے لوگوں سے بدرجہا بہتر پائی جاتی ہے ۔ یہ نا انصافی ہوگی کہ مشرقی ملکوں میں غلامی کا مقابلہ امریکہ میں آج سے ایک سو سال پہلے کی غلامی سے کیا جائے۔حدیثِ نبویؐ کے اندر کس قدر انسانی ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔۔۔۔اگر تاریخی لحاظ سے ان واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں بھی عظیم الشان اصلاحیں کی ہیں ۔اسلام سے پہلے قرضہ نہ ادا ہونے کی صورت میں بھی ایک آزاد آدمی کی آزادی کے چھن جانے کا امکان تھا لیکن اسلام کے آنے کے بعد کوئی مسلمان کسی دوسرے آزاد مسلمان کو غلام نہیں بنا سکتا تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کو محدود ہی نہیں کیا بلکہ آپؐ نے اس بارے میں اوامر ونواہی جاری کئے اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ قدم بڑھاتے رہیں حتی کہ وہ وقت آ جائے جب رفتہ رفتہ تمام غلام آزاد ہو جائیں۔''

(کتاب اسلام پر نظر صفحہ 41 اردو ترجمہ An Intereption of Islam)

پس خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے آقاؤں اور خادموں کے تعلقات کو بھی بہترین بنیاد پر قائم کیا ہے۔

۶۔غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

قرآن مجید نے متعدد مقام پر مسکینوں اور محتاجوں کی مدد پر ابھارا ہے اور ان سے بے توجہی اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی سے منع کیا ہے(البلد:۱۷)۔قرآن کریم میں جہاں بھی حسن سلوک کا ذکر ہے وہاں والدین اور قرابت داروں کے ساتھ بالعموم مسکینوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔(مثلاً ملاحظہ ہو النساء آیت ۳۷،اسراء آیت ۲۷)۔اسی طرح ایک جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وراثت کا مال تقسیم ہو تو جن رشتہ داروں کا حصہ نہیں ہے ان کا اور یتیموں اور مسکینوں کا

خیال رکھا جائے (النساء:۹) اسی طرح قرآن کریم نے ان لوگوں کو سخت وعید سنائی ہے جو مسکینوں اور محتاجوں کا خیال نہیں رکھتے ۔(مثلاً ملاحظہ ہو الحاقہ:۳۵، الفجر:۱۵، الماعون:۴)۔ نیز احادیث میں بھی مختلف پہلوؤں سے محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اغاث ملهوفا كتب الله له ثلثا و سبعين مغفرة و احدة منها صلاح امره كله و ثنتان و سبعون له درجات يوم القيامة

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب)

جو شخص کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں تہتر مغفرتیں لکھے گا۔ ان میں سے ایک ہی سے اس کے سارے کام درست ہو جائیں گے اور باقی بہتر قیامت کے دن اس کے درجات میں اضافہ کا سبب ہوں گے۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی سنگ دلی کی شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا:

اطعم المسكين و امسح رأس اليتيم

(مسند احمد ۶/۱۳۹)

یعنی مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو۔

حدیث میں غریبوں اور مسکینوں سے محبت وشفقت کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے کیونکہ محبت کے بغیر سچی خدمت نہیں ہوسکتی۔ جو شخص غرباء سے محبت کرتا ہے وہی ان کے ساتھ بغیر کسی دکھاوے اور لالچ کے حسن سلوک کرسکتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امرني خليلي صلى الله عليه وسلم بسبع, امرني بحب المساكين و الدنو منهم

(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء)

میرے محبوب رسول اللہؐ نے مجھے سات باتوں کی ہدایت فرمائی۔ (ان میں سے ایک یہ تھی کہ) میں مسکینوں

سے محبت کروں اور ان کی قربت اختیار کروں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مسکینوں سے بہت محبت کرتے تھے، آپکی محبت اور شفقت کا اظہار آپؐ کی ایک دعا سے ہوتا ہے۔ آپؐ نے دعا فرمائی:

اللھم احیینی مسکینا و امتنی مسکینا و احشرنی فی زمرۃ المساکین

اے اللہ مجھے مسکین کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں ہی موت دے اور مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔

سیدنا حضرت محمد مصطفیؐ غرباء اور مساکین سے بہت محبت اور شفقت فرماتے تھے۔ حضرت خدیجہ کے بقول آپؐ غریبوں کے بہی خواہ اور ان کو کما کر دینے والے تھے۔ آپؐ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو بے حال ہو جاتے اور جب تک اس کا مناسب بندوبست نہ ہو جاتا آپ مطمئن نہ ہوتے تھے۔

(مسلم الصدقات، ۲:۴۰۵ تا ۴۰۷ حدیث ۱۰۱۷)

اصحاب صفہ وہ لوگ تھے جو محض دین سیکھنے کے لئے مسجد میں رہتے ان کی کوئی قرابت داری نہ تھی۔ آپ ان غرباء کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مساکین کا اتنا خیال تھا کہ آپ کے دروازے سے کبھی کوئی سوالی خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ بسا اوقات تو بھر میں جو کچھ بھی ہوتا سوالی کو دے دیتے اور خود بھوکے رہتے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک سوالی حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کو بکریوں کا اتنا بڑا ریوڑ دیا جس سے وادی بھر جاتی تھی۔ وہ شخص واپس اپنی قوم میں گیا اور کہنے لگا کہ مسلمان ہو جاؤ۔ خدا کی قسم محمد تو اس طرح ادا کرتا ہے کہ اسے کسی تنگی یا محتاجی کا کوئی ڈر نہیں

(مسلم کتاب الفضائل)

حضرت عائشہؓ نے اس دعا کی وجہ دریافت فرمائی تو آپؐ نے فرمایا کہ مساکین دولت مندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں پہنچیں گے۔ پھر نصیحت فرمائی:

یا عائشۃ احبی المساکین و قربیھم فان اللہ یقربك یوم القیامۃ

(مشکوۃ المصابیح کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء)

اے عائشہ! مسکینوں سے محبت کرو اور ان کو اپنے سے قریب کرو۔ اللہ تمہیں قیامت کے روز اپنے سے قریب کرے گا۔

اگر کوئی شخص غریبوں پر اپنی بڑائی ظاہر کرتا تو آپؐ اسے فرماتے: تمہیں جو کچھ بھی میسر ہے انہی محنت کشوں کی وجہ سے ہے۔

(ابوداؤد، ۳:۳۷، حدیث ۲۵۹۴)

کہیں سے لونڈی غلام آتے تو آپؐ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ غریبوں کا حق مقدم سمجھتے۔

(ابوداؤد: السنن، ۵:۳۰۱ حدیث ۵۰۶۶)

کبھی فرماتے: جنت میں داخل ہونے والے اکثر فقراء ہی ہوں گے۔

(مسلم، ۴:۲۰۹۶)

آپؐ ہمیشہ غرباء کی دلجوئی فرماتے چنانچہ فرمایا:

اگر روئے زمین بد باطن امیروں سے بھر جائے تب بھی وہ ایک پاک باطن غریب کے برابر نہیں ہو سکتے۔

(مشکوۃ، ۲:۶۶۴، حدیث ۵۴۳۶)

ایک غریب عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، ایک رات وہ فوت ہوگئی۔ لوگوں نے آپؐ کے آرام کے پیش نظر آپؐ کو اطلاع دیئے بغیر اسے دفن کر دیا جب آپؐ کو یہ معلوم ہوا تو خفا ہوئے اور اس کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کے لئے دعا فرمائی۔

(النسائی، السنن، کتاب الجنائز؛ البخاری، ۱:۳۳۵)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد کفار سے کئی جنگیں لڑیں۔ چنانچہ ان جنگوں میں جو بھی مال غنیمت حاصل ہوتا وہ سب مسکینوں میں اور ضرورت مندوں میں بانٹ دیا کرتے۔ اور اسی طرح اسلامی مملکت کے گورنروں کو بھی ہدایت فرماتے کہ وہ اپنی رعایا کا خیال رکھیں۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ جب عرب کے علاقے بحرین کا رئیس مسلمان ہوا تو

آپؐ نے اسے ہدایت بھجوائی کہ:

افْرِضْ علیٰ کلِّ رجُلٍ لیس له ارضٌ اربعة دراهِمَ وعباءَةً

(زرقانی بحوالہ ابن مندہ جلد ۳ صفحہ ۳۵۲)

یعنی جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے اُن میں سے ہر شخص کو ملکی خزانہ میں سے چار درہم اور لباس گزارہ کے لئے دیا جائے۔

اسی طرح سوشل اجتماعوں میں برادرانہ اختلاط کی تعلیم بھی اسلام نے دی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمدنی تعلقات کے سب سے بڑے ذریعہ اور سب سے بڑے میدان یعنی آپس کی دعوتوں اور کھانے پینے کی ملاقاتوں وغیرہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

شرُّ الطعامِ طعامُ الولیمةِ یُدعیٰ لها الاغنیاء ویُترکُ الفقراء ومن ترك الدعوة فقد عصی الله ورسولهُ

(بخاری کتاب النکاح)

سب سے بُری اور سب سے زیادہ قابل نفرت دعوت وہ دعوت ہے جس میں صرف امیر بلائے جائیں اور غریبوں کو نہ بلایا جائے اور جو شخص کسی بھائی کی دعوت کا انکار کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے

اسی طرح رسول کریمؐ نے خود بھی مسلمانوں کے سامنے ایسا قابل تقلید اُسوہ چھوڑا ہے کہ اگر اس کی پیروی کی جائے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ معاشرہ میں جوئی غریب یا مسکین ایسا رہے جو کھانے کے لئے در در بھٹکتا پھرے لیکن کوئی اسے کھانا نہ دے۔ آنحضرتؐ خود بھی غرباء و مساکین کو کھانا کھلایا کرتا تھے اور اگر کوئی غریب شخص آپؐ کی دعوت کرتا یا کوئی چیز خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو بطور تحفہ آپؐ کو دیتا تو آپؐ ضرور اسے قبول فرماتے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

لَوْ دُعِيْتُ اِلیٰ کُراعٍ لَاَجَبْتُ

(بخاری کتاب النکاح)

یعنی اگر کوئی غریب شخص کسی بکری یا بھیڑ کا ایک پایہ پکا کر بھی مجھے دعوت میں بلائے تو میں اُس کی دعوت کو ضرور قبول کروں گا۔

یاد رہے کہ اس حدیث میں جو کُراع کا لفظ ہے اسکے معنی پائے کے نچلے حصہ کے ہیں جو ٹخنوں

سے نیچے ہوتا ہو۔(اقرب الموارد) اور یقیناوہ ایک ادنیٰ قسم کی غذا ہے اورعربوں کی روایت سے ثابت ہے کہ قدیم زمانہ میں عرب لوگ پائے کو اچھی غذا نہیں سمجھتے تھے چنانچہ عربوں میں مشہور محاورہ تھا کہ:۔

لَا تُطْعِمِ الْعَبْدَ الْكُرَاعَ فَيَطْمَعُ فِي النَّدَاعِ

(تاج العروس)

یعنی اپنے غلام کو پایہ بھی کھانے کو نہ دو ورنہ وہ اس سے اوپر نظر اٹھا کر دست وران کے گوشت کی بھی طمع کرنے لگے گا۔

آپؐ کو غرباء کی تکالیف کا اتنا احساس رہتا کہ احادیث میں آتا ہے کہ جب رمضان کا مہینہ آتا تو آپؐ اتنی کثرت کے ساتھ غرباء میں صدقات تقسیم فرماتے کہ اُسے اگر ایک تیز ہوا سے مشابہت دی جائے تو یہ بھی ایک ناقص مشابہت ہوگی۔اسی طرح ایک دفعہ آپؐ کے پاس صدقہ کی کچھ کھجوریں آئیں۔حضرت امام حسنؓ نے جو اُس وقت چھوٹے بچے تھے،ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔آپؐ نے دیکھا تو فوراً اُن کے منہ میں انگلی ڈال کر وہ کھجور نکال کر باہر پھینک دی اور فرمایا یہ ہمارا حق نہیں۔یہ خدا کے غریب بندوں کا حق ہے۔(بخاری)

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اپنا ذاتی اُسوہ پیش کر کے مسلمانوں کو تحریک فرمائی ہے کہ خواہ دعوت کرنے والا کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو اسکی دعوت کو غربت کی وجہ سے ردّ نہ کرو ورنہ یادرکھو تمہارے معاشرہ میں ایسا رخنہ پیدا ہو جائے گا جو آہستہ آہستہ سب کو تباہ کر کے رکھ دیگا۔

اسلام نے ان اخلاقی تعلیمات کے ساتھ مسکینوں اور محتاجوں کی فلاح و بہبود کی مختلف صورتیں بھی رکھی ہیں:۔

۔بعض عبادات میں نقص یا کمی کی تلافی کے لئے فدیہ رکھا گیا ہے اور اسکی ایک صورت متعین تعداد میں مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

۔اسی طرح بعض غلطیوں کا کفارہ بھی مسکینوں کو کھانا کھلانا رکھا گیا ہے۔

۔مالِ غنیمت میں مسکینوں اور محتاجوں کا حصہ رکھا گیا ہے۔

(الانفال:۴۲)

۔مصارفِ زکوٰۃ کی جو مدّات بیان ہوئی ہیں ان میں سب سے پہلی مد فقراء اور مساکین کی ہے۔

(التوبۃ:۶۱)

اسلام کی اس خوبصورت تعلیم کا کسی دوسرے سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دیگر مذاہب میں غرباء کی مدد کا اس قدر تفصیلی ذکر مفقود ہے۔مثلاً توریت میں غریبوں کی مدد کرنا کا بیان تو ہے مگر یہ حکم بنی اسرائیل کو صرف اپنے ہم قوم بھائیوں کے متعلق دیا گیا ہے کہ تم اپنے اسرائیلی بھائیوں کی مدد کرو۔چنانچہ توریت میں لکھا ہے کہ:

''جب تم اس ملک میں رہو گے جسے خداوند خدا تمہیں دے رہا ہے تب تمہارے لوگوں میں کوئی بھی غریب شخص ہوسکتا ہے۔تمہیں اس غریب شخص کے لیے اپنے دل کو سخت نہیں کرنا چاہئے اپنی مٹھی کو کسنا نہیں چاہئے۔اسکے بجائے اپنے ہاتھوں کو کھولو اور اس آدمی کو جن چیزوں کی بھی ضرورت ہو قرض دو۔''

(استثناء باب ۱۵ آیت ۷ تا ۸)

نیز لکھا ہے کہ:۔''غریب کو بنا کسی ہچکچاہٹ کے دو اور اُسے دینے کا بُرا نہ مانو کیونکہ خداوند تمہارا خدا اُس اچھے کام کے لئے تمہیں برکت دی گا وہ تمہارے سبھی کاموں اور جو کچھ بھی تم کرو گے اس میں تمہاری مدد کریگا۔''

(استثناء باب ۱۵ آیت ۱۰)

اسلام نے جہاں غرباء کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے وہیں غرباء کو بھی تلقین کی ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور دوسروں کے مال پر نظر رکھنے کی بجائے جدو جہد اور محنت کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ: دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

(مسلم)

پس خلاصہ کلام یہ کہ ناداروں اور مسکینوں کی معاشی لحاظ سے اوپر اٹھانے کے لئے جائز حدود میں مسلمان جو بھی کوشش کرے اور ریاست جو بھی اقدامات کرے وہ سب اسلامی تعلیم اور اسکی روح کے عین مطابق ہوں گے۔

۷۔ضعیفوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق

جو شخص جسمانی طور پر کمزور ہوتا ہے وہ معاشی دوڑ دھوپ میں بالعموم پیچھے رہ جاتا ہے اور دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔کوئی بھی دلی خوشی سے اسکی خدمت نہیں کرتا بلکہ اسے ایک طرح کا بوجھ سمجھتا ہے۔اسلام نے اس ذہن کی اصلاح کی ہے اور بتایا ہے کہ تمہیں یہاں جو کچھ بھی ملتا ہے وہ انہی کمزوروں اور لاچاروں کے طفیل میں ملتا ہے۔اسلئے ان پر احسان مت جتاؤ بلکہ خدا کا شکر کرو کہ اس نے ان کی خدمت کی توفیق بخشی۔اللہ تعالیٰ اصلاً ان کمزوروں کو رزق پہنچانا چاہتا ہے لیکن اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت اس نے تمہیں اس کا واسطہ بنایا ہے۔اگر تم نے اس میں غفلت اور کوتاہی کی تو درمیان سے تمہارا واسطہ ختم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ پھر دوسروں کے ذریعہ یہ خدمت لے گا اور تم اس کے اجر سے محروم رہو گے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سخاوت اور شجاعت میں بہت مشہور تھے۔ان کے صاحبزادے مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہیں یہ احساس ہوا کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کو خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ ان سے بہتر ہیں (غالباً ان کو یہ خیال بھی ہوا کہ ان کی خدمات کی وجہ سے مال غنیمت میں ان کا حق دوسروں سے زیادہ ہے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هل ترزقون و تنصرون الا بضعفائكم

(بخاری کتاب الجهاد، باب من استعان علی الضعفاء)

تمہیں تمہارے ضعیفوں ہی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث ہے کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

ابغونی الضعفاء فانما ترزقون و تنصرون بضعفائکم

(ابوداؤد کتاب الجھاد۔نسائی کتاب الجھاد)

ضعیفوں کو تلاش کر کے میرے پاس لاؤ اس لیے کہ تمہیں اپنے ضعیفوں ہی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ ضعیفوں کو تلاش کرو تا کہ ان کا حق ادا کیا جائے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ان کو کھلا پلا رہے ہو بلکہ یہ سمجھو کہ تمہیں جو کچھ بھی ملتا ہے ان ہی کی وجہ سے ملتا ہے۔

یہ ایسی حسین تعلیم ہے جس کا وجود اور کسی بھی مذہب میں نہیں ہے۔ رسول اللہؐ خود بھی ہر وقت ضعیفوں کی خبر گیری فرماتے رہتے تھے۔ اسلئے آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں ضعیفوں اور لاچاروں میں مل سکتا ہوں، مجھے ڈھونڈنا ہو تو امیروں اور رئیسوں خوشحال لوگوں کے درمیان نہیں بلکہ انہی کے درمیان ڈھونڈو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قسم کا ذہن پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیدا ہو جائے تو انسان کمزوروں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کو بخشش اور احسان نہیں سمجھے گا بلکہ اپنا ایک فرض تصور کرے گا۔ ان کا حق ادا کرنے کے باوجود اسے ہمیشہ اپنی کوتاہی کا احساس دامن گیر رہے گا۔ قرآن کریم نے اہل ایمان کا ایک اعلیٰ وصف یہ بیان کیا ہے کہ انسان کے مال میں سائل اور محروم کا حصہ ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۰﴾

(الذاریات:20)

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں حق ہوتا ہے سائل کا اور محروم کا۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۵﴾
لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۶﴾

(المعراج:25،26)

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا متعین حق ہوتا ہے۔

سائل سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت بیان کرتا اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جو وسائل حیات سے محروم ہونے کے باوجود دست سوال دراز نہیں کرتا سائل اور محروم میں بوڑھے، بیمار، اپاہج، معزور، لاوارث بچے اور اس طرح کے سب ہی لوگ آ جاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہوں گے جو اپنی ضروریات بیان کریں گے اور مدد کے طالب ہوں گے اور وہ بھی ہوں گے جو اپنی غربت اور افلاس کا ذکر کرنا اور مدد طلب کرنا پسند نہ کریں گے ایک مومن کے مال میں ان سب کا لازماً حصہ ہونا چاہئے اور ان کی احتیاج اور ضرورت اور محرومی کو ختم کرنا حکومت کی بھی ذمہ داری ہے۔

۸۔ بیماروں سے حسن سلوک

حضرت محمد مصطفیؐ کو بیماروں کو بڑا خیال رہتا تھا اور اگر کسی دوست یا عزیز کی بیماری کی خبر ملتی تو اسکی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے (بخاری، ۴:۴۲)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک ضروری حق بیمار پرسی ہے۔ گویا حقوق العباد میں سے ایک اہم امر یہ بھی ہے کہ بیمار کی دلجوئی کے لئے اس کی عیادت کی جائے۔ آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی کی عیادت کے لئے جاتا ہے تو وہ جتنی دیر تک اس کے پاس بیٹھتا ہے، جنت کے پھلوں کو چننے میں مصروف رہتا ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''جو مسلمان کسی مسلمان کی بیمار پرسی کرتا ہے سارا دن ستر ہزار فرشتے اس کی مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔''

(ترمذی۔ عیادۃ المریض)

اسی طرح بیمار پُرسی کی اہمیت اور ضرورت ایک اور حدیث سے واضح ہو جاتی ہے۔ اور وہ حدیث یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی بیمار کی عیادت اور بیمار پُرسی کے لئے جاتا ہے تو آسمان سے پکارنے والا (فرشتہ) آواز دیتا ہے کہ تو نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ تیرا اس

راستہ میں چلنا مبارک ہوا اور تُو نے اس ذریعہ سے جنت میں اپنا ٹھکانہ بنالیا ہے۔

(ابن ماجہ)

آنحضرتؐ کا یہ طریق تھا کہ جب بھی آپ کسی مریض کی عیادت کے لئے جاتے تو اس کو تسلی اور تشفی دیتے اور عموماً یہ فرماتے لا باس طھور انشاء اللہ اور مریض کی صحت یابی کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ مریض سے پوچھتے کہ کسی چیز کو اس کا دل چاہتا ہے اور اگر وہ مضر نہ ہوتی تو انتظام فرماتے تھے۔ آپؐ کے اسوہ کے بارے میں ذکر ہے:۔

"کان النبی ﷺ احسن شیئٍ عیادۃ المریض"

یعنی آنحضورؐ مریض کی عیادت کا بہت اچھے طرح خیال رکھتے (بخاری)

نیز ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ جب آپؐ عیادت کے لئے جاتے تو بیماروں کو تسلی دیتے۔ ان کا حوصلہ بڑھاتے اور فرماتے: اے اللہ کے بندو! اپنی بیماریوں کا علاج کراؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کا علاج مقرر کیا ہے۔ (ترمذی، حدیث ۲۰۳۸) آپؐ خود بھی لوگوں کو مختلف سادہ علاج بتلایا کرتے تھے۔

اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ کوئی انسان خواہ کسی بھی مذہب وملت سے اسکا تعلق ہو اگر وہ بیمار ہے تو ضرور انسانیت کے ناتے اسکی عیادت کو جانا چاہئے۔ حضورؐ بیماروں کی عیادت میں دوست، دشمن، مومن، کافر، امیر وغریب کی کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ذکر ہے کہ آپؐ ایک یہودی لڑکے کی عیادت کو گئے وہ مرض الموت میں مبتلا تھا۔ آپؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔

(بخاری باب عیادت المشرک)

اور بیماری خواہ تھوڑی ہوتی یا زیادہ، نیز فاصلہ پیدل جانے والا ہوتا یا سواری پر چڑھ کر جانا ہوتا، آپؐ اس اہتمام میں فرق نہ دیتے۔ (بخاری باب ۴)

حضورؐ بیماروں سے نفرت کرنے اور ان کو الگ تھلگ رکھنے کے بھی مخالف تھے، چنانچہ بعض اوقات آپؐ بیمار کے ساتھ شریک ہو کر کھانا تناول فرماتے تھے۔ (ترمذی حدیث ۱۸۱۷)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ: کسی مریض کی موت کا وقت نہ آیا ہو تو اس کے پاس یہ دعا سات

مرتبہ پڑھنے سے اسے شفا ہو جاتی ہے:

أَسْأَلُ اللهَ رَبَّ العَرشِ العظيمِ أَنْ يُّشْفِيَكَ

(ابوداؤد، حدیث ۳۱۰۶)

یعنی میں اللہ سے جو عرشِ عظیم کا رب ہے، دعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے شفا دے۔

۹۔معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

کمزور افراد اور طبقات کے ذیل میں معذور (Handicap) بھی آتے ہیں۔اسلام نے ان کے حقوق کے سلسلے میں بھی کافی ہدایات دی ہیں۔جو لوگ اس دنیا میں صحیح اور تندرست وتوانا جسم سے محروم ہیں اسلام نے ان کے اندر ہمت وحوصلہ پیدا کیا ہے اور احکام شریعت میں ان کی رعایت کی ہے۔اسی طرح اس نے اُن لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جسمانی اور دماغی نعمتوں سے بہرہ یاب ہیں، ان کی خدمت، دلجوئی اور ہمدردی کی بھی تلقین کی ہے۔سب سے پہلے تو اسلام نے خود معذور کو صبر کی تلقین کی ہے اور انہیں یہ بتایا ہے کہ یہ معذوری ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امتحان ہے۔صبر کرو گے تو اجر پاؤ گے۔جزع فزع اور شکوہ شکایت بے سود ہے۔خدا کے فیصلہ کو خوش دلی سے قبول کرنا انسان کو اس کے انعام واکرام کا حق دار بناتا ہے۔حدیث قدسی ہے کہ:

اذا ابتليتُ عبدی بحبيبتيه فصبر عوَّضته منهما الجنة يريد عينيه

(بخاری کتاب المرضیٰ، باب فضل من ذہب بصرہ)

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے بندے کو اسکی دو محبوب چیزوں کے ذریعہ آزمائش میں ڈالوں اور وہ صبر کرے تو میں ان کے عوض اسے جنت عطا کروں گا۔دو محبوب چیزوں سے آپؐ کی مراد آنکھیں ہیں۔

اسی طرح حدیث میں ایک واقع آتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت کو مرگی کی شکایت تھی اور جب دورہ پڑتا تو اسے کپڑوں کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔اس نے رسول اللہؐ سے دعا کی درخواست کی۔آپؐ نے فرمایا تم چاہو تو میں دعا کروں چاہو تو صبر کرو اللہ تعالیٰ اس کے عوض تمہیں جنت عطا فرمائے گا۔اس نے کہا تب تو میں صبر ہی کروں گی البتہ آپ

دعا فرمائیے کہ دورہ کی حالت میں میری بے ستری نہ ہو۔آپؐ نے اس کے لئے دعا فرمائی۔
(بخاری کتاب المرضیٰ، باب فضل من یصرع من الریح۔مسلم کتاب البر والصلۃ)

آپؐ نے اسکی دعا کی درخواست تو ردّ نہیں کی لیکن صبر کی فضیلت بیان کی اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ ایک معذور یہ دعا تو کرسکتا ہے اور کروا بھی سکتا ہے کہ اللہ اسے معذوری سے نجات دے ،آگے اللہ کو اسکے حق میں بہتر سمجھنے کریگا۔اسے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ میں راضی رہنا چاہیئے۔اسی طرح اور بھی بہت ساری احادیث ہیں جن میں صبر کی تلقین کے ساتھ دعا کا بھی ثبوت ہے۔ایک مومن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ راضی بہ رضائے الٰہی رہتا ہے۔

ایک معذور کو یہ احساس پریشان کرسکتا ہے کہ دین کی خدمت دوسرے لوگوں کی طرح نہیں کر پارہا۔اسلام نے اسے اطمینان دلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک پر اسکی طاقت کے لحاظ سے بوجھ ڈالا ہے۔جیسا کہ قرآنِ کریم میں احکام جہاد کے ذیل میں معذور کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے یہ ارشاد ہے کہ:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾
(الفتح:17)

ترجمہ: نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے، نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے (اگر وہ جہاد میں شرکت نہ کریں) اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے جنتوں میں داخل فرمائے گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو روگردانی کریگا اسے وہ دردناک عذاب دی گا۔

اسی طرح سورۃ النساء آیت ۹۶ میں بھی اللہ تعالیٰ نے معذوروں کو جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے ان آیات میں یہ اشارہ ہے کہ اگر کسے کے اندر خلوص کے ساتھ جہاد کا جذبہ ہو اور وہ اپنی معذوری کے باعث اس میں حصہ نہ لے پائے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی مجاہدین کا ثواب عطا فرمائے گا۔ایک حدیث میں یہ بات کھول کو بیان کی گئی ہے۔حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں فرمایا:

ان اقواما خلفنا ما سلکنا شعبا ولا وادیا الا وھم معنا حبسھم العذر

(بخاری کتاب الجھاد، باب من حبسہ العذر من الغذو)

بے شک ہمارے پیچھے کچھ لوگ رہ گئے ہیں ہم جس گھاٹی اور وادی میں بھی چلیں وہ اپنی نیت کی وجہ سے ہمارے ساتھ ہیں۔ان کو معذوری نے روک رکھا ہے۔

اسکے علاوہ اور بھی بہت ساری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں شریعت نے معذوروں کو احکام شریعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے یا ان کے ساتھ رعایت کی ہے۔

اسلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ معذوروں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہے اور ان کی صلاحیت کے مطابق ان سے خدمت لیتا ہے۔اس طرح معذوروں کی بہت ہمت افزائی ہوتی ہے۔مثلاً اسلام میں اذان دینے کی بڑی اہمیت اور ثواب ہے۔اس کے لئے ذی صلاحیت اور اصحابِ تقویٰ کے انتخاب کا حکم ہے۔اس پس منظر میں یہ دیکھئے کہ قرونِ اولیٰ میں دو مؤذن حضورؐ نے مقرر فرمائے تھے۔ان میں سے ایک حضرت بلالؓ تھے جو ایک آزاد کردہ غلام تھے اور دوسرے عمرو ابن مکتومؓ تھے جو کہ نابینا تھے۔

(مسلم کتاب الصلوٰۃ، باب جواز اذان الاعمیٰ)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام غلاموں اور معذوروں کو کیا مقام دیتا ہے اور ان کی کس قدر عزت افزائی کرتا ہے۔قارئین اس سے بھی بڑا واقع تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن جنگ تبوک کے لئے روانہ ہوئے تو آپؐ نے عمرو ابن مکتومؓ ہی کو امامت کے لئے اپنا نائب اور جانشین مقرر فرمایا۔

(ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ الاعمیٰ)

اسی طرح اور بھی بہت سارے واقعات احادیث میں موجود ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ آپؐ معذوروں کی کس قدر حوصلہ افزائی فرامایا کرتے تھے۔اسلام کا یہ بھی تصور ہے کہ موذور اپنی معذوری کے باوجود کوئی بھی دینی کام انجام دیتا ہے تو اس کا اجر وثواب بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اسے زیادہ محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔اس طرح اسلام نے

معذوروں اور بیماروں کے اندر ایک نئی طاقت اور توانائی پیدا کر دی اور انہوں نے نڑے جوش اور ولولے سے دینی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ عمرو ابن مکتومؓ نابینا ہونے کے باوجود جنگ قادسیہ میں شامل تھے اور اسی میں شہادت بھی پائی۔

اسلام نے جہاں معذوروں کے اندر خود اعتمادی اور استقامت پیدا کی وہیں معاشرے پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد کیں۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ معذور کو عزت کا مقام دیا جائے اور انہیں فروتر نہ سمجھا جائے۔ اسلام نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار ظاہری وجاہت، صحت وتندرستی اور دولت نہیں بلکہ تقویٰ وطہارت ہے۔ اسی طرح اسلام نے معاشرے کو معذوروں کی مدد اور تعاون پر ابھارا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اسلام نے حکومت کو بھی یہ تاکید کی ہے کہ معذور لوگوں کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ معذوروں کی مدد کی بہت سی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ ان میں سے ایک مالی مدد بھی ہے۔ نیز یہ بھی کہ اسکی دلجوئی کی جائے اور بدسلوکی نہ کی جائے۔ معذور کے ساتھ بدسلوکی کرنا اور انہیں پریشان کرنا خدا کی لعنت کا سبب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

لعن اللہ من کمہ الاعمیٰ عن السبیل

(مسند احمد ۱/۳۰۹)

اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جس نے ایک اندھے کو راستے سے بھٹکایا۔

جسمانی معذوری سے زیادہ سنگین اور تکلیف دہ دماغی معذوری ہوتی ہے۔ اسکی انتہائی شکل جنون اور پاگل پن ہے جس میں انسان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ اسلام نے بھی ایسے معذور شخص (پاگل) کو تمام شرعی ذمہ داریوں سے مستثنٰی قرار دیا ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے پاگل کو غیر مکلف قرار دیا ہے یعنی اسکے اعمال کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔

(بخاری کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق۔ ابوداؤد کتاب الحدود)

اس طرح سے اسلام نے معاشرہ کے کمزور طبقات کو وہ حقوق فراہم کئے ہیں جو کسی اور مذہب یا معاشرہ نے انہیں نہیں دئے تھے۔ اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا بلکہ یہ ایک ثابت

شدہ امر ہے۔ چنانچہ اسلام سے قبل دنیا میں صرف یہودی مذہب ہی ایک ایسا مزہب تھا جو اپنے زمانہ کے لحاظ سے تفصیلی شریعت کا حامل تھا اور اس کے ماننے والے بھی بکثرت دنیا میں موجود تھے۔ مگر یہودیت نے جو معذوروں کے متعلق تعلیم دی ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اس آیت سے لگایا جاسکتا ہے کہ:۔

''خداوند نے موسیٰ سے کہا، ہارون سے کہو اگر اس کی نسلوں میں سے کسی بچہ کا جسمانی عیب ہے تو اُسے خداوند کو خاص روٹی پیش نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی شخص کا کوئی عیب ہو تو اُسے میرے نزدیک نہیں آنا چاہئے۔ یہ لوگ کاہن کے طور پر خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اندھا ہنگڑا، بگڑی شکل وصورت والا، زائدالاعضاء والا، کُبڑا، بونا، وہ جس کی آنکھ کی روشنی کمزور ہو، وہ جن کو کھجلی یا دوسرے چمڑے کی بیماری ہو اور وہ آدمی جس کے خصیئے پچکے ہوں۔ اگر ہارون کی نسلوں میں سے کسی کو کوئی عیب ہو تو وہ تحفے یا اپنے خدا کا خاص روٹی خداوند کو پیش کرنے کے لئے نہیں آسکتا۔ وہ شخص خدا کا مقدس کھانا کھا سکتا ہے۔ وہ سب سے مقدس روٹی بھی کھا سکتا ہے۔ لیکن وہ مقدس ترین جگہ میں پردہ سے ہو کر نہیں جا سکتا اور وہ قربان گاہ کے نزدیک نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اُس میں عیب ہے اور اُسے میرے مقدس جگہ کی بے حرمتی نہیں کرنی چاہئے۔''

(احبار باب ۲۱ آیت ۱۶ تا ۲۳)

یہ ہے یہودی مذہب کی تعلیم جس کے مطابق معذور یا بیمار مقدس رسوم اور مقدم مقامات سے دور رکھا جانا چاہئے۔ لیکن اسلام ایسی چھوٹی سوچ نہیں رکھتا۔ ان آیات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام سے قبل اندھوں اور لنگڑوں اور معذوروں اور بیماروں کو کس حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور کس طرح انہیں ناپاک قرار دے کر معاشرہ کا ایک ناکارہ عضو قرار دیا جاتا تھا۔ کیا اس تعلیم کی موجودگی میں کوئی بھی بیمار یا معذور اس پر خوش ہوسکتا ہے؟ کیا یہ تعلیم اسلام کی اس تعلیم کا مقابلہ کرسکتی ہے کہ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؟ یقیناً ہر عقلمند کہے گا کہ ہرگز نہیں۔

اسلامی شریعت کے نکاح میں فریقین کے حقوق

اسلام کی تعلیمات کے مطابق مرد اور عورت کے حقوق برابر ہیں اور دونوں فریق کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی کوشش اور مجاہدہ کے مطابق درجات اور اجر کا وعدہ ہے۔ اسلام دیگر مذاہب کی طرح رہبانیت کا قائل نہیں ہے بلکہ ہر انسان کو شادی کرنے اور ازدواجی زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے نیز انہیں اس زندگی کے متعلق احکامات بھی عطا کرتا ہے۔اسی طرح اسلام شادی کی فضول رسومات خصوصاً دہیج وغیرہ کا مخالف ہے اور ان سے سختی سے روکتا ہے۔ دیگر تمام مذاہب پر نظر ڈالی جائے تو وہ رہبانیت کو کسی نہ کسی رنگ میں فروغ دیتے ہیں اور انسان کے نیک بننے اور اللہ تعالیٰ سے پختہ تعلق پیدا کرنے کے لئے اس بات کو ضروری خیال کرتے ہیں کہ انسان، خواہ مرد ہو یا عورت وہ تجرّد کی زندگی گزارے اور شادی نہ کرے۔ مثلاً عیسائیوں کو ہی لے لیں، ان کے چرچ میں جتنی بھی نن ہوتی ہیں وہ سب مجرد ہوتی ہیں اور اسی طرح اکثر پادری بھی۔ اور ایسا ہو بھی کیوں نہ جب ان کی مقدس کتب میں یہ لکھا ہے کہ:۔

''شادی کرنے سے شادی نہ کرنا بہتر ہے۔''

(کرنتھیوں ۲۹-۲۸/۷)

نیز ہندو مذہب کے پیرو کا بھی اور خصوصاً بدھ مذہب کے ماننے والے جنگلوں میں رہ کر مجرد زندگی گزارنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں اور شادی نہیں کر کے اپنے آپ کو پاک وصاف خیال کرتے ہیں۔ ہندو مذہب کی مقدس کتب میں تجرّد کے ساتھ زندگی گزارنے کو ازدواجی زندگی سے بہتر خیال کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:

''بالکل شادی نہ کرنا اچھا ہے۔ ورنہ ۴۰ سال کی عمر میں۔

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش باب ۳ دفعہ ۳۵-۳۴)

لیکن اسلام اس کے خلاف ہے اور نکاح کرنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ تعلیم انسان کی فطرت کے بالکل موافق ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ

(المسبوط سرخی صفحہ ۱۱۱)

یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اِنَّ الرَّهْبَانِيَّةَ لَمْ تُكْتَبْ عَلَيْنَا

(مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۲۶)

یعنی یقیناً رہبانیت کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔

اسلام دینی معاملات میں میانہ روی کو پسند کرتا ہے۔اسلئے اس نے تجرد کی زندگی گزارنے سے منع کیا ہے۔ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرتؐ سے شادی نہ کرنے اور صرف عبادت کرتے رہنے کی اجازت ماگی تو آپؐ نے سختی سے منع فرمایا اور آپؐ نے خود بھی نکاح کر کے مسلمانوں کے لئے اسوہ حسنہ چھوڑا ہے۔چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ:۔

اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي

(ابن ماجہ کتاب النکاح باب فضل النکاح صفحہ ۱۳۲)

یعنی نکاح میری سنت ہے۔

شادی کرنے کا حق تو تمام مذاہب میں موجود ہے مگر اس کی تفصیل صرف اسلام ہی نے بیان کی ہے۔حتی کہ آنحضرتؐ نے یہ تک بتادیا کہ شادی کرنے کے لئے عورت کے کن کن اوصاف کو مدنظر رکھنا چاہئے۔چنانچہ ہمارے پیارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

تُنكَحُ المرأةُ لِاَربعٍ لمالها و لحسبها و لجمالها و لدينها فاظفرْ بذاتِ الدين تَرِبتْ يَدَاكَ

(بخاری کتاب النکاح)

یعنی ایک عورت کے ساتھ چار خیالات کی بناء پر شادی کی جاتی ہے۔یا تو اسکی دولت کی وجہ سے یا اسکے قوم وخاندان کی وجہ سے اور یا حسن و جمال کی وجہ سے اور یا اخلاقی اور دینی حالت کی بناء پر اس کا انتخاب کیا جاتا ہے لیکن اے مردِ مومن! تو ہمیشہ بیوی کا انتخاب اسکے دینی اور اخلاقی بناء پر کیا کر اور ذاتی اوصاف اور ذاتی نیکی کے پہلو کو ترجیح دیا کرورنہ یادرکھ کہ تیرے ہاتھ

ہمیشہ خاک آلود رہیں گے۔

ازدوجی زندگی ہے مژدہ امن وسلام
اس کا مقصد ارتقاء، انسانیت کا احترم

نیز دیگر مذاہب میں شادی بیاہ سے متعلق ایسی بیہودہ تعلیمات کا وجود بھی پایا جاتا ہے جو کہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہیں اور ایک حسین معاشرہ کے قیام کی راہ میں بڑی روک بھی ہیں۔ انکے نزدیک تو گویا شادی ایک کھیل ہے یا کوئی تماشا۔ مثال کے طور پر بائبل میں ہے کہ:۔

’’اگر کسی آدمی کو کنواری لڑکی مل جائے اور وہ اسے پکڑ کر صحبت کرے تو وہ مرد لڑکی کے باپ کو چاندی کی پچاس مثقال دے اور وہ لڑکی اس کی بیوی بنے اور وہ اسے زندگی بھر طلاق نہ دینے پائے۔‘‘

(استثناء باب 22 آیت: 28-29)

ایسی تعلیم ہرگز نکاح کے حقیقی اغراض کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ اس سے تو یہ سبق ہی ملتا ہے کہ شادی بیاہ محض جنسی تسکین کا ذریعہ ہے۔ لیکن اسلام میں ایسی تعلیم نہیں ہے بلکہ نکاح کی اصل غرض عفت حاصل کرنا بیان کیا گیا ہے۔

نکاح کے موقع پر خطبہ نکاح میں سورۃ النساء کی آیت نمبر ۲ کا پڑھا جانا مسلمانوں میں مروّج ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے حقوق اور دونوں خاندانوں کے تعلقات میں تقویٰ سے کام لینے کی ہدایت ہے۔

اسلام میں نکاح کے نتیجہ میں جو حقوق دوطرفہ طور پر حاصل ہوتے ہیں وہ حقِ مساکنت، حق مقاربت، حقِ ثبوت نسب، حقِ توارث اور حرمت مصاہرت ہیں۔ یعنی میاں بیوی دونوں ایک جگہ اکٹھے رہنے کا حق رکھتے ہیں کسی دوسرے کو ان دونوں پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح دونوں حصہ کے مطابق ایک دوسرے کے ترکہ میں حقدار ہوں گے۔ دونوں کے لئے حرمت مصاہرت ہوگی یعنی مصاہرت کی بناء پر واقع ہونے والے ایسے رشتے حرام ہوں گے جن

کا ذکر قرآن کریم میں سورۃ النساء آیت ۲۴، ۲۵ میں آیا ہے۔

بیوی کے حقوق

۔نکاح صحیح کے نتیجہ میں بیوی مہر کی حقدار ہو جاتی ہے اور خاوند پر اسکی ادائیگی واجب ہے

حق مہر کیا ہے؟

مہر اُس مالی منفعت کا نام ہے جو نکاح کے نتیجہ میں خاوند کی طرف سے بیوی کو واجب الادا ہے اور جس پر بیوی کلی تصرف کا حق رکھتی ہے۔

(فقہ احمدیہ حصہ دوم صفحہ ۴۳)

غرض اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہر عورت کا یہ حق ہے کہ وہ نکاح سے قبل یا بعد میں اپنے خاوند سے مہر کی رقم لے سکتی ہے۔ یہ رقم خاوند کی استطاعت کے مطابق ہوتی ہے اور اسکا ادا کرنا خاوند پر ہر صورت لازم آتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مہر بیوی کا حق ہے جیسا کہ اس کے نام ہی سے واضح ہو جاتا ہے ''حق مہر''۔ بیوی ہی اس کی مالک ہے وہ جس طرح چاہے اسے اپنے مَصرف میں لاسکتی ہے خاوند کی وفات پر اگر مہر واجب الادا ہو تو دیگر قرضوں کی طرح حق مہر کی ادائیگی بھی خاوند کے ترکہ سے لازمی ہے۔ نکاح کی صحت کے لئے پہلے سے حق مہر مقرر کرنا ضروری نہیں جیسا کہ قرآن شریف کی اس آیت سے ظاہر ہے:۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾

(سورۃ البقرہ آیت 237)

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت بھی طلاق دے دو جبکہ تم نے اسکو چھوا تک نہ ہو یا مہر نہ مقرر کیا ہو البتہ رخصتی ہو جانے کے بعد پورا حق مہر خود بخود واجب ہو جاتا ہے اور اگر حق مہر متعیّن نہ ہو تو مہر کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے خواہ نکاح کے وقت مہر کا ذکر آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ اس لحاظ سے یہ کہا

جا سکتا ہے کہ اسلام میں کوئی نکاح بغیر ''حق مہر'' کے نہیں۔

چونکہ عورت مہر کی کلیۃً حقدار ہے اور یہ نکاح کے ساتھ ہی خاوند پر واجب ہو جاتا ہے۔ اسلئے اسلامی تعلیمات کے اعتبار سے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ کر سکتی ہے یہاں تک کہ ائمہ اور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائً جبکہ ابھی تعلقاتِ زوجیت قائم نہ ہوئے ہوں عورت کو اختیار ہے کہ وہ خاوند کو تا ادائیگی مہر تعلقات زوجیت قائم کرنے سے روک دے۔ اور اگر تعلقات زوجیت قائم ہو بھی گئے ہوں تو بھی فقہ کے مشہور و معروف امام، امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کا حق باقی رہتا ہے کہ وہ تا ادائیگی مہر حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے انکار کر دے۔

ایک پہلو مہر کی ادائیگی کا یہ بھی ہے کہ اگر رخصتانہ سے قبل طلاق دے دی جائے تو عورت نصف مہر مقررہ کی حقدار ہوگی یعنی اس صورت میں بھی اس کا حق تلف نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسلام نے اسے نصف مہر کا حق دیا ہے۔ لیکن ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ اس صورت میں اپنا حق چھوڑنا زیادہ افضل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۸﴾

(سورۃ البقرہ آیت 238)

ترجمہ: اگر تم انہیں قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو لیکن مہر مقرر کر دیا ہو طلاق دے دو تو اس صورت میں جو مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا ان کے سپرد کرنا ہوگا۔ سوائے اس کے کہ وہ (یعنی عورتیں) معاف کر دیں یا وہ (شخص) معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا باندھنا ہو۔ اور تمہارا معاف کر دینا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور تم آپس میں (معاملہ کرتے وقت) احسان کو نہ چھوڑا کرو۔ یقیناً اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُسے خوب دیکھنے والا ہے۔

اس آیت کے متعلق سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمودؓ خلیفۃ المسیح الثانی اپنی پُر معارف تفسیر میں بیان فرماتے ہیں کہ:۔

وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی میں مردعورت ولی سب مراد ہیں۔اور یہ قاعدہ بتایا گیا ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنا حق چھوڑنا بہ نسبت اپنا حق طلب کرنے کے زیادہ افضل ہوتا ہے اور تقویٰ کا یہی تقاضا ہوتا ہے۔مگر افسوس ہے کہ لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے اور ہمیشہ اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کرتے اور اس پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۵۳۶)

نیز فقہ میں یہ بھی آیا ہے کہ اگر رخصتانہ سے قبل خاوند مر جائے تو عورت پورے مقررہ مہر کی حقدار ہوگی اور وراثت سے حصہ لینا بھی اس کا حق ہوگا۔

(کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ صفحہ 108)

مہر کے تعلق سے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ ہوا ہو اور رخصتانہ سے قبل خاوند و بیوی کی طلاق ہوجائے یا خاوند وفات پا جائے تا پھر مہر کا نصف یا پورا مہر ادا کرنا واجب نہیں جسبِ استطاعت مناسب تحائف دے کر عورت کو رخصت کیا جاسکتا ہے۔چنانچہ اس ضمن میں اسلامی تعلیم کا خلاصہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 238 سے واضح ہو جاتا ہے۔جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت بھی طلاق دے دو جبکہ تم نے انہیں چھوا تک نہ ہو یا مہر نہ مقرر کیا ہو۔اور چاہئے کہ اس صورت میں تم انہیں مناسب طر پر کچھ سامان دے دو۔یہ امر دولتمند پر اس کی طاقت کے مطابق لازم ہے اور نادار پر اسکی طاقت کے مطابق۔ہم نے ایسا کرنا نیکوکاروں پر واجب کر دیا ہے۔

اب دیکھیں قارئین!اسلام نے عورت کو کس قدر حقوق فراہم کئے ہیں۔دیگر مذاہب میں تو نہ مہر کا تصور ہے اور نہ ہی عورتوں کو اس قدر حقوق کی آزادی۔حق مہر کی ادائیگی خاوند کے ذمہ واجب ہے جیسا کہ فرمایا:-

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓــًٔا مَّرِیۡٓـــًٔا ۝۵

(سورۃ النساء آیت 5)

یعنی عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔

مہر کی اقسام

مہر مسمّٰی:۔ وہ مہر ہے جو فریقین کی رضامندی سے بوقتِ نکاح طے پایا جائے اور اعلانِ نکاح میں اس کا ذکر آجائے۔

ادائیگی کے لحاظ سے مہر مسمّٰی کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں۔

ا۔مہرِ معجّل ب۔مہرِ مؤجّل

مہرِ معجّل:۔ مہرِ معجّل کی صورت میں بیوی جب چاہے مہر کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

مہرِ مؤجّل:۔ مقررہ مہر کا وہ حصہ جو زوجین کی علیحدگی یا خاوند کی وفات کے بعد قابل ادا ہو اسے مہرِ مؤجّل کہتے ہیں۔

مہرِ مثل:۔ معاہدہ نکاح میں مہر کی عدم تعیین کی صورت میں بوقت تنازعہ قاضی جو مہر فریقین کی حیثیت کے مطابق متعیّن کرے وہ مہرِ مثل ہے۔

یعنی اسلام نے جو عورتوں کا حق مہر کی صورت میں محفوظ رکھا ہے اسے کسی قیمت پر بھی تلف نہیں کیا جاسکتا۔ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ تھا اور پھر بعد میں کسی وجہ سے میاں بیوی علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو اس قاضی حالات کا جائزہ لے کر جس مقدارِ مہر کا فیصلہ کریگا وہی مہر مثل ہوگا جسکا ادا کرنا خاوند پر لازمی ہوگا۔

مہر کی مقدار

مہر کی رقم خاوند کی مالی حیثیت کے مطابق ہونی چاہئے۔ فقہاء سَلف نے مہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر نہیں کی۔ ان کی تمام تر توجہ اسی بات پر رہی ہے کہ کم سے کم مہر کتنا ہوسکتا ہے کیونکہ زمانہ ماضی میں اسی طرف رجحان ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ کم سے کم حق مہر کا معیار یہ ٹھہرایا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے فقراء المہاجرین نے جو حق مہر کئے تھے ان کی مقدار سے کم حق مہر کسی صورت میں نہ ہو۔

حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک کم سے کم مقدار مہر دس درہم یا اس کی مساوی مالیّت کی کوئی شئے ہوسکتی ہے۔

(فقہ احمدیہ جلد دوم صفحہ ۴۸)

لیکن مختلف زمانوں میں قدرِ زر کے اختلاف کے لحاظ سے یہ مقدار درست معلوم نہیں ہوتی اور اسی طرح درہم کی Value بھی فی زمانہ تبدیل ہوتی رہی ہے۔ اُس زمانہ میں ایک درہم کی ایک بکری یا دو بکریاں ملتی تھیں۔ غرض یہ مقدار حق مہر کی اہمیت وحکمت کے منافی ہے۔ گزشتہ زمانہ کے الٹ موجودہ زمانہ میں حق مہر کے زیادہ سے زیادہ مقدار کی بحث عام ہے اسی طرح موجودہ زمانہ میں نمائش یا دباؤ کے پیش نظر بھاری رقوم حق مہر کے طور پر مقرر کی جاتی ہیں اگرچہ نیّت اس کی ادائیگی کی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اسلامی شریعت کا منشاء یہ ہے کہ مہر ادائیگی کی نیت سے ہی مقرر کیا جائے اور پھر اسے ادا بھی کیا جائے۔ اسلئے زیادہ حق مہر باندھنے کے غیر صحتمند رجحان کی روک تھام فی زمانہ لازمی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے حَکم وعَدل بانی جماعت احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام اس بارہ میں فرماتے ہیں:

''ہمارے ملک میں یہ خرابی ہے کہ نیّت اَور ہوتی ہے اور محض نمود کے لئے لاکھ لاکھ روپے کا مہر ہوتا ہے۔ صرف ڈراوے کے لئے یہ لکھا جایا کرتا ہے کہ مَرد قابو میں رہے۔ اور اس سے پھر دوسرے نتائج خراب نکل سکتے ہیں۔ نہ عورت والوں کی نیت لینے کی ہوتی ہے اور نہ خاوند کے دینے کی۔ میرا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں تنازعہ آپڑے تو جب تک اس کی نیت ثابت نہ ہو کہ ہاں رضا ورغبت سے وہ اسی قدر مہر پر آمادہ تھا جس قدر کہ مقرر شدہ ہے تب تک مقرر شدہ نہ دلایا جاوے اور اس کی حیثیت اور رواج وغیرہ کو مدّنظر رکھ کر پھر فیصلہ کیا جاوے کیونکہ بدنیّتی کی اتباع نہ شریعت کرتی ہے اور نہ قانون۔''

(بدر جلد ۲ نمبر ۱۶ صفحہ ۱۲۳-۸ مئی ۱۹۰۳ء)

بعد ازاں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اس ارشاد کی روشنی میں

مہر کی انتہائی حد مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ جماعت احمدیہ کے دوسرے روحانی خلیفہ سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمودؓ المصلح موعود نے اس سلسلہ میں فرمایا:۔

''میں نے مہر کی تعیین چھ ماہ سے سے ایک سال کی آمد کی ہے یعنی مجھ سے کوئی مہر کے متعلق مشورہ کرے تو میں یہ مشورہ دیا کرتا ہوں کہ اپنی چھ ماہ کی آمد سے ایک سال تک کی آمد بطور مہر مقرر کردو۔''

(الفضل ۱۲/دسمبر ۱۹۴۰ء)

پس اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ حق مہر جو کہ عورت کا حق ہے، نہ اتنا کم ہو کہ وہ عورت کے وقار کے منافی محسوس ہو اور شریعت کے ایک اہم حکم سے مذاق بن جائے اور نہ اتنا زیادہ ہو کہ اس کی ادائیگی تکلیف دہ ہو جائے۔ اس اصول کی بناء پر جماعت احمدیہ کا یہ مَسلک ہے کہ خاوند اپنی مالی حیثیت کے مطابق چھ ماہ سے بارہ ماہ تک کی آمدنی کے برابر حق مہر معقول اور مناسب ہے۔

2۔ بیوی نان ونفقہ کی حقدار ہوتی ہے اور خاوند نان ونفقہ ادا کرنے کا ذمّہ دار ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رُو سے خاوند اپنی بیوی کے نفقہ کا ذمہدار ہے سوائے اسکے کہ بیوی خاوند کی مرضی کے خلاف کسی شرعی عذر کے بغیر اس سے علیحدہ رہائش اختیار کرے اور نشوز کی مرتکب ہو غرض بیوی کا حق ہے کہ وہ خاوند سے نان ونفقہ حاصل کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

(سورۃ النساء آیت:35)

ترجمہ: مرد اس فضیلت کے سبب سے جو اللہ نے ان میں سے بعض کو دوسروں پر دی ہے اور اس سبب سے کہ وہ اپنے مالوں میں سے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں عورتوں پر نگران قرار دئے گئے ہیں۔

اسی طرح احادیث سے بھی ثابت ہے کہ بیوی کے نان ونفقہ کے بارے میں خاوند کی ذمہ داری اس کی مالی حیثیت کے مطابق ہے۔(دیکھیں بخاری کتاب النفقات صفحہ 207) تاہم اسلام نے مردوں پر بھی کسی قسم کا ظلم نہیں کیا بلکہ یہ تعلیم دی ہے کہ اگر بیوی بِلا عذرِ شرعی خاوند سے علیحدگی اختیار کئے رکھے تو وہ نان ونفقہ کی حقدار نہیں رہتی۔ نیز یہ کہ نان ونفقہ کی یہ اصولی ذمہ داری خاوند کی مالی حیثیت سے قطع نظر قائم رہتی ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:۔

وَمَنۡ قُدِرَ عَلَيۡهِ رِزۡقُهٗ فَلۡيُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰهُ اللّٰهُ

(سورۃ الطلاق آیت ۸)

جو شخص تنگدست ہو تو اللہ تعالیٰ نے جتنا بھی اس کو دیا ہو وہ اس میں سے اپنی بیوی کو نفقہ دے۔

لیکن اگر بیوی ایسے عذر کی بناء پر جسے شریعت تسلیم کرتی ہے خاوند سے علیحدگی اختیار کرے تو وہ باوجود علیحدگی اختیار کرنے کے نان ونفقہ کی حقدار ہوگی۔ نیز اگر طلاق ہو جائے تو نان ونفقہ کا حق بیوی کو ایّامِ عدّت تک حاصل رہتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے کہ:

اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ كُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ۚ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَكُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ۚ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى ؕ

(سورۃ الطلاق آیت:7)

ترجمہ: مطلقہ عورتوں کے حق کو نہ بھولو ان کو وہیں رکھو جہاں تم اپنی طاقت کے مطابق رہتے ہو اور ان کو کسی قسم کا ضرر نہ دو اس طرح کہ ان کو تنگ کر کے گھر سے نکال دو۔

اس بارہ میں صاحبِ فتح القدیر لکھتے ہیں کہ:۔

اِذَا طَلَّقَ الرَّجُلُ امۡرَأَتَهٗ فَلَهَا النَّفَقَةُ

(فتح القدیر صفحہ ۳۳۹)

یعنی جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ عدّت کے دوران نفقہ لینے کی حقدار ہے۔

اگر حالات یہ ہوں کہ خاوند بیوی کے مال ونفقہ کی بالکل استطاعت نہیں رکھتا ہو تو اسلام نے بیوی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ خاوند سے الگ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الرَّجُلِ لَا يَجِدُ مَا يُنْفِقُ عَلَى امْرَأَتِهٖ
قَالَ يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا

(دارقطنی بحوالہ نیل الاوطار کتاب النفقات باب اثبات الفرقۃ للمرأۃ جلد ۶ صفحہ ۳۲۴ و بحوالہ فتح القدیر صفحہ ۳۳۰)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک تنگدست شخص جو اپنی زوجہ کو خرچ دینے کی بالکل استطاعت نہیں رکھتا تھا اس کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی بیوی کو حقِ علیحدگی حاصل ہے۔

قارئین! نفقہ کا حق تو ایک عمومی بات ہے اور انسانی فطرت میں داخل ہے اور ہر انسان خواہ اسکا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو وہ اپنی بیوی کو نان ونفقہ دینا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے لیکن اسلام نے جسقدر بیوی کے اس حق کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے اسکی مثال کسی دوسرے مذہب میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ اسلام نے ازدواگی زندگی میں پیش آنے والے تمام حالات کے لئے راہنمائی فرمائی ہے۔ اور میاں بیوی کے حقوق کو یقینی بنایا ہے۔ اسلام کی یہ واضح تعلیم دیگر مذاہب کے مقابل ہر ایک امتیازی شان کی حامل ہے۔

3۔ اسلام میں نکاح کے بعد بیوی کو خاوند کے گھر میں رہنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابل پر بیوی پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خاوند کے ازدواجی حقوق ادا کرے۔ اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خاوند کی وفادار اور معروف طریق پر اس کی اطاعت گزار ہو۔

اسی طرح اسلام کی یہ منفرد تعلیم بھی ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نظر نہیں آتا کہ اگر کسی عورت کا خاوند مر جائے تو وہ عدّتِ وفات اور اس کے بعد ایک سال تک اپنے مرحوم خاوند کے مکان میں سکونت کا حق رکھتی ہے خواہ وہ مکان ترکہ میں کسی دیگر وارث کے حصّہ میں آیا ہو:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۱﴾

(سورۃ البقرہ آیت: 241)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے حق میں ایک سال تک فائدہ پہنچانے یعنی ان کے گھروں سے نہ نکالنے کی وصیت کر جائیں لیکن اگر وہ خود بخود چلی جائیں تو وہ اپنے متعلق جو پسندیدہ بات کریں اس کا تمہیں کوئی گناہ نہیں اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

چنانچہ سیدنا حضرت مصلح موعودؓ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت احکامِ میراث کے ذریعہ منسوخ ہوگئی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ بیوہ کا اپنے خاوند کی جائیداد میں جو حصّہ رکھا گیا ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں یہ ایک الگ حکم ہے جس میں جائیداد کے حصّہ کے علاوہ عورت کے لئے سال بھر کے نان ونفقہ اور رہائش کا انتظام ضروری قرار دیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ ان سے نیک سلوک کرنے کا ایک زائد حکم دیا گیا ہے۔''

(تفسیر کبیر سورۃ البقرہ صفحہ ۵۴۰)

علامہ جصّاص اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں بیوہ کے نفقہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

رَوَی الشَّعْبِیُّ عَنْ عَلِیٍّ وَعَبْدِاللہِ قَالَا اِذَا مَاتَ عَنْھَا زَوْجُھَا فَنَفْقَتُھَا مِنْ جَمِیْعِ الْمَالِ

(قرطبی صفحہ ۲۲۸ مطبوعہ مصر ۱۹۶۷ء)

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ دونوں نے کہا ہے بیوہ کا نفقہ (بطور احسان) کل ترکہ سے ادا ہوگا۔

قارئین! یہ ایک ایسی پُرحکمت تعلیم ہے کہ اس پر کوئی بھی عاقل اعتراض نہیں کرسکتا۔ اسکے مقابل پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو مذہب نے تو بیواؤں کو اپنے خاوند کے ساتھ زندہ جل جانے کی تعلیم دی ہے نیز دیگر مذاہب نے بھی بیواؤں کے حقوق کی اس قدر نشاندہی نہیں کی ہے۔ یہ محض اسلام کی امتیازی تعلیم ہے جس نے عورتوں کو اس قدر حقوق فراہم کئے کہ وہ خاوند کی وفات کے بعد بھی بے سہارا نہ رہیں اور اپنی مزید زندگی آسانی سے گزار سکیں۔ اس طرح سے اسلامی نکاح کی تعلیم نے عورتوں کو اور خصوصاً بیوہ عورتوں کو وہ حقوق دلائے جو دیگر مذاہب میں یا تو مفقود تھے اور یا ناقص حالت میں بیان تھے۔

خاوند کے حقوق

بیوی کے ساتھ ساتھ اسلام نے خاوند کو بھی بعض جائز حقوق فراہم کئے ہیں اور یہ اسلئے کہ تا میاں بیوی دونوں مل کر اپنے گھر کو احسن طور پر چلا سکیں اور انکی زندگی انکے لئے باعثِ سکون و راحت ہو۔ وہ عورت ہی ہے جو مرد کے گھر کی زینت ہے اور اس کے گھر کا چراغ اور مرد کا لباس ہے۔ اس لئے عورت پر لازم ہے کہ وہ قرآن کریم اور احادیث میں مذکور ایک صالحہ، قانتہ اور مومنہ عورت کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتے ہوئے اپنے خاوند کی مکمل طور پر مطیع و فرمانبردار رہے۔ اور اسلام نے اسکے جو حقوق مقرر کئے ہیں اُن کو بالکل بھی نظر انداز نہ کرے۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ:۔

”کوئی عورت اُس وقت تک خدا تعالیٰ کا حق ادا کرنے والی نہیں سمجھی جاسکتی جب تک کہ وہ اپنے خاوند کا حق ادا نہیں کرتی۔“

(ابن ماجہ)

خاوند کے یہ حقوق کونسے ہیں؟ اسکے متعلق قرآن کریم اور حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ بیوی پر خاوند کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی فرمانبردار ہو۔ اس کا واجبی ادب ملحوظ رکھے۔ اس سے محبت کرے اس کی وفادار رہے۔ اس کی اولاد کی تربیت کا خیال رکھے۔ اس کے مال کی حفاظت کرے اور جہاں تک ممکن ہو اس کی خدمت کرے۔ نیز خاوند نکاح کے نتیجہ میں بیوی سے ازدواجی تعلقات یعنی مقاربت کا بھی حقدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۲﴾

(سورۃ الروم:22)

تاکہ تم ان کی طرف تسکین (حاصل کرنے) کے لئے جاؤ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔

اسی طرح عورتوں کو حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ

(سورۃ النور:32)

اور مومن عورتوں سے کہہ دے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھو اور اپنی زینتیں ظاہر نہ کیا کرو مگر اپنے خاوندوں کے لئے

اسی طرح گھریلو کام کاج اور بچوں کی پرورش کے سلسلہ میں بیوی سے مدد لینے کا حق بھی خاوند کو حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو بھی یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے مجازی خدا یعنی خاوند کی بھرپور خدمت کریں اور انکی اطاعت کریں۔ چنانچہ اس حکم کی اہمیت ہمیں اس سے پتہ چلتی ہے ایک موقع پر آنحضرتؐ نے عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنا واجب ہوتا تو میں بیویوں کو ان کے خاوندوں کے حضور سجدہ کرنے کا حکم دیتا۔ ان حقوق کی وجہ سے جو خدا تعالیٰ نے عورتوں پر ان کے خاوندوں کے قائم کئے ہیں۔

(ابوداؤد کتاب النکاح)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عورتوں کو تاکیدی نصیحت کی ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کو ناراض نہ کیا کریں چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مقام پر تین افراد کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ نہ تو ان کی نماز قبول ہوتی ہے اور نہ ان کی کوئی نیکی آسمان کی طرف چڑھتی ہے۔ ان تین افراد میں سے دوسرے نمبر پر ایسی عورت کا ذکر ہے جس سے اس کا خاوند ناراض ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے الفاظ یہ ہیں۔

اَلْمَرْأَةُ السَّاخِطُ عَلَيْهَا زَوْجُهَا

(مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

ایک اور مقام پر سختی ک ساتھ فرمایا کہ۔ جب خاوند اپنی بیوی کو بلائے اور عورت خاوند کے پاس جانے سے انکار کردے اور خاوند کو اپنی نافرمانی سے ناراض کردے تو ساری رات فرشتے اس عورت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

(متفق علیہ۔ مشکوۃ باب عشرۃ النساء)

نیز فرمایا۔بہترین عورت (رفیقہ حیات) وہ ہے جسے اس کا خاوند دیکھے تو اس کا دل خوش ہو اور جب خاوند اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔اور جس بات کو اُس کا خاوند ناپسند کرے اُس سے بچے۔

(مشکوۃ)

اسی طرح آپؐ نے خاوند کی فرمانبردار بیوی کو خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا کہ۔جو عورت مرے اور خاونداس پر راضی ہو وہ جنت میں داخل ہوگی۔

(مشکوۃ ابواب الرضاء)

مسلمان عورتوں کے لئے ازواج مطہراتؓ کا اسوہ اور اُن کی حضورؐ سے مثالی محبت مشعل راہ کی طرح ہے۔اسی طرح سیدنا حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:۔

’’عورت پر اپنے خاوند کی فرمانبرداری فرض ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر عورت کو اس کا خاوند کہے کہ یہ ڈھیر اینٹوں کا اٹھا کر وہاں رکھ دے اور جب وہ عورت اس بڑے اینٹوں کے انبار کو دوسری جگہ رکھ دے تو پھر اس کا خاونداس کو کہے کہ پھر اس کو اصل جگہ رکھ دے تو اس عورت کو چاہئے کہ چوں چراں نہ کرے بلکہ اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرے۔‘‘

(ملفوظات جلد ۵ صفحہ ۳۰)

نیز فرمایا:۔عورتوں کے لئے ایک ٹکڑا عبادت کا خاوندوں کا حق ادا کرنا ہے اور ایک ٹکڑا عبادت کا خدا کا شکر بجالانا ہے۔خدا کا شکر کرنا اور خدا کی تعریف کرنی یہ بھی عبادت ہے۔دوسرا ٹکڑا عبادت کا نماز کو ادا کرنا ہے۔

(ملفوظات جلد ۳ صفحہ ۳۶۹)

اسلام میں تعدد ازدواج کی تعلیم
اور دیگر مذاہب سے موازنہ

اسلام نے خاوند کو بعض مختص حالات میں تعدد ازدواج کا حق بھی دیا ہے لیکن اس کے ساتھ

ہی اسے تمام بیویوں کے حقوق مساوی طور پر ادا کرنے کی سخت نصیحت بھی کی ہے۔ کثرت ازدواج کے تعلق سے غیر مذاہب کی طرف سے اسلام پر بہت اعتراض کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون فطرت اور انسان کے معاشرتی حالات کے پیش نظر تعدد ازدواج ایک اہم ضرورت ہے۔ اسلام جو دین فطرت ہے اس نے اس انسانی ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور حسب حالات اور ضرورت ایک وقت میں مرد کو زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ اصل میں تو اسلام سے قبل چار سے بھی زیادہ بیویاں رکھنا عام تھا اور اسلام نے کثرتِ ازواج کی اس نے اعتدالی کو چار تک محدود کیا اور ان میں برابری اور انصاف کی شرط کا حکم دے کر اعتدال قائم کیا۔ تاہم اگر کوئی شخص ایک سے زائد بیویوں میں عدل ومساوات قائم نہ رکھ سکتا ہو تو اسے ایک بیوی پر ہی اکتفا کرنے کی ہدات ہے۔

(سورۃ النساء آیت ۴)

دیگر مذاہب کی موجودہ ناقص اور محرف ومبدّل تعلیم میں انسان کی اس فطری ضرورت کا کوئی مداوا نہیں۔ اگرچہ بائیبل کے بیان کے مطابق بعض بزرگ انبیاء نے بھی اس فطری تقاضا کے تحت ایک سے زائد بیویاں کیں۔ جیسا کہ لکھا ہے:۔

''حضرت سلیمانؑ کے حرم میں سات سو 700 بیویاں تھیں جو شاہی خاندان سے تھیں اور تین سو کنیزیں تھیں اور اسکی بیویوں نے اُسے گمراہ کر دیا۔''

(سلاطین 1۔ باب 11۔ آیات 1 تا 3)

نیز ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی تین بیویاں ثابت ہیں۔

(پیدائش باب ۱۶ آیت ۱، ۳)

حضرت یعقوبؑ کی بھی دو بیویاں، لیاہ اور راخل تھیں۔

(پیدائش باب ۲۹ آیات ۱۴۔ ۳۰)

یہودی مذہب کے بانی حضرت موسیٰؑ کی بھی دو بیویوں کا ذکر ملتا ہے۔

(گنتی 1/12۔ خروج باب 16، 2/15)

عہد نامہ قدیم میں حضرت داؤدؑ کی سات بیویوں کا ذکر موجود ہے۔

(تواریخ 1 باب 3)

نیز تاریخ سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں بنی اسرائیل میں تعدد ازدواج کا تصور موجود تھا۔ مزید معلومات کے لئے:۔

(www.ancienthistory.about.com/od/biblepeople?a/020811-cw-King-Davids-wives.html)

اسی طرح ہندو مذہب کی تاریخ سے ثابت ہے کہ راجہ رامچندر جی کے والد دشرتھ کی چار بیویاں تھیں۔ جن کے نام یہ ہیں:۔

(i) کیکئی (ii) کوشلیا (iii) سُومِترا (iv) نِندنی

نیز اور بھی متعدد ہندو بادشاہ وغیرہ ہیں جن کی بیویوں کی تعداد اس سے بھی بہت زیادہ ہے اسی طرح ہندو مذاہب کی مقدس کتب میں بھی تعدد ازدواج کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ ان میں سے چند ایک بطور مثال پیش خدمت ہیں:۔

تعدد ازدواج از روئے سناتن دھرم

1.

2.

3.

1۔شراب پینے والی اور سادھوؤں کی سیوا نہ کرنے والی اور دشمنی کرنے والی اور بیماریوں سے بھری ہوئی اور گھات کرنے والی اور ہر روز دولت کو نیست و نابود کرنے والی عورت ہو تو دوسرا وواہ (شادی) کرنا چاہیئے۔

2۔بانجھ عورت اور جسکی اولاد نہ جنتی ہو(پیدا ہوتی ہو) اور جو صرف دختر ہی پیدا کرتی ہو ایسی عورت ہونے پر حسب سلسلہ آٹھویں۔دسویں اور گیارہویں سال دوسرا وواہ کرنا چاہیئے اور بدزبان عورت کے اوپر تو فوراً دوسرا وواہ کرنا چاہیئے۔

3۔ جو عورت مریض ہو لیکن خیر خواہ اور بامروّت ہو تو اسکی اجازت سے دوسرا وواہ کرنا چاہیئے مگر اسکی بے قدری ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے قبل عرب معاشرہ میں بیویاں کرنے کی کوئی حد بسط مقرر نہ تھی۔عرب معاشرہ میں بدکاری اور زناکاری عروج پر تھی۔عرب اس پر ندامت تو دُور کی بات ہے ان افعال قبیحہ پر فخر کرتے اور اپنے اَشعار کے ذریعہ اشاعت فحشاء پر ناز کرتے تھے۔شراب اور سخت نشیلی ڈرگز (Drugs) کا استعمال عام تھا اور پھر مدہوشی میں مخالفوں کی بہو بیٹیوں کے بارہ میں مزے لے لے کر فخریہ قصے بیان کرتے تھے۔اسی طرح ان کی تمام شاعری کا محور بھی اسی فحاشت کے قصوں کے اردگرد گھومتا تھا۔چنانچہ عمرالقیس جیسے مشہور عربی شعراء کی شاعری ان بیہودہ مضامین سے بھری ہوئی ہے جس کی شہرت کا یہ مقام تھا کہ ان اشعار کو خانہ کعبہ پر لٹکایا جاتا تھا۔عرب کے لوگ لونڈیاں کثرت سے رکھتے تھے اور ان کے ذریعہ بدکاری کی

آمدنی کو اچھا سمجھتے تھے۔ جو عورت بھی جنگ میں پکڑی جاتی اس سے یہی پیشہ کرواتے تھے۔ جس بیوہ عورت پر متوفّی شوہر کا قریبی رشتہ دار اپنی چادر ڈال دیتا وہی زبردستی اس کی بیوی بنادی جاتی۔ سوتیلے بیٹے اس طریق پر سوتیلی ماؤں پر قبضہ کر لیتے تھے۔ عورتیں بے حجاب اپنے جسم کے مخفی حصوں کی نمائش کرتیں۔ جو خاندان شریف سمجھے جاتے وہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے کہ گویا یہ ان کی اعلیٰ شرافت کا نشان ہے۔

(از رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، حصہ سوم صفحہ 625-626)

جناب قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری اپنی تالیف رحمۃ للعالمین میں لکھتے ہیں:

''معترضین کے پاس اس کے خلاف دلیل صرف یہ ہے کہ اسلام نے ایک سے زیادہ عورت کو بھی بیوی بنالینے کی اجازت دی ہے۔ مگر غور تو کرو کہ داؤدؑ کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہنے والے اور اس کی سو بیویاں اور سلیمانؑ کو خدا کا سادل والا بتانے والے اس کی ایک ہزار بیویوں پر، ابراہیم خلیل الرحمٰن ماننے والے اس کی بیویوں اور لونڈیوں پر، کرشن جی مہاراج کو اوتار ماننے والے ان کی سولہ ہزار ایک سو ساٹھ سکّھیوں پر اور ریفارمر اعظم ماننے والے زمانہ حال کے لیڈران ان کی آٹھ مہارانیوں پر کوئی اعتراض زبان سے نہیں نکالتے۔ تو پھر ان کا کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر ایک سے زائد بیوی کرنے پر اعتراض کریں۔ ہم نے جن محترم ہستیوں کے نام لئے ہیں ان کے مذہب میں ایک سے زائد بیوی کرنے کے لئے کوئی ایسی شرط موجود نہیں جس کا فقدان ان کو ایک سے زائد بیوی کرنے کے لئے روک بن سکے۔ مگر اسلام میں شرط عدل موجود ہے۔ اور اس شرط کے فقدان پر (بلکہ صرف فقدان ہی پر نہیں) احتمالِ فقدان کی حالت پر بھی فَوَاحِدَۃً کا ارشاد موجود ہے کیا کوئی مذہب ہے جو اپنی کتاب پاک میں فَوَاحِدَۃً کا ہم معنی لفظ نکال کر دکھا وے؟ کوئی مذہب ہے جو مسیح یا موسیٰ یا کرشن ورام چندر کے منہ سے نکلی ہوئی بات فَوَاحِدَۃً کے ہم معنی ثابت کردے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تب اس کو اقرار کرنا چاہئے کہ یہ بھی اسلام کی خصوصیات میں سے ہے اور ایک بیوی والے جس قانون پر یورپ کو فخر ہے وہ بھی قرآن مجید ہی

کے ایک حکم کا خلاصہ اور ناقص خلاصہ ہے۔''

(رحمۃ للعالمین حصہ سوم صفحہ 891)

چنانچہ اس زمانہ کے امام سلطان القلم سیدنا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام تعدد ازدواج کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

''اے عورتو! فکر نہ کرو، جو تمہیں کتاب ملی ہے وہ انجیل کی طرح انسانی تصرف کی محتاج نہیں اور اُس کتاب میں جیسے مَردوں کے حقوق محفوظ ہیں عورتوں کے حقوق بھی محفوظ ہیں۔اگر عورت مرد کے تعدّد ازدوج پر ناراض ہے تو وہ بذریعہ حاکم خلع کراسکتی ہے۔خُدا کا یہ فرض تھا کہ مختلف صورتیں جو مسلمانوں میں پیش آنے والی تھیں اپنی شریعت میں ان کا ذکر کر دیتا تا شریعت ناقص نہ رہتی۔سوتم اے عورتو! اپنے خاوندوں کے ان ارادوں کے وقت کہ وہ دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہیں خدا تعالیٰ کی شکایت مت کرو بلکہ تم دعا کرو کہ خدا تمہیں مصیبت اور ابتلاء سے محفوظ رکھے۔''

(کشتی نوح روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۸۱)

ایک اور مقام پر فرمایا:۔

''پادری لوگ دوسری شادی کو زنا کاری قرار دیتے ہیں تو پھر پہلے انبیاء کی نسبت کیا کہتے ہیں۔حضرت سلیمان کی کہتے ہیں کئی سو بیویاں تھیں اور ایسا ہی حضرت داوٗد کی تھیں۔اگر نعوذ باللہ عیسائیوں کے قول کے مطابق ایک سے زیادہ نکاح سب زنا ہیں تو حضرت داوٗد کی اولاد سے ہی انکا خدا پیدا ہوا ہے۔تب تو یہ نسخہ اچھا اور عربڑی برکت والا طریق ہے۔''

(ملفوظات جلد دہم صفحہ 236)

ملفوظات جلد 7 صفحہ 63 تا 70 پر ایک احمدی کے بعض سوالوں کے جواب دیتے ہوئے حضور علیہ السلام نے تعدد ازدواج سے متعلق سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

☆۔اگر انسان کو پورا علم ہو کہ عدم مساوات سے خدا تعالیٰ کس قدر ناراض ہوگا تو شاید وہ ساری عمر رنڈوا رہنے کو ترجیح دے۔

☆۔اگر انسان اپنے نفس کا میلان اور غلبہ شہوات کی طرف دیکھے اور اس کی نظر بار بار خراب ہوتی ہو تو زنا سے بچنے کے لئے دوسری شادی کر لے لیکن پہلی بیوی کے حقوق تلف نہ کرے کیونکہ جوانی کا بہت سا حصہ اُس نے اُس کے ساتھ گزارا ہوتا ہے۔اور ایک گہرا تعلق خاوند کا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

☆۔اگر مرد کو دوسری شادی کی ضرورت ہو لیکن وہ یہ دیکھے کہ اس سے پہلی بیوی کو سخت صدمہ ہوگا اور حد درجہ کی اس کی دل شکنی ہوگی تو وہ قربانی دے اور ایک ہی بیوی کو کافی سمجھے اور دوسری شادی نہ کرے۔ بشرطیکہ اسے یہ ڈر نہ ہو کہ اس کی وجہ سے وہ معصیت میں مبتلا ہو کر کسی جائز شرعی ضرورت کا خون نہیں کرے گا۔

☆۔صرف نفسانی لذات کے لئے دوسری شادی کرنا گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کئی بیویاں تھیں مگر اس کے باوجود آپ ساری ساری رات خدا تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے تھے۔ایک بار آپؐ کی باری حضرت عائشہؓ کے ہاں تھی۔کچھ حصہ رات کا گزرا تو حضرت عائشہؓ کی آنکھ کھلی اور دیکھا کہ آپؐ وہاں موجود نہیں ہیں۔انہیں شبہ ہوا کہ کہیں کسی دوسری بیوی کے ہاں ہوں گے۔انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گھر میں تلاش کیا بالآخر دیکھا کہ آپ قبرستان میں سجدہ کی حالت میں رو رہے ہیں۔اب دیکھو آپؐ زندہ اور چہیتی بیوی کو چھوڑ کر مُردوں کی جگہ قبرستان میں گئے اور روتے رہے تو کیا آپ کی بیویاں حظِ نفس یا اتباع شہوت کی بنا پر ہوسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔

آخر میں خاکسار بعض مستشرقین کی کثرت ازدواج کے تعلق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور اسلامی تعلیم کی خوبی کے اعتراف کو درج کر کے مقالہ کے اس حصہ کو ختم کرتا ہے چنانچہ ایک سابق عیسائی راہبہ پروفیسر کیرن آرمسٹرانگ Karen Armstrong نے تعدّد ازدواج پر اہل مغرب کا جنس پرستی کا اعتراض ردّ کرتے ہوئے اپنی کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) میں لکھا ”اگر تعدّد ازدواج کو اس کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ ہرگز لڑکوں کی تسکین جنس کے

سامان کے طور پر ایجاد نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ یہ معاشرتی قانون سازی کا ایک حصہ تھا۔یتیم لڑکیوں کا مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز سے ہی درپیش تھا لیکن جنگ احد میں کئی مسلمانوں کی شہادت نے اس میں اضافہ کر دیا تھا۔شہید ہونے والوں نے محض بیوگان ہی پیچھے نہیں چھوڑیں بلکہ بیٹیاں، بہنیں اور دیگر رشتہ دار بھی تھے جو نئے سہاروں کے متقاضی تھے۔کیونکہ ان کے نئے نگران ان یتامیٰ کی جائیدادوں کی انتظام وانصراف کے قابل نہ تھے۔‘‘

(Muhammad A Biography of Prophet by Karen Armstrong page:180)

اسی طرح ایک اور مستشرق مسٹر مارگولیس بھی آنحضرتؐ کے تعدد ازدواج کے بارہ میں حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں:۔

’’محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بہت سی شادیاں جو خدیجہؓ کے بعد وقوع میں آئیں بیشتر یورپین مصنفین کی نظر میں نفسانی خواہشات پر مبنی قرار دی گئی ہیں۔لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر اس جذبہ پر مبنی نہیں تھیں۔محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بہت سی شادیاں قومی اور سیاسی اغراض کے ماتحت تھیں کیونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ چاہتے تھے کہ اپنے خاص خاص صحابیوں کو شادیوں کے ذریعے سے اپنی ذات کے ساتھ محبت کے تعلقات میں زیادہ پیوست کرلیں۔ابوبکرؓ اور عمرؓ کی لڑکیوں کی شادیاں یقینا اسی خیال کے ماتحت کی گئی تھیں۔اسی طرح سر برآوردہ دشمنوں اور مفتوح رئیسوں کے ساتھ بھی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شادیاں سیاسی اغراض کے ماتحت وقوع میں آئی تھیں۔‘‘

(مارگولیس صفحہ 176-17)

اطالوی مستشرقہ ڈاکٹر لارا ولیسیا وگلیری نے بھی حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ آنحضرتؐ کی ہر شادی کسی معاشرتی یا سیاسی مقصد کے لئے تھی۔اوران شادیوں کے ذریعہ تبلیغ کے لئے راہ ہموار کرنا مقصد تھا۔اور یہ ہرگز عیاشی کے لئے نہیں تھیں۔

(مکمل اقتباس ملاحظہ ہو Vaglieri,Laura Veccica:An Interpretation of

(68, 67:page,Islam,1957

اسلام کا نظام زکوٰۃ اور انسانی حقوق کا تحفّظ

اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے اموال کو خرچ کرنا جہاں ایک بہت بڑی نیکی بھلائی اور ملک کی خوشحالی کی ایک یقینی ضمانت ہے وہاں یہ ایک مالی عبادت بھی ہے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ جو قومیں ذخیرہ اندوزی اور مال جمع کرنے کی عادی ہیں اور قومی ضرورتوں اور رفاہ عامہ کے کاموں میں کھلے دل سے خرچ کرنے سے ہچکچاتی ہیں وہ تباہی اور بربادی کے کنارہ پر جا کھڑی ہوتی ہیں۔ فتنہ اور فساد۔ بدامنی اور انتشار اس ملک کا نصیب بن جاتا ہے جس میں یہ بخیل قوم بستی ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ سکھاتا ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے اور اُس کی امانت ہے اگر اللہ تعالیٰ اس امانت میں سے کچھ واپس لینا چاہے اور بندے کو کہے کہ اُس کو دیئے ہوئے مال میں سے وہ اس کی راہ میں خرچ کرے تو خوشی اور پورے انشراح صدر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو ماننا اور اس کی راہ میں خرچ کرنا انسان کی عین سعادت اور اس کی مزید برکات کے مورد بننے کا یقینی اور قطعی ذریعہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ یعنی مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال ہے۔ اسلام کی اس امتیازی تعلیم کے مطابق زیست کے لحاظ سے سب انسان اللہ تعالیٰ کے حضور ایک جیسا حق اور درجہ رکھتے ہیں اور دنیا کے تمام اموال میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ تاہم اپنے اپنے وسائل اور استعداد یافت کے لحاظ سے مقدارِ ملکیت میں وہ ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ حالات کے اعتبار سے کسی شخص کے پاس مال زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم۔ ایک شخص کمانے کے بہتر ڈھنگ جانتا ہے اور دوسرا اس راہ میں اناڑی اور بے وسیلہ ہے لیکن اس تفاوت کی وجہ سے کمزور بے وسیلہ اور نادار اپنے اصل حق سے محروم نہیں ہو سکتا۔

دراصل اسلام بنی نوع انسان کو اس نکتہ کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ جس طرح دنیا کی دولت

مشترک ہے۔ کسی ایک کی حقیقی ملکیت نہیں، اس طرح تمہاری کمائی میں بھی ہر ایک کا حق ہے کیونکہ کوئی انسان اکیلا نہیں کما سکتا بلکہ اُسے دوسروں کو اپنے ساتھ شامل کرنا پڑتا ہے۔ اسلئے وہ جب بھی کمائے گا اُس میں دوسروں کا بھی حق ہوگا۔ اسی لئے بڑی بڑی تجارتیں گاؤں کی بجائے شہروں میں ہی ہوتی ہیں۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر قرآن کریم نے تمام رشتہ داروں کا جن کا قریبی تعلق ہوتا ہے ورثہ میں حصہ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ماں باپ، بیوی، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن وغیرہ پھر ان کے فقدان کی صورت میں دور کے رشتہ دار وارث ہو جاتے ہیں مثلاً دادا، دادی، نانا، نانی، پوتا، پوتی، بھتیجے وغیرہ۔ اور یہ نکتہ کہ ہر ایک کی کمائی میں عائلی حق ہوتا ہے قرآن کریم ہی نے بیان کیا ہے اور کسی بھی مذہبی کتاب نے بیان نہیں کیا۔ یہ ایک ایسی انوکھی اور قابل قدر تعلیم ہے کہ جس کی برتری کو آج کے ماہر اقتصادیات بھی قبول کرتے ہیں۔ بنی نوع انسان میں بھائی چارہ بڑھانے اور سب کو مساوی حقوق فراہم کرنے کی اس سے اچھی تعلیم اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت میں اسی عظیم الشان تعلیم کا ذکر ہے:۔

وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴿٢٠﴾

اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجت مندوں) کا حق مقرر تھا۔

(سورۃ الذّٰریٰت: 20)

پس اسلام نے مالداروں پر فرض کیا کہ ان کے اموال میں جو دوسرے لوگوں کا حق ہے وہ انہیں بخوشی اور پوری فراخ دلی کے ساتھ ادا کریں۔ اور انہیں یہ حکم دیا ہے کہ وہ معاشرہ کے غرباء اور نادارو کا خیال رکھیں اور ضروریات زندگی، خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ کے مسائل میں انہیں ایسے حال میں نہ رہنے دیں جو ناگفتہ بہ ہو اور اس میں انہیں تنگی اور دقّت کا سامنا کرنا پڑے۔ اس میں ان کی بھلائی ہے اور اسی نظام میں ان کے تحویل میں جو مال ہے اس کی حقیقی حفاظت کا راز مضمر ہے۔ دوسری جانب اسلام نے غرباء اور ناداروں کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ دوسروں کے مال کو حرص اور لالچ اور بغض وعناد کی نیّت سے نہ دیکھیں اور ناجائز طریق سے اسے ہتھیانے اور اُس پر زبردستی قبضہ کرنے کی راہ اختیار نہ کریں۔ اور اگر امراء چاہتے ہیں کہ غرباء

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو مانیں جو دوسروں کے مال پر دست درازی نہ کرنے کے بارہ میں انہیں دیا گیا ہے تو اُن کا بھی فرض ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو مانیں اور صدق دل سے اس پر عمل کریں جو ان کو دنیا سے غربت اور احتیاج کو مٹانے اور اُسے کم کرنے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرنے کے بارہ میں دیا گیا ہے۔

اس وقت دنیا کو کئی معاشی مسائل درپیش ہیں لیکن سب سے بڑا اور سنگین مسئلہ غیر مساوی تقسیم دولت کا ہے۔آج اکثر دینا میں لوگ اس خطرناک خیال کو اپنائے ہوئے ہیں کہ ان کے مال پر صرف انہیں کا حق ہے اور اسی خیال کی وجہ سے آج دنیا میں ایک دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا سلسلہ انتہا کو پہنچ چکا ہے۔آج دنیا میں جہاں ایک طبقہ انتہائی امیر ہے وہاں ایک دوسرا طبقہ انتہائی غریب اور خستہ حال ہے۔اس غیر طبعی تفاوت کی وجہ سے دونوں طبقوں میں منافرت اور مغائرت پیدا ہو رہی ہے اور اس طرح ان میں حسد،بغض،کینہ اور انتقام جیسے مکروہ جذبات بار بار بحرانی کیفیات اور انقلابی شور وشر کا باعث بنتے رہتے ہیں اور دنیا نے اب تک اس سے نجات نہیں پائی۔ایک طرف اگر سرمایہ دار اپنے وسائل کے بل بوتے پر کثیر دولت جمع کر رہے ہیں تو دوسری طرف غریب اپنی محنت فروخت کرنے کی فکر میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کی محنت کی صحیح قیمت دینے والا ملنا ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔

آج دنیا میں امیر وغریب کی اس وسیع خلیج کو پاٹنے کا واحد ذریعہ اسلامی تعلیم کا پیش کردہ مالی اور اقتصادی نظام ہے چنانچہ اسلام نے ان تمام مشکلات کا بہترین حل انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ پیش کیا ہے۔انفاق فی سبیل اللہ کی عادت سے یہ احساس اُجاگر ہوتا اور جِلا پاتا ہے کہ ہر ایک کو اُس کا صحیح حق ملنا چاہیئے اور کسی کو لوٹ مار یا حق تلفی اور محرومی کا احساس نہیں ہونے دینا چاہیئے۔

مذہب اسلام نے جہاں انفاقِ مال کی پُرزور تحریک فرمائی وہاں اس کی غرض بھی متعین کر دی یعنی خرچ کرنے والے کا مقصد محض رضائے الٰہی ہو کوئی دنیاوی یا دکھاوٹی غرض اُس کے پیچھے کارفرما نہ ہو ورنہ خود غرضی-لالچ-ناجائز کمائی کی حرص اور دوسروں پر احسان جتانے کی بدعات

سے نجات مشکل ہوگی اور وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکے گا جسکے لئے اپنے مال سے خرچ کرنے کی اتنے زور کے ساتھ تحریک کی گئی ہے۔

قارئین! اسلام نے جہاں غرباء کے حقوق کی حفاظت کی خاطر انفاق فی سبیل اللہ کی کامل تعلیم دی وہیں انفاق فی سبیل اللہ کے کامل نظام کو دوام بخشنے اور بسہولت اسکے جاری کرنے کے لئے کفایت شعاری اور تکلف سے پاک سادہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور اسراف کی راہوں سے بچنے کی سخت ہدایت فرمائی ہے کیونکہ تکلّفات کی راہیں بے شمار ہیں اگر انسان ان میں پڑ جائے تو گنجِ قارون یا جیسے ہندوستان میں کہتے ہیں سودرشن کا خزانہ بھی اسکے لئے ناکافی ہے اور جب ذاتی اخراجات اس قدر بڑھے ہوئے ہوں اور انسان تکلّفات کا شکار ہو تو انفاق فی سبیل اللہ کے لئے اسکے دل میں کیا بشاشت آئے گی اور اسکے لئے وہ کیسے جرأت کرے گا؟ اور اس سلسلہ میں بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیؐ کا کامل نمونہ ہمارے سامنے بطور مشعل راہ کے ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾

(سورۃ الانعام:142)

اور اسراف سے کام نہ لو کیونکہ وہ اسراف سے کام لینے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام سے پہلے بھی زکوٰۃ یہودیوں پر فرض تھی مگر ناقص صورت میں۔

(دیکھو خروج باب ۲۳ آیت ۱۰ و ۱۱)

اسلام میں عوام کے حقوق کی ادائیگی کی خاطر انفاق فی سبیل اللہ کی مختلف اقسام

اسلامی اصطلاح میں انفاق فی سبیل اللہ کا دوسرا کام صدقات ہے اور اسلام میں صدقات کی کئی اقسام ہیں:۔

۞ ۔قومی اور اجتمائی ضروریات کے لئے مال خرچ کرنا اور اس کے لئے ضرورت شرط ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ

(سورۃ التوبہ آیت:112)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں اوران کے مالوں کو(اس وعدہ کے ساتھ) خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔

۞ ۔بچت اور زائداز ضرورت مال میں سے خرچ کرنا۔اسکی آگے دو قسمیں ہیں:

(الف)۔طوعی کرچ یعنی جسکی تعیین انسان اپنی مرضی سے کرتا ہے

(ب)۔لازمی خرچ جیسے اجتماعی لازمی چندہ جات

۞ ۔حکومت کی طرف سے عائد کردہ محصولات۔

۞ ۔نفقہ اقارب،حق الخدمت،صدقۃ الفطر،فدیہ،کفارہ اور نذر کے اخراجات بھی لازمی خرچ کے ہی حصے ہیں۔

۞ ۔ایک لازمی خرچ اللہ کی راہ میں وہ ہے جس کا خصوصی اور اصطلاحی نام زکٰوۃ ہے۔ اسلام کے مالیاتی نظام میں زکٰوۃ بچت میں سے لازمی خرچ کی اہم ترین قسم ہے کیونکہ یہ وہ کم سے کم انفاق فی سبیل اللہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہر صاحب نصاب مسلمان کے لئے ضروری ہے۔معاشرہ کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو،ہر حال میں یہ خرط لابدی ہے تاکہ افراد کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت رہے۔اور معاشرہ میں اکتناز۔بخل اور حرص کی جڑیں کٹتی رہیں۔اور ارشاد ربّانی:۔

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ

(سورۃ الحشر آیت ۸)

مال تم میں سے مالداروں کے اندر چکر نہ کھاتا پھرے۔

کا مقصد پورا ہو۔اور معاشرہ ظالم اور بخیل افراد کی احتیاج سے محفوظ ہو جائے۔زکٰوۃ کے

لفظی معنی پاک کرنا۔نشونما دینا۔خوشحالی سے ہمکنار کرنا۔پس جو بھی مسلمان زکوٰۃ ادا کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اکتناز اور مال جمع کرنے کی حرص سے پاک کرتا ہے اور اُس کے مال میں جو دوسروں کا حق ہے وہ ادا کر کے اپنے مال کو پاکیزہ اور طیّب بناتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی برکتوں اور فضلوں کا وارث بنتا ہے۔غریبوں اور ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کر کے امن اور آشتی حفظ اور امان کے حالات پیدا کرتا ہے۔اس طرح اپنے مال کی حفاظت اس کی تجارت کے فروغ اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے راہ ہموار کرتا ہے اور سارے ملک کی خوشحالی اور اضافۂ دولت کی ضمانت دیتا ہے۔اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلامی نظام زکوٰۃ دنیاوی انکم ٹیکس سے بالکل مختلف اور معاشرہ کی خوشحالی کے لحاظ سے اعلیٰ اور انسب ہے۔

اسلام نے روپیہ کمانا منع نہیں کیا اور اسلام کی تعلیمات رہبانیت کے اصولوں کو قبول نہیں کرتیں،ہاں روپیہ کو بند رکھنا اور اپنے پاس جمع کر کے رکھنا اور خرچ نہ کرنا ناجائز قرار دیا ہے تاہم اگر کوئی شخص اپنی آئندہ کی ضروریات کے لئے بطور احتیا کچھ روپیہ جمع کرتا ہے اور پڑے پڑے اس پر سال گزر جاتا ہے تو اس روپیہ پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

(سورۃ التوبۃ آیت:104)

اے رسُول ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کر اسطرح تو ان کو پاک اور ان کے تزکیہ کے سامان کرے گا۔

اس زمانہ کے امام وعدل سیدنا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام زکوٰۃ کی مناسبت سے بیان فرماتے ہیں کہ:۔

”زکوٰۃ کیا ہے۔يُؤْخَذُ مِنَ الْاُمَرَآءِ وَيُرَدُّ اِلَى الْفُقَرَاءِ یعنی وہ مال جو امراء سے لے کر فقراء کو دیا جائے اس میں اعلیٰ درجہ کی ہمدردی سکھائی گئی ہے اس طرح سے باہم گرم سرد ملنے سے مسلمان سنبھل جاتے ہیں۔امراء پر یہ فرض ہیکہ وہ ادا کریں اگر نہ بھی فرض ہوتی تو بھی انسانی

ہمدردی کا تقاضا تھا کہ غرباء کی مدد کی جائے۔ مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ ہمسایہ اگر فاقہ مرتا ہو تو پرواہ نہیں اپنے عیش و آرام سے کام ہے جو بات خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالی ہے اس کے بیان کرنے سے رک نہیں سکتا۔ انسان میں ہمدردی اعلیٰ درجہ کا جوہر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (سورۃ العمران آیت ۹۳) یعنی تم ہرگز ہرگز اس نیکی کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی پیاری چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ یہ طریق اللہ کو راضی کرنے کا نہیں کہ مثلاً کسی ہندو کی گائے بیمار ہو جائے اور وہ کہے کہ اچھا اسے منس دیتے ہیں (یعنی صدقہ میں دیتے ہیں)۔۔۔۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ باسی اور سڑی بُسی روٹیاں جو کسی کام نہیں آسکتی ہیں فقیروں کو دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے خیرات کر دی ہے۔ ایسی باتیں اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہیں اور نہ ایسی خیرات مقبول ہو سکتی ہے وہ تو صاف طور پر یہ کہتا ہے۔ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ حقیقت میں کوئی نیکی نیکی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اپنے پیارے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں اُس کے دین کی اشاعت اور اس کی مخلوق کی ہمدردی کے لئے خرچ نہ کرو۔‘‘

(فتاویٰ حضرت مسیح موعودؑ صفحہ ۱۲۶، بدر ۱۹۰۸ء)

زکوۃ کہاں کرچ کی جائے اور اس کے مستحق کون لوگ ہیں اس بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں راہنمائی فرمائی ہے:-

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡہَا وَ الۡمُؤَلَّفَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ وَ فِی الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِیۡنَ وَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۱﴾

(سورۃ التوبۃ آیت:61)

صدقات تو صرف فقراء اور مساکین کے لئے ہیں اور ان کے لئے جو ان صدقات کے جمع کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ نیز ان کے لئے جن کے دلوں کو اپنے ساتھ جوڑنا مطلوب ہو اور اسی طرح قیدیوں اور قرضداروں کے لئے اور ان کیلئے جو اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں اور مسافروں کے لئے یہ فرض اللہ کا مقرر کردہ ہے اور اللہ بہت جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کئے گئے ہیں:۔

(۱)۔فقراء

(۲)۔مساکین

(۳)۔کارکنان وصولی وتقسیم کار

(۴)۔مؤلّفۃ القلوب

(۵)۔الرّقاب

(۶)۔غارمین

(۷)۔فی سبیل اللہ

(۸)۔ابن السبیل

غرض ان تمام اقسام کے لوگوں کا خواہ مرد ہو یا عورت، یہ حق ہے انہیں امراء اپنے مال میں سے ان کا حصہ دیں۔

زکوٰۃ کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے اور مختلف مسائل کے جوابات کے لئے مطالعہ کریں ''فقہ احمدیہ'' جلد اوّل عبادات میں زکوٰۃ کا باب۔

زکوٰۃ کے تعلق میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ حکومت کے نظامِ تحصیل کے ماتحت یا کسی جماعتی نظام کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے افراد کو جو سرکاری لگان، ٹیکس یا دیگر چندے دینے پڑتے ہیں ان کی موجودگی میں زکوٰۃ کا محل کونسا باقی رہ جاتا ہے۔ آیا حکومت وغیرہ کو ان کے واجبات ادا کرنے کے بعد افراد پر زکوٰۃ پھر بھی واجب الادا ہوگی؟ اِس سوال کے جواب میں اگر ان امتیازات کو سامنے رکھا جائے جس سے فریضۂ زکوٰۃ ممتاز ہے تو مذکورہ بالا سوال کا حل سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جن شرائط کے ساتھ زکوٰۃ اسلام میں جاری کی گئی ہے وہ ایسی خصوصیات ہیں جو صرف اسلامی نظام کے ساتھ مختص ہیں اور حکومتوں کا نظام اس سے قطعاً محروم ہے۔ وہ امتیازات حسب ذیل ہیں:۔

(۱)۔زکوٰۃ وصدقات کے بارے میں اسلامی حکم ان امور میں سے ہے جوعبادات میں شامل ہیں اور جن میں قرب وحصولِ رضاءِالٰہی کومدنظر رکھا گیا ہے۔

(۲)۔زکوٰۃ حقوق العباد میں سے واجب الاداتمدنی حق ہےاوراس کی غرض وغایت تزکیۂ نفس اور سوسائٹی سے غربت کو دور کرنا یا بالفاظِ دیگر اقتصادی توازن بحال کرنا اور اسے برقرار رکھنا ہے۔جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اس بنیادی غرض وغایت کی بایں الفاظ صراحت ہے۔تؤخَذُ من اغنیاءِھم وتُرَدُّ الٰی فُقَراءِھم ۔دولتمندوں سے زکوٰۃ لی جائے اور محتاجوں کو دی جائے۔

(۳)۔جس اصل کی بناء پر زکوٰۃ قائم کی گئی ہے وہ استفادہ (یعنی فائدہ حاصل کرنے) و افادہ (یعنی فائدہ پہنچانے) میں بہت وسیع ہے۔کیا بلحاظ مصادرِ زکوٰۃ کے اور کیا بلحاظ مصارف کے یعنی زکوٰۃ کے اموال حاصل کرنے کی غرض سے اسلام کا نظامِ نصاب بعض شرائط کے ساتھ تمام اموال پر حاوی وساری ہے۔سوائے ان اشیاء کے جو ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔جن کے لئے تصریح کی گئی ہے۔اسی طرح بلحاظ زکوٰۃ کے مصرف (موقعہ خرچ) کے اس کو بہت بڑی وسعت حاصل ہے۔اوراس میں کمزورافراد کی اقتصادی حالت کی اصلاح مقدم ہے۔

(۴)۔نصاب کے تعین میں افراد کی معاشی ضرورتوں کو مقدم رکھا گیا ہے۔یعنی افراد کی جو حقیقی ضرورتیں ہیں انہیں مدنظر رکھ کر مختلف قسم کے مال میں ایک استثنائی حد مقرر کی گئی ہے جس پر زکوٰۃ نہیں اور جب اس استثنائی حد سے زیادہ مال ہو تو زکوٰۃ عائد ہوگی۔اس استثنائی حد کو نصاب کہتے ہیں۔

(۵)۔افراد وملت کی اقتصادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی اعتبارات کو اسلامی نظامِ صدقہ وزکوٰۃ میں خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے۔اورشریعت کے اس مالی نظام میں انسانی مابہ الامتیاز کو محفوظ رکھا گیا ہے۔یعنی ارادہ کی آزادی اور خوشئ نفس کے ساتھ حکم کی بجا آوری جس میں کسی غیر اللہ کا کسی قسم کا دخل نہیں۔صدقہ وزکوٰۃ دینے میں غیر اللہ کے دباؤ اور

خارجی جبرواکراہ کے لئے گنجائش نہیں۔ یہ خصوصیات مجملاً وہ ہیں جن سے دوسرے حکومتوں کا نظام تقریباً محروم ہے۔ان کے سامنے وہ اخلاقی یا روحانی مقصد ہی نہیں جو زکوٰۃ وصدقہ میں ملحوظ ہے۔اور یہ مقصد ایسا اہم ہے کہ اصولی طور پر اسکی فرضیت دائمی ہے۔اور اگر بالفرض لوگوں میں غربت واحتیاج نہ رہے۔اور کوئی غریب صدقہ قبول کرنے والا نہ ملے تب بھی ایک صاحب نصاب پر اپنے اموال کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔

امام بخاریؒ نے مذکورہ بالا امور کو شروع ابواب زکوٰۃ میں بطور تمہید کے واضح کیا ہے۔اور زکوٰۃ کے متعلق مستند احادیث بیان کرتے ہوئے وقفہ وقفہ کے بعد ان مقاصد کے بارے میں توجہ دلائی ہے۔اور یہ مقاصد اپنی نوعیت وتعین میں ایسے ہیں جو غیر اسلامی حکومتوں کے نظامِ مالیات سے اسلامی نظام مالیات کو نمایاں طور پر ممتاز کردیتے ہیں۔

اِس تبصرہ سے ظاہر ہے کہ حکومتوں کے نظام میں جو کہ خالصةً دنیوی اغراض کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا شرطیں اور اغراض نہیں پائی جاتیں اسلئے یہ خیال کرنا کہ چونکہ مالیہ اور ٹیکس وغیرہ دئے جاتے ہیں محض اس قسم کی ادائیگی کی وجہ سے وہ زکوٰۃ کے قائم مقام ہو سکتے ہیں درست نہیں۔البتہ صرف ایک صورت میں جہاں تک ظاہری اموال کا تعلق ہے وہ زکوٰۃ کے ضمن میں محسوب ہوسکتے ہیں۔اور وہ صورت یہ ہے کہ انسان اپنی نیت کو درست کرے۔ کیونکہ اعمال کا سارادارومدار نیتوں پر ہے۔جیسا کہ مشہور حدیث ہے: الاعمال بالنیات۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لقمہ کو بھی صدقہ قرار دیا ہے جو خاوند اپنی بیوی کے منہ میں حصولِ رضاء الٰہی کے لئے ڈالتا ہے۔صدقہ کے معنی ہروہ کام جو خالصةً اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوٰهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا○

(نساء آیت:115)

”یعنی ان لوگوں (کے مشوروں) کو مستثنٰی کر کے جو صدقہ یا نیک بات یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کا

حکم دیتے ہیں ان کے بہت سے مشوروں میں کوئی بھلائی نہیں (ہوتی) اور جو شخص اللہ کی رضا جوئی کے لئے ایسا کرے گا ہم اسے جلد ہی بہت بڑا اجر دیں گے۔''

اِس آیت کریمہ میں اس امر کی تصریح ہے کہ نیک کام خواہ وہ عام دستور کے مطابق ہی ہو جب اللہ تعالیٰ کی رضاء جوئی کے لئے کیا جاتا ہے تو وہ کام نتیجہ اور ثواب کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور قابلِ قدر ہے۔

بخاری کتاب الایمان میں جہاں زکوٰۃ کے حکم کو ارکانِ اسلام میں شامل کیا گیا ہے۔ وہاں احتساباً کا لفظ ہے یعنی رضاءِ الٰہی کی خاطر زکوٰۃ ادا کرنا۔ اور اس تعلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہر نیکی خواہ رائی کے دانہ کے برابر ہو ایمان اور نیت کی برکت کی وجہ سے اس کو بہت بڑی قیمت حاصل ہو جاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو بخاری باب 34:14) اسلئے جو شخص صدق دل سے چاہتا ہے کہ زکوٰۃ کے بارے میں وہ رکنِ اسلام کا پابند عنداللہ قرار پائے اس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے۔ کہ وہ اپنی نیت درست کرے اور پھر اپنی آمد کا نصاب کی رو سے جائزہ لے اور دیکھے کہ جو ٹیکس وغیرہ اس کی طرف سے دئے گئے ہیں اگر واجب الاداز کوٰۃ سے کم ہیں تو باقی ماندہ زکوٰۃ اپنے مال سے سال گذرنے پر نکالے۔ اور اگر اس کی طرف سے زیادہ ادا ہوا ہے تو وہ زیادتی اسکی طرف سے بطور صدقہ ہو سکتی ہے۔ یہ فتویٰ جو ہمارے دارالافتاء سے دیا جا چکا ہے۔ اسکا اطلاق ظاہری اموال پر ہوتا ہے۔ لیکن اموال باطنہ، نقدی، سونا، چاندی وغیرہ اندوختہ کی زکوٰۃ کے بارے میں اس کا فتویٰ یہی ہے کہ انکم ٹیکس کسی صورت میں بھی ان اموال کی زکوٰۃ کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضروری ہے کہ انکم ٹیکس کے باوجود اموال کی زکوٰۃ مقررہ شرائط کے ساتھ صاحب نصاب خود ادا کرے۔ لیکن اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کو زکوٰۃ پر ہی منحصر نہیں رکھا بلکہ طوعی صدقات کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے۔

دراصل زکوٰۃ کے نظام کا تعلق عام حالات سے ہے۔ استثنائی حالات کی نزاکت کے پیش نظر اسلام نے ایک اور قانون بھی جاری کیا ہے جس کا منشاء نفس ونفیس کی قربانی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ۔ وَعْداً عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرَاتِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ۔ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ o

(توبہ آیت:112)

یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں اوران کے مالوں کو (اس وعدہ کے ساتھ) خرید لیا ہے کہ انکو جنت ملے گی۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں لڑتے ہیں۔ پس (یاتو وہ) اپنے دشمنوں کو مار لیتے ہیں یا خود مارے جاتے ہیں۔ یہاں ایک ایسا وعدہ ہے جو اسپر لازم ہے (اور) تورات اور انجیل (میں بھی بیان کیا گیا ہے) اور قرآن میں (بھی) اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہے۔ پس (اے مومنو!) اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے کیا ہے اور یہی وہ بڑی کامیابی ہے (جس کا مومنوں کو وعدہ دیا گیا ہے)

اس قسم کی غیر معمولی قربانی کا ذکر قرآن مجید میں جابجا کیا گیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس قربانی کے بارہ میں وقتاً فوقتاً تاکید فرمائی اور اسوۂ حسنہ پیش کیا اور صحابہ کرامؓ نے بھی اس تعلق میں عظیم الشان قربانی کا نمونہ پیش کیا۔ علمائے اسلام نے بھی اپنی تشریحات میں اسلام کے اس استثنائی قانونِ انفاق کو صراحت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ شاہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے زمانہ کے مجدد تھے اور انہیں مجددین اکابر میں شمار کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ غیر معمولی حوادث کے تدارک کے لئے ضروری ہے کہ علاوہ زکوۃ کے انفاق فی سبیل اللہ کا وسیع انتظام کیا جائے کیونکہ زکوۃ کا انتظام محدود ہے جو غیر معمولی تمدنی حوادث کو پورا نہیں کرسکتا۔ (حجۃ البالغہ جز2، صفحہ:42) اور سبیل اللہ کی شرح کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ساتواں مصرف جس کا تعلق زکوۃ سے ہے اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔ جہاد اور اس کے علاوہ تمام ضرورتیں اس میں شامل ہیں۔ جو ملک اور اسلام کی بہبود کے لئے ضروری ہیں۔ قرآن مجید نے سبیل اللہ کی جو وضاحت وشرح فرمائی ہے ان تشریحات سے واضح طور پر

معلوم ہوتا ہے کہ سبیل اللہ کا تعلق درحقیقت اوّل درجہ پر دین اور اس کی حفاظت سے ہے سبیل اللہ کے بالمقابل سبیل الطاغوت کا لفظ وارد ہوا ہے۔ یعنی شیطانی راستے جو انسان کو دراعتدال سے ادھر اُدھر لے جاتے ہیں اور قرآن مجید میں ایک جگہ سبیل اللہ کے متعلق واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ وہ ہدایت کامل ہے جس سے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:-

وَمَن يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِن بعد ما تبيّن له الهدٰى ويتّبع غير سَبيلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِيْهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًاo

(صفحہ:198)

جو شخص بھی ہدایت کے پوری طرح کھل جانے کے بعد رسول سے اختلاف ہی کرتا چلا جائے گا۔ اور مومنوں کے طریق کے سوا (کسی اور طریق) پر چلے گا ہم اسے اس چیز کے پیچھے لگا دیں گے۔ جسکے پیچھے وہ پڑا ہوا ہے۔ اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

اس آیت سے الھدٰی کو سبیل المومنین قرار دیا ہے اور اس کامل ہدایت کو دوسری جگہ سبیل اللہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:-

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ. وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ.

(النحل)

یعنی (اے رسول!) تو (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دے۔ اور جو سب سے اچھا طریقہ ہو اس کے ذریعہ ان سے (ان کے) اختلافات کے متعلق بحث کر۔ تیرا رب انکو (بھی) جو اسکی راہ سے بھٹک گئے ہوں (سب سے) بہتر جانتا ہے اور انکو بھی جو ہدایت یافتہ ہیں۔

غرض قرآن مجید کے مطالعہ سے واضح طور پر سبیل اللہ کا مفہوم آشکار ہو جاتا ہے کہ یہ وہ راہ ہے جو انسانکو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہے۔ مصارفِ زکوٰۃ کے تعلق میں قرآن مجید نے ساتواں مصرف فی اللہ اللہ قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں صرف کرنا۔ اس سے ظاہر

ہے کہ جب دین خطرے میں ہو اور طاغوتی قوتیں اپنے ٹیڑھے راہ کو غالب کرنے کی کوشش میں ہوں اور دین وملت غیر معمولی خطرات میں گھرے ہوں تو پھر شریعت اسلامی کے دوسرے قانون پر عمل ہوگا جو نفس ونفیس کی غیر معمولی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔جیسا کہ صحابہ کرام نے کیا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جس نازک دَور سے ہم گذر رہے ہیں اس کے پیش نظر تجدید واحیاءِ ملت کے تعلق میں ایک مسلمان پر مال ومنال کی قربانی کے لحاظ سے عظیم الشان ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ نازک اور پُرخطر حالات جنکا تعلق عالمگیر اصلاح کے ساتھ ہے بہت بڑے اخراجات کا مطالبہ کرتا ہے جو محض زکوٰۃ یا معمولی چندوں سے پورا نہیں ہوسکتا۔جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ اپنے خطبات میں اس ضرورت کی طرف جماعت کو ہمیشہ توجہ دلاتے رہے ہیں۔موجودہ نازک حالات میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کو دنیوی ضرورت کے لئے جو ٹیکس دیئے جاتے ہیں یا جماعتی ضروریات کے لئے جو تھوڑا بہت چندہ دیا جاتا ہے وہ زکوٰۃ میں محسوب ہوں یا نہ؟ بے شک فتویٰ کے لحاظ سے جہاں تک اموال ظاہرہ کا تعلق ہے جواز کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔مگر فتویٰ سے بڑھ کر تقویٰ کا مقام ہے۔اور موجودہ زمانہ کے پرخطر حالات کا تقاضا ہے کہ استثنائی قانون پر عمل کیا جائے۔صحابہ کرام نے قرآن مجید کے احکام کو سمجھ کر جہاں زکوٰۃ وصدقات سے متعلقہ احکام پر عمل کیا وہاں غیر معمولی قانونِ شریعت کا منشاء بھی اپنی اعلیٰ درجہ کی قربانی سے پورا کیا۔

رضاءِ الٰہی کا پیاسا انسان تو نہ صرف یہ کہ وہ حساب وکتاب کی میزان میں ہی پورا اترتا ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر قربانی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یقینا یہ امر مصلحتِ وقت کے تقاضا کے خلاف ہوگا۔اگر ہم میں سے کوئی سرکاری ٹیکس یا جماعتی چندہ ادا کرنے کے بعد حساب کرنے بیٹھ جائے کہ زکوٰۃ میں اسکا ادا کردہ ٹیکس یا چندہ کس قدر وضع ہو غیر معمولی حالات کے ماتحت علماء اسلام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ وقتی ضرورتوں کی تعین اور مصارفِ زکوٰۃ اور بیت المال کی آمد اور اخراجات کے سوال کا فیصلہ درحقیقت امامِ وقت سے ہے۔اس کا فیصلہ اس بارہ میں

ناطق ہے۔

خلاصہ یہ کہ عام حالات میں اَور قانون ہے اور خاص حالات میں اور۔ ایک سچے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اعمال کا خود جائزہ لے اور دیکھے کہ آیا دین وملّت غیر معمولی حالات سے دو چار ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو اس وقت اسلام کے غیر معمولی قانوں کو مقدم کرتے ہوئے اس کے منشاء کو پورا کرے۔ کیونکہ اگر وقت کی نزاکت غیر محدود اخراجات کا تقاضا کرے تو مومن کو اسوقت غیر محدود قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ سچے مومن کا تعلق درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ جس میں محاسبۂ نفسی ہی اسکی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری دفعہ ان کی بہن حضرت اسماءؓ سے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اسطرح گن گن کر تھوڑا تھوڑا خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسکے ساتھ اپنی عطاء میں اسی طرح سلوک فرماتا ہے اور آپ نے مال جمع رکھنے یا انفاق فی سبیل اللہ میں تنگ ظرفی برتنے کو ناپسند فرمایا۔

زکوٰۃ اور صدقات کے بارہ میں قرآنی ارشادات

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اپنے مال میں سے دیگر لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی جس قدر سختی سے تلقین فرمائی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآ کریم میں کہ جس کا ہوحکم ماننا مسلمان کے لئے ضروری ہے، متعدد آیات زکوٰۃ وصدقات کے بارہ میں نازل فرمائی ہیں۔ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:۔

سورۃ التوبہ آیت ۱۰۳	البقرۃ ۲۶۲
البقرہ ۲۶۶	سبا ۳۷
التوبہ ۷۱	التوبہ ۳۴ اور ۳۵
آل عمران ۱۸۱	البقرہ ۲۶۹
الروم ۴۰	التوبہ ۷۲

التوبہ آیت ۷۵ تا ۷۷ لنور ۳۸ اور ۳۹

مذاہب عالم میں مذہبی آزادی اور آزادیٔ ضمیر کا حق اور اسلامی تعلیمات کے امتیازات

بانیٔ اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم، بربریت اور تعصّبات کی دنیا میں مبعوث ہو کر عدل واحسان، مذہبی رواداری اور آزادیٔ ضمیر کی ایسی اعلیٰ اور احسن تعلیم دی ہے کہ اسکی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ آزادیٔ ضمیر کے حق کا اعلان دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قبل آزادیٔ ضمیر کا کوئی نام ونشان تک بھی نہ تھا۔ دنیا میں طاقت وزور سے جارحانہ طور پر کسی بھی ملک میں گھس جانا اور جبراً تلوار کے زور سے کسی کے دین اور مذہب کو بدل کر دوسرے مذہب میں شامل کر لینا نہ صرف جائز بلکہ دینی فریضہ سمجھا جاتا تھا اور اس سلسلہ میں دوسروں کے حقوق کا بالکل بھی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی وہ وجود ہیں جنہوں نے مذہب کے معاملہ میں جبر کو کلی طور پر ناجائز قرار دے کر آزادیٔ ضمیر کا سبق دیا اور بتایا کہ ہر انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا پسندیدہ مذہب چن سکتا ہے اور ہمارا کام صرف تبلیغ کرنا اور پیغام پہنچانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

يَاأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۖ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۖ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۖ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

(المائدہ:68)

اے (برگزیدہ) رسول! جو کچھ تیری طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے (وہ سارا لوگوں کو) پہنچا دے، اور اگر تو نے (ایسا) نہ کیا اور تُو نے اس (ربّ) کا پیغام پہنچایا ہی نہیں، اور اللہ (مخالف) لوگوں سے تیری حفاظت فرمائے گا۔ بیشک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

گویا اس ارشاد باریٔ تعالیٰ کے مطابق آپؐ پر یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ جو حق اور صداقت

اسلام کے رنگ میں آسمان سے نازل ہوئی ہے اُسے اپنے تک نہ رکھیں بلکہ لوگوں تک پہنچائیں چنانچہ آپؐ نے اس فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں ہر قسم کے دکھ اور تکالیف برداشت کئے اور تن من دھن کی بازی لگا کر لوگوں تک پیغام حق پہنچایا۔ لیکن یہ سب کچھ دلائل و براہین سے پیار و محبت سے نہ کہ جبر اور تشدد اور تلوار سے۔

پھر اسلام کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس نے دیگر مذاہب و اقوام کے ساتھ عدل و انصاف کی نہ صرف تعلیم دی بلکہ بانیٔ اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ نے اس پر عمل کر کے غیر مذاہب کے ساتھ رواداری اور احسان کے بہترین نمونے پیش کئے۔ بے شک اسلامی تعلیم میں قیام عدل کی خاطر ظلم کا بدلہ لینے کی اجازت دی گئی ہے لیکن عفو کو زیادہ پسند کیا گیا ہے اور فرمایا کہ اس کا اجر خدا نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

(سورۃ الشوریٰ 41)

غیر قوموں اور مذاہب کی مذہبی زیادتیوں کے جواب میں کسی قسم کی زیادتی کرنے سے منع کرتے ہوئے اسلام یہ تعلیم دیتا ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۳﴾

(المائدہ:3)

ایسی قوم قوم جس نے تمہیں بیت اللہ سے روکا، اس کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ اکسائے کہ تم زیادتی کر بیٹھو بلکہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾

(المائدہ:9)

اسلام نے صرف یہ اصولی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ تفصیل میں جا کر مشرکین کے برابر کے حقوق بھی قائم فرمائے۔ چنانچہ زمانۂ جنگ میں اگر مومن عورتیں دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کر کے آجائیں تو انہیں واپس کرنے کی بجائے ان کی مشرک قوم میں ان عورتوں کے ولی کو وہ اخراجات ادا کرنے کا حکم ہے جو انہوں نے مومن عورتوں پر کئے۔ اور کافر عورتوں سے زبردستی نکاح کرنے اور انہیں اپنے پاس روک رکھنے سے منع فرمایا اور انہیں واپس مشرکین کے پاس لوٹاتے ہوئے مسلمانوں کو ان اخراجات کے مطالبہ کا حق دیا جس طرح کفار کو یہ حق حاصل ہے۔

اسلام نے دشمن قوم حتیٰ کہ مشرکین کا امن کے ساتھ زندہ رہنے کا حق بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ فرمایا:۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

(سورۃ التوبۃ:7)

ترجمہ: اور مشرکوں میں سے اگر کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سن لے پھر اسے اس کی محفوظ جگہ تک پہنچادے یہ (رعایت) اس لئے ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جو علم نہیں رکھتے۔

رسول کریمؐ کے ذریعہ رواداری کی یہ اعلیٰ تعلیم دی گئی کہ غیر مذاہب یا قوم میں بھی جو خوبی یا نیکی پائی جاتی ہو اس کی قدردانی کرنی چاہئے۔ اللہ فرماتا ہے:۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝

(سورۃ آل عمران:114)

تسارے اہل کتاب برابر نہیں ہیں ان میں سے ایک جماعت (نیکی) پر قائم ہے۔ جو راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے اور عبادت کرتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کی دیانت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

فَلَمَّآ اٰتٰـھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ بَخِلُوْا بِہٖ وَتَوَلَّوْا وَّھُمْ مُّعْرِضُوْنَ

(سورۃ آل عمران:76,77)

ترجمہ: ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کے پاس ڈھیروں ڈھیر مال بھی بطور امانت رکھ دو تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے مگر بعض ایسے بھی ہیں جو ایک دینار بھی واپس نہیں لوٹائیں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دوسرے ممالک کے لوگ اور خصوصاً عرب آزادیٔ ضمیر کی قدر نہ جانتے تھے۔ اور اسی بناء پر ایک دفعہ عربوں نے خواہش کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھوتہ کر لیں اور وہ اس طرح کہ ہم اللہ کی پرستش کرنے لگ جائیں اور تم بتوں کی بھی پرستش شروع کر دو۔ اس پر آپؐ نے اللہ کے حکم کے مطابق فرمایا۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ

(سورۃ الکافرون:7)

ترجمہ: تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے ہے۔

اس طرح نہ صرف آپؐ نے عربوں کی اس پیشکش کو ردّ فرمایا بلکہ اپنی پاکیزہ و اعلیٰ تعلیم اور عمل کی قدر و اہمیت بتاتے ہوئے آزادیٔ ضمیر کا ایسا عظیم الشان سبق سکھایا جو ہر فرد و قوم اور مذہب کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

چونکہ مستشرقین کی جانب سے بانی اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر کئے جانے والے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ نعوذ باللہ آپؐ آزادیٔ ضمیر کے قائل نہیں تھے۔ اور اس کے بجائے بانیٔ اسلام تلوار اور طاقت کے بل بوتے پر، ڈرا دھمکا کر، تشدّد کی راہ سے فیصلے کیا کرتے تھے۔ اسلئے خاکسار سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روشنی میں اس اعتراض کا اختصار کے ساتھ جواب پیش کرتا ہے۔

تاریخ اسلام کا یہ واقعہ زرّیں حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ سن 4 ہجری میں بنو نضیر کو ان کی چیرہ دستیوں اور غداری کے نتیجہ میں ان کی اپنی درخواست پر حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خیبر جانے کی اجازت دے دی جبکہ وہ اپنی شریعت کی رو سے واجب القتل تھے۔ انہیں حضور نبی

پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وعدوں پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ مسلمانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے ہاتھوں اپنے گھر مسمار کر کے تمام قیمتی سامان اپنی سواریوں پر لاد کر اس شان سے خیبر کو روانہ ہوئے کہ ان کے آگے پیچھے بینڈ باجے بج رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ گویا کوئی بارات جا رہی ہے۔

(رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری صفحہ ۱۱۶)

کیا آج دنیا میں آپ کسی مفتوح اور مغلوب قوم کا نام پیش کر سکتے ہیں جو اپنے فاتح کے سامنے اس قدر اشتعال انگیزی سے نقل مکانی کر رہی ہو اور فاتح ان کی اس جرأتِ رندانہ پر معمولی سا ردّ عمل بھی ظاہر نہ کرے۔ کیا اس مثال کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص صدقِ دل سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام میں آزادیٔ ضمیر کا فقدان ہے اور برداشت نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟

فتح مکہ کے موقعہ پر حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ہدایات دی تھی کہ سوائے اپنے دفاع کے کسی شخص پر حملہ نہ کیا جائے۔ ابتداء میں گیارہ افراد کے بارہ میں فیصلہ فرمایا کہ وہ اپنے سابقہ جرائم کی بناء پر واجب القصاص ہیں۔ پھر انکی تعداد چھ کر دی گئی جس میں سے چار مرد اور دو عورتیں واجب القتل قرار دئے گئے اور بالآخر چار مردوں میں سے صرف ایک 'ابن اخطل' قتل کیا گیا وہ بھی اس لئے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد ایک دن اس نے اپنے غلام کو صرف اس لئے قتل کر دیا کہ اس نے وقت پر کھانا تیار نہیں کیا تھا۔ قتل کے بعد یہ مکہ بھاگ آیا تھا۔ باقی تین میں ایک عکرمہ بن ابی جہل تھا۔ یہ بارہا مسلمانوں کے خلاف جنگ کر چکا تھا اور اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ صلح حدیبیہ کے بعد اس نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیف بنو خزاعہ پر حملہ کر کے بڑا خون خرابہ کیا تھا۔ دوسرا شخص ہبار بن اسود تھا۔ اس نے حضرت صاحبزادی سیدہ زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے موقعہ پر نیزہ سے حملہ کیا۔ حضرت زینب اونٹ سے نیچے گریں اور آپ کا حمل ساقط ہو گیا اور بالآخر مدینہ پہنچ کر اسی صدمہ سے وفات پا گئیں۔

یہ پہلو کس قدر سبق آموز ہے کہ جہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک غریب غلام کے قاتل کو معاف نہیں فرمایا وہاں اُس رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نورِ نظر حضرت سیدہ زینبؓ کے قاتل کو معاف فرمادیا۔

تیسرا شخص جس کے قتل کا آپ نے حکم دیا اور پھر اپنا فیصلہ واپس لے کر اس کی جان بخشی کی۔ وہ کاتب وحی عبداللہ بن ابی سرح تھا۔ اس نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وحی تو میرے پاس آتی ہے اور محمد مجھ سے سن کر لکھوا دیتا ہے۔

دو عورتوں میں سے صرف ایک عورت کو قتل عمد کے جرم میں سزائے موت دی گئی اور دوسری عورت ہندہ زوجہ ابوسفیان جس نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا اور ان کے ناک کان وغیرہ کاٹ کر ہار بنا کر اپنے گلے میں پہنا تھا اسے بھی معاف فرمادیا۔ حتیٰ کہ وحشی جس نے حضرت حمزہؓ کو برچھی مار کر شہید کر دیا تھا اور نعش کی بے حرمتی کی تھی اسے بھی معاف فرمادیا۔

فتح مکہ کے موقع پر صفوان بن اُمیّہ ان افراد میں سے ایک تھا جسے آپ نے قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ مکہ سے جدّہ بھاگ گیا تا سمندر کے راستہ یمن چلا جائے۔ ان کے عزیز عمیر وہب الجمعی نے ان کی جان بخشی کی درخواست کی جو حضور نے فوراً قبول فرمالی۔ عُمیر نے عرض کیا کہ جب تک حضور اپنی کوئی نشانی نہیں دیں گے وہ میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دستار مبارک عطا فرمائی۔ چنانچہ صفوان جدہ سے واپس آگیا اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے جبکہ مَیں نے اسلام قبول کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ فرمایا: ہاں، مَیں نے معاف کر دیا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد غزوۂ حنین کا واقعہ پیش آیا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفوان سے 100 زرہیں مانگیں۔ نبی پاک کی بخشش اور درگزر نے اسے بے خوف تو پہلے ہی کر دیا تھا۔ بڑی بیباکی سے بولا: اَغَصبًا یَا مُحَمَّدُ۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا مال زبردستی غصب کرنا چاہتے ہو؟ فرمایا نہیں نہیں۔ بَلْ عَارِیَۃً مَضْمُوْنَۃً۔ عاریۃً اپنی ضمانت پر مانگ رہا ہوں۔ فتح حنین کے بعد اس نے

دیکھا کہ مالِ غنیمت کے جانوروں سے پوری وادی بھری ہوئی ہے۔ کہنے لگا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اتنا مال کیا کروگے۔ فرمایا سارا تم لے لو اور ہزاروں جانور اسے بخش دئے۔

فتح مکہ کے موقعہ پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عفو ودرگزر اور آپ کے خُلقِ کریم اور وسیع حوصلہ کو دیکھ کر ہزاروں اہل مکّہ ایمان لے آئے۔ اور جو پیچھے رہ گئے وہ بتدریج اسلام قبول کرتے رہے۔ آپ نے کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنانا۔ اگر بزور مسلمان بنانا ہی ہوتا تو پھر یہ اعلان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ جو شخص اپنے گھر کے اندر رہے اس کی جان ومال محفوظ ہیں۔ جو خانہ کعبہ میں جا کر پناہ لے لے، جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اور جو بلال کے جھنڈے تلے آجائے وہ بھی محفوظ ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر مہاجرین نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہیں اہل مکہ نے سخت دکھ دے کر ان کے گھروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان مہاجرین نے درخواست کی کہ اب ان کے گھر انہیں واپس دلائے جائیں لیکن حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی یہ درخواست ردّ کر دی۔

(رحمۃ للعالمین صفحہ 109-110)

فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انصار کا جھنڈا دیا ہوا تھا۔ انہوں نے جوش میں آکر یہ نعرہ لگا دیا کہ آج کفارِ مکہ ذلیل کئے جائیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فوراً انہیں علم برداری کی عزت اور فخر سے محروم کر دیا اور جھنڈا واپس لے کر اعلان فرمایا کہ آج کے دن کوئی شخص ذلیل نہیں کیا جائے گا۔

عاجزی اور انکساری سے آپؐ کا سر جھکتے جھکتے کجاوہ سے جا لگا تھا۔ یہ باتیں سننی بھی آسان ہیں اور سینکڑوں سالوں کے بعد کہنی بھی آسان لیکن ان پر عمل وہی پاک وجود کر سکتا ہے جو کسی اور ہی زمین اور آسمان سے تعلق رکھتا ہو۔

جب ملک شام فتح ہوا تو وہاں کی عیسائی آبادی اسلامی حکومت کے ماتحت آگئی تو ایک دن جبکہ صحابیٔ رسول حضرت سہل بن حنیف اور قیس بن سعد قادسیہ کے شہر میں کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ

ان کے پاس سے ایک عیسائی کا جنازہ گذرا۔ یہ دونوں اصحاب اسے دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ ایک مسلمان نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحبت یافتہ نہیں تھا حیران ہوکر ان کو کہا کہ یہ تو ایک عیسائی، ایک ذمّی کا جنازہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم جانتے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی طریق تھا کہ آپ غیر مسلموں کا جنازہ دیکھ کر کھڑے ہوجاتے تھے اور فرماتے تھے کہ کیا ان میں خدا کی پیدا کی ہوئی جان نہیں ہے۔

(سیرت خاتم النبیینؐ حصہ دوم صفحہ 656-657)

مغیرہ بن شعبہ قبول اسلام سے پہلے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی تجارتی سفر پر روانہ ہوئے۔ راستہ میں انہوں نے موقعہ پر کر انہیں قتل کر دیا اور مدینہ بھاگ آئے اور سارا مال نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں ڈال کر کلمہ پڑھ کر اسلام لے آئے۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے مغیرہ اَمَّا مَالُكَ فَمَالُ غَدْرٍ فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِیْهِ کہ تیرا یہ مال دھوکہ سے کمایا گیا ہے۔ مغیرہ ہمیں اس مال کی حاجت نہیں۔

ایک قبیلہ کا سفیر مدینہ آیا۔ حق سفارت ادا کرنے کے بعد اس نے مدینہ میں رکنا چاہا اور اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ فرمایا یہ سفارت کے آداب کے خلاف ہے۔ پہلے واپس جاؤ، اپنا کام مکمل کرو پھر جب چاہو اسلام قبول کر لینا۔

ابوسفیان نے غزوہ احزاب کا بدلہ لینے کے لئے چند قریشی نوجوانوں کو لالچ دے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر آمادہ کیا۔ ایک نے حامی بھر لی۔ وہ خنجر چھپا کر مدینہ آیا۔ جب حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر اس پر پڑی تو دیکھتے ہی فرمایا اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک انصاری رئیس بن حُضَیر لپک کر اس سے چمٹ گئے اور ان کے ہاتھ میں اس کا چھپا ہوا خنجر آ گیا۔ اب کیا تھا قریشی نوجوان خوف سے کانپنے لگ گیا اور منّت کرنے لگا کہ میری جان بخشی کر دی جائے۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر سچ سچ بتادو کہ کس نیت سے آئے تھے تو معاف کر دیں گے۔ اس نے ابوسفیان کے منصوبہ سے آگاہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے فوراً معاف

فرما دیا۔ جوان مدینہ میں کچھ دن رہ کر اسلام لے آیا۔

(سیرت خاتم النبیین صفحہ 741-743)

طائف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جو ظالمانہ سلوک کیا گیا اس سے کون واقف نہیں۔ طائف کے سرداروں نے پتھر مار مار کر آپ کو لہولہان کر دیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب غزوہ حنین اور غزوہ اَوطاس ہوئیں تو طائف سے بڑی تعداد میں فوجیں دشمن کی مدد کے لئے آئیں۔ لیکن شکست فاش کے بعد طائف میں اپنے قلعوں میں محصور ہوگئیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کا محاصرہ کرلیا۔ چند دن کے محاصرہ کے بعد کسی طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اطلاع ملی کہ دشمن محاصرہ کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہے اور بھوک نے ان کی ہلاکت کو ان کے بہت قریب کر دیا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فوراً محاصرہ اٹھالینے کا فیصلہ فرمایا۔ صحابہ نے جنگی اصولوں کے پیش نظر عرض کیا کہ حضور اب یہ مجبور ہو چکے ہیں اور قلعہ فتح ہونے والا ہے۔ لیکن وہ پاک اور مقدس نبی جو ماں باپ سے بڑھ کر شفیق تھا ان جانی دشمنوں کو یوں بھوک کے ہاتھوں تڑپتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ آپؐ نے صحابہ کے مشورہ کو ردّ کر دیا اور محاصرہ اٹھا کر واپس مکّہ تشریف لے آئے۔

فتح مکہ کے بعد طائف سے ایک وفد نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کے لئے مدینہ آیا۔ ابھی تک یہ سب کے سب بت پرست اور مُشرک تھے۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے لئے مسجد نبوی کے صحن میں خیمے لگوانے کا حکم دیا۔ بعض صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ مشرک ہیں اور مشرک تو قُرآن کی رو سے نجس یعنی ناپاک ہیں۔ (سورۃ توبہ:28) انہیں مسجد میں ٹھہرانا کہیں مسجد کے تقدّس کے خلاف نہ ہو۔ فرمایا: ظاہری اعتبار سے یہ بھی اتنے پاک وصاف ہیں جتنے کہ تم ہو۔ ہاں جہاں قرآن کریم نے انہیں نجس قرار دیا ہے صرف انہیں معنوں میں کہ قلبِ انسانی مُہبطِ نزول باری تعالیٰ ہے۔ اور مشرکوں نے اس کی جگہ بت بٹھار کھے ہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس وضاحت سے سب صحابہ کے دل اطمینان سے بھر گئے۔

ایک بار حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ

میں ملاقات کے لئے آیا۔ یہ تبادلۂ خیالات مسجد نبوی میں ہو رہا تھا۔ بحث کے دوران ان کی عبادت کا وقت شروع ہونے پر انہوں نے اجازت مانگی کہ باہر جا کر کسی جگہ عبادت کر آئیں۔ حضور نے فرمایا: یہیں میری مسجد میں اپنے طریق پر عبادت کرلو۔

یہ عیسائی جب ابھی عبادت میں مصروف تھے اور جنوب کی بجائے ان کے منہ مشرق کی طرف تھے تو چند صحابہ مسجد میں پہنچے۔ غالباً ان صحابہ کی نظر اپنے آقا مولیٰ پر نہیں پڑی ہوگی۔ یہ صحابہ ان عیسائیوں کو مختلف سمت میں عبادت کرتے ہوئے دیکھ کر انہیں منع کرنے کے لئے آگے بڑھے تو حضور نبی پاک ﷺ نے سختی کے ساتھ انہیں روک دیا تا یہ ان عیسائیوں کی عبادت میں خلل نہ ڈالیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ مسجد خدا کا گھر ہے اور مَیں نے ہی انہیں عبادت کی اجازت دی ہے اور جب کوئی محض اللہ کی عبادت کر رہا ہو تو کسی انسان کا حق نہیں کہ اس میں روک پیدا کرے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مسجد نبوی کا کیسا بلند مرتبہ تھا۔ اے کاش آج مسلمانوں میں بھی یہ حوصلہ ہوجائے۔ ہم علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ ساری امت مسلمہ میں سوائے جماعت احمدیہ کے آج شاید ہی کسی دوسرے فرقہ کا اس پر عمل ہو۔ اے کاش شیعہ سنی، بریلوی، دیوبندی، سپاہ محمد، سپاہ صحابہ وغیرہ اس حسین اُسوۂ نبوی پر عمل پیرا ہوں تو ہمارا معاشرہ بھی کچھ سُکھ کا سانس لے سکے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم آزادئ ضمیر کی خاطر ایک مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ ایسا کوئی بھی واقعہ پیش نہیں ہوا کہ جس پر کوئی مخالف اسلام یہ اعتراض کر سکے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبر سے کام لیا ہے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ آزادئ ضمیر کا درس دیا اور آپؐ کی روزمرہ زندگی کے ایسے بیشمار واقعات ہیں جو مذہبی رواداری اور آزادئ ضمیر کی تعلیم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ خلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر آپؐ کو کسی شخص کے متعلق یہ علم ہو جاتا کہ وہ شخص خوشی سے اور دل سے مسلمان نہیں ہوا بلکہ ڈر سے اسلام قبول کر رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کا اسلام قبول نہیں فرماتے تھے۔

چنانچہ اس ضمن میں احادیث میں بہت سارے واقعات ملتے ہیں مگر اس جگہ خاکسار صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ جب بنو نضیر مدینہ سے جلاوطن کئے گئے تو اُن میں وہ لوگ بھی تھے جو انصار کی اولاد تھے۔ انصار نے اُنہیں روک لینا چاہا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآنی آیت کے ماتحت کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیئے، انصار کو منع فرمادیا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔

(ابوداؤد کتاب الجہاد)

؎

جمالِ مہر ووفا کے قصے کمالِ صدق وصفا کی باتیں
جو ہوسکے تو سنائے جاؤں تمہیں حبیب خدا کی باتیں

آج کی اس دنیا میں ماہرین کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں امن وامان قائم کرنے اور اہل دنیا کو فتنہ وفساد اور خونریزی سے محفوظ رکھنے کے لئے مذہبی رواداری سے بڑھ کر اور کوئی موثّر تعلیم نہیں ہے اور اس تعلیم کا اکمل واعلیٰ چہرہ ہمیں محض اسلام ہی میں نظر آتا ہے۔ اس میدان میں ہمارے آقا رحمۃً للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حیرت انگیز تعلیم اور اسوہ چھوڑا ہے اُسکی کوئی مثال نہیں ہے۔ مذہبی رواداری کے قیام کے لئے آپ نے ارشادِ ربّانی کی روشنی میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک قوم یا ملک کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ربُّ العلمین ہے۔ ساری دنیا کا مالک ہے۔ جسطرح اس نے اہل دنیا کی جسمانی زندگی کے لئے ایسے سامان پیدا کردئے ہیں جو کسی ایک قوم یا ملک کے لئے مختص نہیں مثلاً سورج، چاند، پانی۔ اسی طرح اسکی ازلی رحمت نے روحانی زندگی کے لئے بھی سب کے ساتھ مساویانہ سلوک فرمایا ہے۔ یہ اسلامی تعلیم اپنے آپ میں ایک امتیازی شان کی حامل ہے اور کسی دوسرے مذہب نے ایسی اعلیٰ تعلیم دنیا کے سامنے پیش نہیں کی بلکہ اکثر نے تو خدا کو اور اسکی رحمتوں کو صرف اپنی قوم تک مدود قرار دیا ہے گویا کہ خدا صرف انکی قوم کا ہی ہے جیسا کہ یہود ونصاریٰ اور ہندوؤں نے الہام الٰہی اور انعام نبوت کو صرف اپنے ساتھ مختص خیال

کیا جبکہ دوسری جانب اسلام نے یہ اصول بیان کیا کہ ھدایت کا حق تمام بنی نوع انسان کو یکساں حاصل ہے کیونکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی عیال ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کسی بھی قوم یا ملک کو اپنی رحمت اور انعام سے محروم نہیں رکھا۔

اسلام میں آزادی ضمیر اور مذہب کی آزادی کی تعلیم کے حسن کا اندازہ کرنے کے لئے دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنا بہت مفید ہوگا۔لیکن واضح رہے کہ اس مضمون کا مقصد مذہبی منافرت یا تعصب پھیلانا ہرگز نہیں بلکہ جیسا کہ بانی جماعت احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی ءمعہودؑ فرماتے ہیں۔

''جب ہمارا دل بہت دکھایا جاتا ہے اور ہمارے نبی کریم پر طرح طرح کے ناجائز حملے کئے جاتے ہیں تو صرف متنبہ کرنے کی خاطر انہیں کی مسلمہ کتابوں سے الزامی جواب دیئے جاتے ہیں۔''

(ملفوظات جلد9 صفحہ 479)

نیز فرمایا:

''اس بات کو ناظرین یاد رکھیں کہ عیسائی مذہب کے ذکر میں ہمیں اسی طرز سے کلام کرنا ضروری تھا جیسا کہ وہ ہمارے مقابل پر کرتے ہیں۔''

(مجموعہ اشتہارات جلد2 صفحہ 295)

قارئین اب ملاحظہ کریں عہد نامہ عتیق و جدید سے بعض حوالے ۔ یہود و نصاریٰ کی توریت میں غیر قوموں کے ساتھ حسن سلوک کے لیے یہ تعلیم دی گئی :۔ یہ حوالے نیو اردو بائبل ورشن 2004ء آن لائن ایڈیشن سے لئے گئے ہیں:۔

خدا ہی جنگ سکھاتا ہے

''خداوند میری چٹان مبارک ہو۔ جو میرے ہاتھوں کو جنگ کرنے اور میری انگلیوں کو لڑنے کے قابل بناتا ہے۔''

(زبور 144 آیت 1)

جنگ محض خدا کی خاطر

''بہت سے لوگ قتل ہوئے۔اس لئے کہ جنگ خدا کی تھی۔''

(ا تواریخ باب 5 آیت 22)

'' سنو خداوند تمہیں یوں فرماتا ہیکہ اس لشکرِ جرّار سے دہشت زدہ یا پست ہمت نہ ہونا کیونکہ یہ لڑائی تمہاری نہیں بلکہ خداوند کی ہے''

(2 تواریخ باب 20 آیت 15)

خداوند کی لشکر گاہ میں موجودگی

'' خداوند تمہارا خدا تمہاری لشکر گاہ میں گھومتا رہتا ہے تا کہ تمہاری حفاظت کرے اور تمہارے دشمنوں کو تمہارے حوالے کر دے۔''

(استثناء باب 23 آیت 14)

''خداوند تمہارا خدا تمہاری خاطر تمہارے دشمنوں سے لڑ کر تمہیں فتح دلانے کے لئے تمہارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔''

(استثناء باب 20 آیت 4)

''اپنی لشکر گاہوں کو ناپاک نہ کر دیں جہاں میں خود ان کے بیچ میں رہتا ہوں۔''

(گنتی باب 5 آیت 3)

ربّ الافواج ،لڑائی کا ہتھیار

''ربّ الافواج اس کا نام ہے۔تُو میرا گرز اور لڑائی کا ہتھیار ہے۔ تیری مدد سے مَیں قوموں کو چکنا چور کرتا ہوں اور تیری ہی مدد سے میں سلطنتوں کو تباہ کرتا ہوں۔''

(یرمیاہ باب 51 آیات 20-19)

خدا کے تیر و تلوار خون کے پیاسے

''مَیں اپنے تیروں کو مقتولوں اور اسیروں کا خون پلا کر متوالا کروں گا اور میری تلوار دشمنوں کے سرداروں کے سروں کا گوشت کاٹے گی''

(استثناء باب 32 آیت 42)

''تلوار سیر ہونے تک کھاتی ہی رہے گی اور جب تک خون سے اپنی پیاس نہیں بجھالیتی ، رکنے کی نہیں۔''

(یرمیاہ باب 46 آیت 10)

انصاف۔شمشیر تاباں سے!

''جب میں اپنی شمشیر تاباں کو تیز کر کے انصاف کرنے کے لئے اسے اپنے ہاتھ میں لوں گا تو میں اپنے حریفوں سے انتقام لوں گا اور جو تجھ سے نفرت کرتے ہیں انہیں سزا دوں گا۔''

(استثناء باب 32 آیت 41)

جنگ کے متعلق احکامات

''جب خداوند تیرا خدا تجھ کو اس ملک میں جسپر قبضہ کرنے کیلئے تو جارہا ہے پہنچادے اور تیرے آگے سے اُن بہت سی قوموں کو یعنی حِتّیوں ۔۔۔۔۔۔کو جو ساتوں قومیں تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں نکال دے اور جب خداوند خدا ان کو تیرے آگے شکست دلائے اور تو ان کو مارے تو تُو ان کو بالکل نابود کر ڈالنا، تُو ان سے کائی عہد نہ باندھنا اور نہ ان پر رحم کرنا، تو ان سے بیاہ شادی بھی نہ کرنا نہ انکے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا اور نہ اپنے بیٹوں کیلئے انکی بیٹیاں لینا کیوں کہ وہ تیرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کردیں گے تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں یوں خداوند کا غضب تم پر بھڑکے گا اور وہ تجھ کو جلد ہلاک کر دیگا بلکہ تم ان سے یہ سلوک کرنا کہ انکے مذبحوں کو ڈھا دینا، انکے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور انکی یسیرتوں کو کاٹ ڈالنا اور انکی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں ڈال جلا دینا۔''

(استثناء باب 7 آیت 1 تا 6)

اسکے مقابل پر اسلام نے کیا کہا؟ دین میں کوئی جبر نہیں (البقرہ:۲۵۷)

مذہبی رہنما کا فوج سے خطاب

اور جب تم میدانِ جنگ میں اترنے کو ہو تب کاھن آگے بڑھ کر فوج سے مخاطب ہو اور وہ

یوں کہے:۔

''اے اسرائیلو سنو! آج تم اپنے دشمنوں سے لڑنے میدانِ جنگ میں اتر رہے ہو لہٰذا بزدل مت بنو اور خوف نہ کھاؤ نہ ہی ہراساں ہو اور نہ ان کے سامنے تم پر دہشت طاری ہو کیونکہ خداوند تمہارا خدا تمہاری خاطر تمہارے دشمنوں سے لڑ کر تمہیں فتح دلانے کے لئے تمہارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔''

(استثناء باب 20 آیات 2 تا 4)

دو دھاری تلوار ان کے ہاتھ میں رہے

''خدا کی ستائش ان کے منہ میں اور دو دھاری تلوار ان کے ہاتھ میں رہے تا کہ قوموں سے انتقام لیں اور امتوں کو سزا دیں اور ان کے بادشاہوں کو زنجیروں سے جکڑیں اور ان کے امرا کو لوہے کی بیڑیاں پہنائیں تا کہ جو سزا ان کے لئے مقرر تھی وہ اسے پورا کریں اس کے سب مقدسوں کو یہ شرف بخشا گیا ہے۔ خداوند کی ستائش کرو۔''

(زبور 149 آیات 6 تا 9)

دنیا کے تمام لوگوں پر تلوار

''پھر ان سے کہنا کہ ربّ الافواج، اسرائیل کا خدا فرماتا ہے:۔

''پیئو اور مست ہو جاؤ اور قے کرو اور گر پڑو اور پھر کبھی نہ اٹھو، اس لئے کہ مَیں تمہارے درمیان تلوار بھیجوں گا...... تم بے سزا نہ چھوٹو گے کیونکہ میں دنیا کے تمام لوگوں پر تلوار کو طلب کر رہا ہوں۔''

(یرمیاہ باب 25 آیات 27 تا 29)

خدا کا دن اور لوٹ مار کا مال

''دیکھو خدا کا وہ دن آتا ہے جب تمہاری لوٹ مار کا مال تمہارے درمیان بانٹا جائے گا۔''

(ذکریا باب 14 آیت 1)

مفتوح قوم سے سلوک

''جب تم کسی شہر پر حملہ کرنے کیلئے اسکے قریب پہنچو تو اسکے باشندوں کو صلح کا پیغام دو اگر وہ اسے قبول کر کے اپنے پھاٹک کھول دیں تو اس کے سب لوگ بیگار میں کام کریں اور تمہارے مطیع ہوں لیکن اگر وہ صلح سے انکار کر دیں اور لڑائی پر اتر آئیں تو تم اس شہر کا محاصرہ کر لینا اور جب خداوند تمہارا خدا اسے تمہارے ہاتھ میں کر دے تو اس میں سب مردوں کو تلوار سے قتل کر دینا۔ لیکن عورتوں بچوں اور مویشیوں اور اس شہر کی دوسری چیزوں کو تم مالِ غنیمت کے طور پر اپنے لئے لے لینا۔''

(استثنا باب 20 آیات 10 تا 14)

ایک قدم اور آگے

کسی ذی نفس کو زندہ نہ چھوڑنا: ''البتہ ان شہروں میں جنہیں تمہارا خداوند تمہارا خدا میراث کے طور پر تمہیں عنایت کر رہا ہے کسی ذی نفس کو زندہ نہ چھوڑنا''

(استثنا باب 20 آیت 16)

یشوع کا عمل تعلیمات کے عین مطابق

''پھر نرسنگے پھونکے گئے اور لوگوں نے للکارنا شروع کیا اور جب نرسنگوں کی آواز سن کر لوگوں نے زور سے للکارا تو دیوار گر گئی اور ہر آدمی سیدھا اندر کی طرف لپکا اور انہوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے شہر کو خداوند کی نظر کیا اور اسکے اندر کی ہر جاندار چیز کو یعنی مردوں اور عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں، مویشیوں، بھیڑوں اور گدھوں الغرض ہر کسی کو تلوار سے مار ڈالا''

(یشوع باب 6 آیات 20-21)

غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کے بارہ میں تعلیم

''اونچے پہاڑوں اور ٹیلوں پر کے اور ہر سرسبز درخت کے نیچے کے ان مقامات کو پوری طرح سے نیست و نابود کر دینا جہاں وہ قومیں جن کے اب تم وارث ہو گے ، اپنے معبودوں کی عبادت کرتی تھیں۔ ان کے مذبحوں کو ڈھا دینا۔ ان کے مقدس پتھروں کو توڑ ڈالنا اور ان کی یسیرتوں کو آگ لگا دینا۔ ان کے دیوتاؤں کے بتوں کو کاٹ کر گرا دینا اور ان کے نام تک ان

جگہوں سے مٹا دینا۔''

(استثناء باب 12 آیات 2-3)

نفرت کی تعلیم ؟

''خداوند تمہارے خدا نے تمہیں حکم دیا ہے تم حتّیوں، اموریوں، کنعانیوں، پرزّیوں، حوّیوں اور یبوسیوں کو بالکل نیست نابود کر دینا''

(استثناء باب 20 آیت 17)

''کوئی عمونی یا موآبی یا دسویں پشت تک اس کی نسل میں سے کوئی شخص خداوند کی جماعت میں داخل نہ ہونے پائے......تم زندگی بھر ان کے ساتھ دوستی کا معاہدہ مت کرنا۔''

(اسںأ باب 23 آیت 3،6)

''خداوند عمالیقیوں کے خلاف پشت در پشت جنگ کرتا رہے گا۔''

(خروج باب 17 آیت 16)

''اور تم ان اقوام کے رسم و رواج پر جنہیں مَیں تمہارے آگے سے نکالنے کو ہوں، مت چلنا کیونکہ انہوں نے یہ سب کام کئے ہیں مجھے ان سے نفرت ہوگئی ہے۔ لیکن مَیں نے تم سے کہا کہ تم انکے ملک پر قابض ہوگے۔ وہ ملک جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے مَیں اسے بطور وراثت تمہیں دوں گا مَیں خداوند تمہارا خدا ہوں جس نے تمہیں دیگر اقوام سے الگ کیا ہے۔''

(احبار باب 20 آیت 22 تا 24)

دیسی ہو یا پردیسی۔ پاک نام کی توہین پر سنگسار کیا جائے

''اور جو کوئی خداوند کے نام پر کفر بکے وہ ضرور جان سے مارا جائے اور پوری جماعت ضرور اسے سنگسار کرے اور خواہ کوئی دیسی ہو یا پردیسی جب وہ پاک نام لیتے وقت گستاخی کرے تو وہ ضرور جان سے مارا جائے۔''

(احبا باب 24 آیت 16)

مضمون کی طوالت کے خوف سے انہی اقتباسات پہ اکتفا کیا جاتا ہے اور اب آخر پہ کچھ

حوالے عہد نامہ جدید سے ملاحظہ ہوں:۔

یسوع مسیح کا مشن

''یہ نہ سمجھو کہ مَیں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں''

(متی باب10 آیت 34)

''جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے، اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے لئے جان کھو دیتا ہے اسے سلامت پائے گا۔''

(متی باب10 آیت 39)

کپڑے بیچو، تلوار خریدو!

''جس کے پاس تلوار نہ ہو وہ اپنے کپڑے بیچ کر تلوار خرید لے۔''

(لُوقا باب22 آیت 36)

پاک روح کی توہین نا قابلِ معافی جرم

''مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ انسانوں کے سارے گناہ اور جتنا کفر وہ بکتے ہیں، معاف کیا جائیگا۔لیکن پاک روح کے خلاف کفر بکنے والا ایک ابدی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اس لئے اسے کبھی معاف نہ کیا جائے گا۔''

(مرقس باب3 آیات28 تا30)

خدا کے خادم کے ہاتھ میں تلوار

''خدا نے حاکم کو تیری بھلائی کے لئے خادم مقرر کیا ہے۔لیکن اگر تو بدی کرنے لگے تو اس بات سے ڈر کہ اس کے ہاتھ میں تلوار کسی مقصد کے لئے دی گئی ہے۔وہ خدا کا خادم ہے اور اس کے قہر کے مطابق ہر بدکار کو سزا دیتا ہے۔''

(رومیوں باب13 آیت4)

لوہے کے ڈنڈے سے حکومت

''پھر مَیں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور مجھے ایک سفید گھوڑا نظر آیا جس کا سوار باوفا اور برحق

کہلاتا ہے۔ وہ صداقت سے انصاف کرتا اور لڑتا ہے۔ اسکی آنکھیں آگ کے شعلوں کی مانند ہیں اور اسکے سر پر بہت سے تاج ہیں۔ اسکی پیشانی پر اسکا نام بھی لکھا ہوا ہے جسے سوائے اسکے اور کوئی نہیں جانتا۔ وہ خون میں ڈوبے ہوئے جامہ میں ملبوس ہے اور اسکا نام خدا کا کلمہ ہے...... اسکے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے تا کہ وہ اسے قوموں پر چلائے۔ وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا۔‘‘

(مکاشفہ باب 19 آیات 11 تا 15)

حضرت کرشنؑ کی تعلیم

چونکہ خاکسار کے مقالہ میں اس بات کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ دیگر مذاہب کی بھی اچھی تعلیمات کو بیان کیا جائے اسلئے خاکسار ہندو مذہب کے نبی حضرت کرشنؑ کی بعض تعلیمات کو بیان کرتا ہے اگرچہ ہندوؤں کی وہ مقدس کتب جن میں انسانی تحریف ہوئی ہے، حقوق العباد سے کوسوں دور ہیں لیکن پھر بھی بعض ایسی تعلیمات بھی ہیں جن کو بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ شری کرشن جی مہاراج نے اپنے آپ کو ویدوں کا پیروکار نہیں بتایا بلکہ ویدوں اور ویدک مذہبی رسومات کی شدت سے تردید کی۔ اپنے آپ کو ہمیشہ خدا نُما وجود اور ایک اوتار کے رُوپ میں پیش کیا۔ ساری عمر شریمد بھگوت گیتا کا پرچار کیا اور اپنے پیروکاروں کو صرف اور صرف بھگوت گیتا پڑھنے پڑھانے سُننے سُنانے کی تاکید کی۔ بعد میں قوم نے آپ کی تعلیمات میں بہت سا بگاڑ پیدا کر دیا بلکہ اس خدا نما وجود کو ہی خدا بنا دیا اور کرشن شکتی مندروں میں آپ کی مورتی کی پوجا شروع کر دی گئی۔

مساوات

آپ نے اچھوتوں، شُودروں، غلاموں اور طبقہ نسوان کو مساوات کی خوشخبری دی ہے۔

میرے واسطے خلق یکساں ہے سب
نہ اس سے محبت نہ اس سے غضب

(دل کی گیتا صفحہ ۱۹۶)

آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے حضور تمام مخلوق اپنے اپنے زمرہ میں مساوات کی حق دار ہے الخلق عِیَالُ اللہِ وسودھیو کٹنبکم دنیا کے سبھی لوگ خدا کا کنبہ ہیں ۔ اس کے نزدیک نہ کوئی برہمن ہے نہ شُودر، نہ سید ہے نہ پٹھان ۔ اسے نہ تو برہمن سے الفت و پیار ہے اور نہ ہی اچھوت سے نفرت و دشمنی اسی طرح آپ نے سماج کی اندرونی غیر منصفانہ تقسیم کی تردید فرمائی ۔

(بھگوت گیتا ۹:۲۹)

گیتا ۹:۳۲

بشر پاپ کے پیٹ سے ہو کوئی
وہ ہو شودر یا ویش یا استری
مجھے آسرا جب بنائے گا وہ
تو اعلیٰ منازل پہ جائے گا وہ

(دل کی گیتا صفحہ ۱۹۷)

ان دونوں شلوکوں ۹:۲۹، ۳۲ کا ترجمہ اور تشریح کے لئے ملاحظہ فرمائیں مموکشو بھاش بھگوت گیتا ۳۹۷، ۴۰۱ از منشی چھٹن لال جی ڈپٹی کلکٹر وممبر اودے پور کونسل

شریمد بھگوت گیتا ۹:۳۲ تو بہ

’’اے ارجن ! مجھ پرمیشور کو آشرے کر کے (پناہ بنا کر) جو پش پاپ یُونی بھی ہَیں اور استریاں، عورتیں اور ویش ہیں، اور شُودر ہیں، وہ سب ہی پرم گتی کو پراپت ہوتے ہیں ۔ یہ یقینی بات ہے‘‘

(مموکشو بھاش بھگوت گیتا ۹:۳۲ صفحہ ۴۰۱)

اے ارجن ! جو لیتے ہیں میری شرن
وہ ہوں پاپ یُونی و یا آنکہ زن

وہ یا ویش ہوں و یا کہ شُودر برن
لگائی انہوں نے جو مجھ سے لگن
پرم گتی حاصل کریں گے ضرور
وہ سب بھی یقین رکھ تُو اے ذی شعور

شرح:۔

کہا لفظ جو پاپ یُونی یہاں
ہیں چنڈال چوہڑے وغیرہ یہاں
زن وشُودر کا ذکر یوں ہے کیا
نہ ادِھکار ہے ان کو ویدآدِ کا

(مموکشو بھاش بھگوت گیتا ۹: ۳۲ صفحہ ۴۰۱)

پاپ یُونی سے مطلب ہے کہ نیچ جاتی اور نیچ ذات کی عورت سے پیدا ہونے والے، چوہڑے چمار، بھنگی، عورتیں، غلام، شُودر، اچھوت وغیرہ یہ سب نیچ اور اچھوت ہیں۔

(ستیارتھ پرکاش، صفحہ ۷۳، باب ۲، دفعہ ۱۲، ایڈیشن دہم داردو ۱۹۲۰)

یہ سب ویدوں اور ہندوؤں کے قانون کی رُو سے ویدوں کے پڑھنے، پڑھانے، علم حاصل کرنے سے اور نجات محروم ہیں۔ چاہے وہ کتنا بھی استغفار وتوبہ کریں۔ صدقہ وخیرات دان دیں۔ چونکہ یہ سب پاپ یونی سے متعلق ہیں لہٰذا توبہ کرنے کے باوجود نجات پانے سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ (منوسمرتی ادھیائے ۸، شلوک ۴۱۵) بلکہ ان کا سب سے بڑا دھرم برہمنوں کی سیوا کرنا ہے۔

(منوسمرتی ۱۰: ۱۲۳)

گذشتہ زمانوں (دواپر یگ) میں عورتوں وشودروں کو وید پڑھنے علم حاصل کرنے کی ممانعت تھی۔ یہاں فرمایا ہے کہ پاپ یعنی شُودر گھرانے کی عورت کے بطن سے پیدا ہونے والے

چانڈال ہوں، ویش ہوں، شُودر ہوں یا عورتیں ہوں، اگر وہ توبہ کر کے مجھ پرمیشور پر بھروسہ کرتے ہوئے میری طرف آئیں گے، تو انہیں اعلیٰ ترین درجے حاصل ہو جائیں گے۔

(دل کی گیتا۹: ۳۲ صفحہ ۱۹۷ حاشیہ)

جب اس بے بس و معصوم طبقے کے لوگ خلوص دل سے اسلام میں داخل ہوئے تو انہیں مساویانہ، برادرانہ حقوق عطا ہوئے، وہ غلا نہ رہ کر سیدنا بلال کہلائے۔ خاندان غلامانِ ہند کی پٹھانوں، سیدوں نوابوں وغیرہ نے اسی طرح تابعداری کی جس طرح وہ خلفائے مسلمین و شاہانہ مسلمین کی کیا کرتے تھے۔

سچے دل سے توبہ کرنے والا انسان گناہوں سے اس طرح پاک و مطہر ہو جاتا ہے جس طرح لباس دھلنے کے بعد صڈاف ہو جاتا ہے جیسا کہ گیتان گیان میں شری کرشن جی مہاراج نے بتایا ہے:۔

کوئی گرچہ دل سے بدکار ہے
مگر میرا دل سے پرستار ہے
اسے بھی سمجھ لے کہ سادھو ہے وہ
ارادے میں نیکی کے یکسو ہے وہ

(دل کی گیتا۹: ۳۰ صفحہ ۱۹۶)

اس شلوک ۹: ۳۰ کی مزید تشریح ملاحظہ ہوموکشو بھاگ بھگوت گیتا ۳۹۹ مؤلفہ منشی چھٹن لال جی ممبر اودے پور کونسل)

مذہبی رواداری سے پُر اسلامی تعلیمات

قارئین! مذاہب عالم میں سے صرف اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے دیگر مذاہب کے ساتھ بغض وعداوت کو فروغ دینے کی بجائے مذہبی رواداری کی احسن اور ارفع تعلیم دی ہے اور بانی اسلامؐ کی سیرت طیبہ مسلمانوں کے لئے اس میدان میں بھی ایک مشعل راہ کا کام دیتی ہے

چنانچہ یہ اسلام ہی کی امتیازی تعلیم ہے کہ اس نے غیر مذاہب کی خوبیوں کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی مقدس کتاب میں اس کا ذکر بھی کیا۔ ورنہ دوسرے مذاہب کی کتب میں اکثر اگر کسی غیر مذہب یا غیر قوم کا ذکر ہے تو اس طرح ان کی کوئی خوبی کا ذکر نہیں بلکہ برائیاں ہی گنوائی گئی ہیں اسی طرح ایک اور آیت میں بعض نیک فطرت خداترس عیسائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(سورۃ المائدہ: ۸۴)

بانیٔ اسلامؐ نے مذہبی رواداری کی یہ امتیازی تعلیم بھی دی ہے کہ مذہبی بحثوں کے دوران جوش میں آکر دوسرے مذہب کی قابل احترام ہستیوں کو برا بھلا نہ کہو بلکہ ان کے جذبات کا بھی پاس رکھو۔ بیشک تم حق پر ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تم فریق مخالف کے جذبات کو مجروح کرو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ ﴿۱۰۹﴾

(سورۃ الانعام: 109)

اور (اے مسلمانو!) تم ان کو گالی مت دو جنہیں یہ (مشرک لوگ) اللہ کے سوا پوجتے ہیں پھر وہ لوگ (بھی جواباً) جہالت کے باعث ظلم کرتے ہوئے اللہ کی شان میں دشنام طرازی کرنے لگیں گے۔

اب خاکسار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مذہبی رواداری کے پہلو پر کچھ تحریر کرتا ہے۔ قرآن شریف نے اصولی طور پر سیرت کے اس پہلو کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے اور اس بارہ میں دونوں غلط انتہاؤں سے پاک، افراط و تفریط سے خالی، حضورؐ کے اس خلق کا ایک پاکیزہ نقشہ تفصیل سے کھینچا ہے۔ چنانچہ ایک عمومی اور نامکمل نظر میں قرآن شریف کے کوئی نوّے مقامات سامنے آئے جہاں اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مذہبی رواداری سے مراد یہ ہے کہ اپنے مذہب کو صحیح سمجھتے ہوئے مختلف مذہبی عقائد رکھنے والوں کے وجود کو تسلیم کرنا۔ ان کے آزادیٔ ضمیر و عقیدہ کے حق کو قبول کرنا اور ان کے حقوق کا تحفظ اور ان کی ادائیگی کرنا۔ اختلافِ عقیدہ کو عدل وانصاف اور معروف معاشرتی تعلقات اور تحفظات کے رستہ میں حائل نہ ہونے دینا۔ اختلاف کی حدود کو غلط توسیع دینے کے بجائے

اشتراک واتحاد کے پہلوؤں کو اجاگر کرنا۔مخالف کی حقیقی خوبیوں کے اقرار میں ضد وتعصب کو روک نہ بننے دینا۔اپنے نقطۂ نظر کو مخالف تک احسن طریق سے پہنچانا اس کے جذبات کا خیال رکھنا۔اس کی قابل احترام شخصیات اور شعائر کی ہتک نہ کرنا اور زبان اور قلم اور ہاتھ سے ہر قسم کی جارحانہ سرگرمیوں سے بچنا۔اور ظاہر ہے کہ یہ رواداری۔یہ وصف حقیقتاً اسی صورت میں قابلِ تعریف ہوسکتا ہے جب انسان اپنے منصب کا پورے یقین سے قائل اور پوری شدت سے اس پر کاربند ہو۔اگر کوئی شخص عملاً یا عقیدۃً خود اپنے مذہب پر قائم نہیں اس کے دل میں اس کی صداقت کا یقین، اس کی اشاعت کے لئے تڑپ، اس کے استحکام کے لئے کوئی جذبہ وجوش نہیں تو ہوسکتا ہے کہ اس کی مذہبی رواداری دراصل اِس بے حسی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہو۔مغرب کی موجودہ چمک دمک سے غلط طور پر متاثر ہونے والے بعض دفعہ اہلِ مغرب کی مذہبی رواداری کا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی مذہبی جمود اور بے حسی کا ایک منفی پہلو ہے۔اہل مغرب کی رواداری کا جائزہ لینے کے لئے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ جب ان کے بین الاقوامی سیاسی منافع پر ضرب پڑتی ہے۔جب ان کی معاشی برتری زد میں آرہی ہو، جب ان کا پٹرول خطرہ میں ہوتو وہ کیا کچھ نہیں کرتے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مذہبی عقائد پر جو پختہ یقین جو مستحکم ایمان رکھتے تھے، اسلام کی اشاعت کے لئے حضورؐ کے دل میں جو تڑپ، جو جوش، جو لگن، جو جذبہ تھا اس کی خدمتیں جو ثابت قدمی اور اولوالعزمی حضورؐ سے ظاہر ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔مگر اس کے ساتھ ساتھ مخالفین سے مذہبی رواداری کا جو نمونہ آپؐ نے پیش فرمایا وہ بھی عدیم المثال ہے۔آپؐ کی مذہبی رواداری افراط وتفریط سے پاک تھی۔نہ حضورؐ نے اختلافِ مذہب کی بنا پر مذہبی رواداری کے بلند ترین مقام سے قدم ہٹایا اور نہ ہی مذہبی رواداری کے غلط استعمال کے ذریعہ اپنے بنیادی مذہبی عقائد پر آنچ آنے دی۔حضورؐ نے مخالف سے حسنِ سلوک کیا۔مگر مداہنت کے قریب نہ گئے۔اپنی ذات پر مخالفت کے ظلم وستم کو برداشت کیا اور کبھی انتقام نہ لیا۔مگر خدا کے محارم کی بے حرمتی پر جلالی تجلّی

بھی دکھائی۔مخالف کے آزادئ ضمیر وعقیدہ کے حق کو قبول کیا مگر مشیر ونذیر کے طور پر اپنی ذمہ رداریوں کو بھی احسن طریق سے ادا کیا۔مخالفین کے انبیاء واولیاء کی عظمت واحترام کے قیام کا شاندار نمونہ پیش کیا مگر غرور کا اظہار کئے بغیر اس بلند تر مقام کے بیان سے۔۔۔کہ جو اللہ کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا۔خود کبھی مخالف پر جارحانہ پیش قدمی نہ کی۔مگر اپنے زمانہ ماموریت کے نصف سے زیادہ سال ہر قسم کے دکھوں اور حملوں پر صبر کرنے کے بعد خدا کے اذن سے دشمنوں سے جارحانہ حملوں کا منہ توڑ جواب بھی دیا۔اور مخالف کو مغلوب بھی کیا۔مگر پھر معاف کر دیا۔بغیر ضد اور تعصب کے مخالفین کے بزرگوں،ان کی کتابوں،ان کے عقیدوں اور ان کے عوام کی خوبیوں کو تسلیم کیا مگر اپنے منصب کے لحاظ سے خود مخالفین کی ہمدردی اور ان کے فائدہ کے مدّنظر ان کی جن حد بندیوں اور کمزوریوں کا ذکر کرنا ضروری تھا۔بلا جھجک کیا۔ان کو دعوتِ اتحاد بھی دی مگر اپنے حق وحکمت کے اصولوں کو ترک نہ کیا۔ان سے رابطہ واشتراکات کو اجاگر کیا۔مگر امتیازات وخصوصیات کو بھی یاد رکھا۔الغرض ایک عجیب اعتدال،ایک لطیف توازن،جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز نظر آتا ہے،آپؐ کے خلقِ عظیم کے اس پہلو میں بھی نظر آتا ہے جس کو مذہبی رواداری کہا جاتا ہے۔

آپؐ کی سیرت کے اس پہلو کے متعلق چند باتیں قرآن شریف اور صحیح بخاری کی احادیث کی روشنی میں پیشِ خدمت ہیں:

پہلی بات

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مذہبی عدم رواداری کے اس بنیادی باعث کو کاٹ کر رکھ دیا گیا جو آپؐ کے ظہور کے وقت ساری دنیا پر حاوی تھی۔حضورؐ سے قبل ساری مذہبی دنیا میں ملک اور قوم اور رنگ اور نسل اور زبان کے امتیاز اور برتری کی دیواریں حائل تھیں۔حضورؐ دنیا میں تشریف لائے اور دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا:

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ا۟لَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ

اِلَّا هُوَ

(الاعراف:159)

یعنی اے ساری دنیا کے لوگو! جو کسی بھی ملک اور نسل اور زبان اور زمانہ سے تعلق رکھتے ہو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کی مملکت اس ساری کائنات پر حاوی ہے۔اب ساری دنیا کے لئے اُس کے سوا اَور کوئی معبود نہیں۔اب کسی قوم کا یہ تصوّر کہ ہم اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُهٗ ہیں۔ہم خدا کی خاص قسم ہیں ختم ہوا۔سب دنیا اب ایک قوم،ایک ملک اور ایک برادری ہے۔

مگر مذہبی رواداری کی اس عظیم مہم سے جو تاریخِ عالم میں پہلی دفعہ شروع کی گئی ان اقوام کو جو ماضی میں بلند روحانی مدارج حاصل کر چکی تھیں یہ غلط تاثر ہوسکتا ہے کہ ایسا ان کو اس بلند مقام سے نیچے آنا پڑے گا جس پر وہ فائز رہ چکی ہیں حضور نے اُن کی بھی دلجوئی فرمائی اور ان کو بشارت دیتے ہوئے کہا:

"وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۔

(المائدہ:66)

اہل کتاب یہ نہ سمجھیں کہ روحانی بادشاہت اب ان سے چھن رہی ہے بلکہ اس بادشاہت کے دروازے اب پہلے سے بڑھ کر اُن پر کھل رہے ہیں۔اگر وہ ایمان لائیں اور تقویٰ اختیار کریں تو جو کمزوریاں ان سے صادر ہوچکی ہیں ان کا بھی ہم اپنے فضل سے ازالہ کردیں گے اور طرح طرح کی نعماء والی جنتوں میں اُن کو داخل کریں گے۔آسمانی رزق کے دروازے بھی ان پر کھولے جائیں گے اور اس دنیا کی نعماء بھی اُن کو دی جائیں گی۔

دوسری بات

مذہبی عدم رواداری کا ایک بڑا محرک اہلِ مذاہب کا یہ احساس رہا ہے کہ ان کے پاس جو تعلیم

ہے وہ ایسی نادر و نایاب ہے جس سے دیگر مذاہب کلیۃً محروم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مبعوث ہوتے ہی سابقہ مذاہب کو یہ خطاب فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ روحانی سلسلہ کی حضرت آدمؑ کے ذریعہ داغ بیل ڈالتے ہوئے ہی میری بشارت اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کے الفاظ میں دے دی تھی۔ ما کنت بدعاً من الرُسُل میں کوئی نیا نبی نہیں۔ میری تعلیم سابقہ مذاہب کی تعلیمات کا تسلسل اور تکمیل ہے۔ میرے ظہور سے تمہارے انبیا کی پیشگوئیاں پوری ہو رہی ہیں۔ اس لئے میرا ظہور میری تعلیم تم میں حسد اور تلخی اور عدم رواداری پیدا کرنے کا باعث کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

مذہبی رواداری کا یہ پہلو اپنے ساتھ یہ خطرہ بھی رکھتا تھا کہ اسلام کی دوسرے مذاہب پر حقیقی فضیلت اور برتری اور سابقہ مذاہب کے دائروں کی محدودیت نظر سے اوجھل ہو جائے۔ اس لئے حضورؐ نے بڑے واضح اور زوردار الفاظ میں اسلام کی سابقہ مذاہب پر فضیلت اور کمال کو بھی بیان فرما دیا۔

تیسری بات

مذہبی رواداری کی عمارت کی پہلی اینٹ ہر انسان کے لئے آزادئ ضمیر و عقیدہ کے حق کو تسلیم کرنا ہے۔ اس حق کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے مذہب کی تاریخ میں عدم رواداری کے بدترین مظاہرے ہوئے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سچائی سے بھری ہوئی تعلیم مخالفین کے سامنے پیش کر دی۔ پھر فرمایا:

"قل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن و من شآء فلیکفر"

تمہارے رب کی طرف سے سراپا حق میں نے پیش کر دیا ہے اب ماننا یا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔ لا اکراہ فی الدّین۔ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ لیکن حضور علیہ السلام نے مخالفین کی ہمدردی اور بھلائی کے جذبہ کے ماتحت ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اس حق سے بھری ہوئی تعلیم کے انکار کے عواقب کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔ فرمایا:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۰ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۰ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ۔

(الکہف:30)

کہ ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔مگر یہ یاد رکھو کہ عقلی دلائل اور آسمانی تائیدات کی موجودگی میں جولوگ ظلم کی راہ سے انکار کریں گے ایسے ظالموں کے لئے ہم نے ایک ایسی آگ تیار کررکھی ہے جس کی چار دیواری ان کو قید کرلے گی۔اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد کسی ایسے مشروب سے کی جائے گا جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا اور چہروں کو جھلس کر رکھ دے گا۔یہ مشروب بھی بہت برا ہوگا اور وہ جائے رہائش بھی نہایت مکروہ ہوگی۔

چوتھی بات

اختلاف مذہبی ہو یا دنیوی عدل وانصاف کے خون کرنے کا باعظ ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہے وہ اقوام جو اندرونی طور پر عدل وانصاف کے اعلیٰ ترین معیار پر قائم ہیں، بیرونی مخالفوں کے مقابلہ میں عدل وانصاف کے سب تقاضوں کو خیر باد کہہ گئیں۔مگر جو شخص ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان حالات پر تفصیلی نظر ڈالے گا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہود اور مشرکین عرب کی وجہ سے پیش آئے۔ایک طرف یہود کی سازشوں اور شرارتوں اور مشرکین کے مظالم پر نظر کرے گا اور دوسری طرف حضور علیہ السلام کے عدل وانصاف کا مشاہدہ کرے گا وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس آیتِ کریمہ کا مجسم نمونہ پائے گا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُونُوا قَوّٰمِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۔

(سورۃ المائدہ رکوع ۲)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم اللہ کی خاطر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لئے مضبوطی اور استقامت کے ساتھ استادہ ہو جاؤ اور کسی قسم کی دشمنی تمہیں اس بات پر ہرگز آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن چھوڑ دو تم عدل سے کام لو کیونکہ تقویٰ کے سب سے قریب ترین چیز عدل ہے

اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ دشمنوں سے ناانصافی کر کے تم خدا کی ناراضگی سے بچ جاؤ گے۔ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ کیونکہ اللہ تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

پانچویں بات

مذہبی رواداری کا فقدان غیر مذاہب والوں سے حسنِ سلوک کے فقدان کا باعث بن سکتا ہے۔حضور علیہ السلام کی زندگی مخالفین کے ساتھ حسنِ سلوک کے واقعات سے تابندہ ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ظلم پر ظلم دیکھا اور احسان پر احسان کیا۔دُکھ اُٹھائے مگر اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ پر عمل کیا اور یَدْرَؤُنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ کا بہترین نمونہ دکھایا۔فتح مکہ کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اعلانِ عفو تاریخ عالم کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔بخاری میں روایت ہے:

"کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ یعفون عن المشرکین واھل الکتاب کما امرھم اللہ ویصبرون علی الاذیٰ۔"

کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ مشرکوں اور اہل کتاب کی ایذا رسانیوں پر عفو سے کام لیتے اور ان کے دکھوں پر صبر کرتے اور قرآن کریم کے اس حکم پر عمل فرماتے:

لَتُبْلَوُنَّ فِی أَمْوَالِکُمْ وَأَنفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِینَ أُوتُوا الْکِتَابَ مِن قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِینَ أَشْرَکُوا أَذًی کَثِیرًا وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔

(آل عمران:187)

کہ قضاء وقدر کے مطابق اور مخالفین کی طرف سے تم پر جانی ومالی مصائب کے پہاڑ ٹوٹیں گے اور ان لوگوں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور مشرک اقوام سے بھی تم بہت دل آزار باتیں سنو گے لیکن اگر تم صبر کرو اور خدا کو اپنی پناہ کا ذریعہ بناؤ تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔

چھٹی بات

مذہبی رواداری مذہبی مخالفین کے جذبات کے احترام کا مطالبہ کرتی ہے۔حضور علیہ السلام نے اس لحاظ سے بے مثال نمونہ پیش کیا اور اس حد تک مخالفین کے مذہبی جذبات کے احترام کی تلقین

فرمائی کہ ان لوگوں کے متعلق بھی جو پتھر اور مٹی کے لئے جان اور بے حقیقت بُتوں کو اس عظیم کائنات کا خالق و مالک قرار دیتے تھے۔ یہی ارشاد کیا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

(سورۃ الانعام آیت 108)

جن چیزوں کو تمہارے مخالفین خدا کے مقابلہ میں پکارتے ہیں ان کو بھی بُرا بھلا نہ کہو، گالی نہ دو ورنہ وہ نادانی میں اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔ بے شک ان کا یہ فعل حد درجہ نادانی کا ہے مگر ان کی محدود اور ناقص نظر اسی میں حسن دیکھتی ہے۔ جزا سزا کا معاملہ خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ تمہیں یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں۔

حضور علیہ السلام نے مخالفین کے لئے مذہبی پیشواؤں کی عزت اور احترام کا نہایت حسین اور حکیمانہ نمونہ پیش فرمایا۔ مذہبی اختلاف کی تاریخ کا یہ پہلو نہایت تاریک اور دل دوز مناظر اپنے اندر رکھتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے صحابہؓ کو لاتخیّرونی من بین الانبیاء اور لاتفضّلونی علیٰ موسیٰ کہہ کر یہ نصیحت کی کہ گزشتہ انبیاء پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت کا ذکر اس طور سے نہ کیا کریں جس سے خوامخواہ دوسروں کی دلآزاری ہو۔ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھ مومنوں نے ہر رسول کی تصدیق کی۔ ہر نبی کو سچا کہا:

اٰمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِه

(البقرہ: آیت 286)

فرمایا کہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھ کے مومن اس کلام پر ایمان لائے جو آپؐ پر اتارا گیا۔ یہ ایمان سابقہ مذاہب سے انقطاع کا باعث نہیں ہوا بلکہ اس ایمان کے نتیجہ میں وہ اللہ پر بھی ایمان لائے اور اس کی تمام کتابوں اور تمام رسولوں پر ایمان لائے اور اس ایمان کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ہم اللہ کے رسولوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔

سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ہم نے سب انبیاء کے ذریعے آنے والے خدائی ارشاد کو سنا اور مانا اور اس لئے ہم اے رب تیری مغفرت کے طالب ہیں اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

حضورؐ کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ آپ نے انبیاء اور بزرگوں سے وہ الزامات بھی دُور فرمائے جو خود ان کے ماننے والوں نے لگائے تھے۔ ابراہیمؑ کے ماننے والوں نے نعوذ باللہ انکو جھوٹا کہا۔ حضورؐ نے صدّیق قرار دیا۔ سلیمانؑ کی قوم نے ان کو کافر اور مشرک قرار دیا۔ حضورؐ نے مَا كَفَرَ سُلَيۡمٰنُ کی صدا بلند کی۔ موسیٰ کے ہاتھ کو بائبل نے کوڑھ کی بیماری بتائی اور حضورؐ نے ید بیضاء قرار دیا۔ حضرت مسیحؑ کو مبارکا کہا گیا۔ کرشن کو ان کے ماننے والوں نے عیاش اور چور بنایا۔ حضورؐ نے ان کو خدا کا نبی بتایا۔ انجیل نویسوں نے حواریوں کو مسیح کی مصیبت کے وقت غدّار اور لعنت بھیجنے والا لکھا مگر حضورؐ کے ذریعہ ان کا نعرہ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ بیان کیا گیا۔

حضور علیہ السلام کو دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں جو بلند ترین مقام حاصل تھا اس کا بیان بھی حضورؐ کا فرض منصبی تھا اور حضورؐ نے اپنے اس فرض کو بھی علی الاعلان ادا کیا۔ مگر اس طور سے کہ کسی کی بے جا دل شکنی نہ ہو۔ کسی کے جذبات کو خواہ مخواہ ٹھیس نہ لگے۔ بغیر گھمنڈ اور غرور کے اظہار کے اپنی ہر فضیلت بیان کی اور ہر فضیلت بیان کرتے ہوئے لَا فَخۡرَ کے الفاظ دوہرائے۔

مذہبی لوگوں کے جذبات اپنے معابد کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہوتے ہیں اور غیر مذاہب کے معابد کی بے حرمتی مذہبی عدم رواداری کا نتیجہ بنتی رہی ہے۔ حضورؐ نے مذہبی رواداری کے اس پہلو کا بھی خیال فرمایا اور عرب کے اس وحشیانہ ماحول میں یہ ندا بلند کی:

"وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا

(الحج:۴۱)

کہ مسلمانوں کو جارحانہ جنگوں کے خلاف دفاع کی اجازت اس لئے دی جا رہی ہے کہ اگر یہ اجازت نہ دی جاتی تو ظلم کی نوبت یہاں تک پہنچتی کہ گوشہ گزینوں کے خلوت خانے عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں جہاں کثرت سے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے

منہدم کردی جاتیں۔

ساتویں بات

مذہبی اختلاف کا ایک حد تک لازماً بعض معاشرتی تعلقات کے دائرہ کو محدود کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح بعض معاشرتی تعلقات گہرے علمی، عملی، زمانی، مکانی، قومی، نسلی، ثقافی، سیاسی، تمدنی اور ملکی اشتراکات رکھنے والوں کے درمیان ہی قائم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح بعض معاشرتی تعلقات لازماً مذہبی اشتراکات رکھنے والوں کے درمیان ہی قائم ہو سکتے ہیں۔ مگر اس بات کا غلط استعمال یہ نتیجہ بھی پیدا کر سکتا ہے کہ اختلاف مذہب کی بناء پر جائز معاشرتی تعلقات کو ترک کر دیا جائے اور یہ خطرہ بھی ممکن ہے کہ مذہبی مخالفین سے اس طور سے معاشرتی تعلقات قائم کئے جائیں جو بنیادی مذہبی صداقتوں پر ضرر رساں اثر ڈالنے والے ہوں۔ ہمارے نبی ﷺ نے مذہبی رواداری کی ان دونوں انتہاؤں سے پاک طریق اختیار کیا۔ ایک طرف حضور ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ:

"الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ"

(المائدہ:٦)

کہ آج تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے جائز قرار دی جاتی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے اور پاکدامن مومن عورتوں اور پاک دامن اہل کتاب عورتوں سے نکاح تمہارے لئے جائز کیا گیا ہے۔

مگر اس اجازت کے ساتھ حضور علیہ السلام نے لاتجد قوماً یومنون باللہ والیوم الاٰخر یوٓادون من حادّ اللہ میں یہ وضاحت بھی فرمادی کہ ایسے معاشرتی تعلقات رکھنے کی اجازت نہیں جو دینی غیرت کے خلاف ہوں۔ جن کے نتیجہ اسلامی عقائد وارکان کو خطرہ پیدا ہوتا ہو۔

آٹھویں بات

مذہبی اختلاف کی بنا پر عدم رواداری کے نتیجہ میں ایک نقص یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل مذاہب اپنے مذہبی مخالفین سے عقائد واعمال میں اشتراکات کونظرانداز کرنے اور اختلافات کواجاگر اور نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے بالمقابل مذہبی رواداری کے نام پر یہ کوشش بھی کی جاتی رہی ہے کہ جھوٹی صلح کی کھوکھلی خواہش کے نتیجہ میں اپنے حقیقی مذہبی امتیازات اور اختلافات پر پردہ ڈالا جائے اور مداہنت کا طریق اختیار کیا جائے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے دوسرے مذاہب سے روابط واشتراکات کا بار بار ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

"شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِۦ نُوحًا وَالَّذِيٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِۦٓ إِبْرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰٓ ۖ أَنْ أَقِيمُوا۟ الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا۟ فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِيٓ إِلَيْهِ مَن يَشَآءُ وَيَهْدِيٓ إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ"

(شوریٰ:۱۴)

کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اصولی طور پر وہی دین دیا ہے جس کی تاکید اس نے نوحؑ کو کی تھی۔اسی شریعت کو اے نبیؐ ہم نے تجھ پر وحی کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔اس کی تاکید ہم نے ابراہیمؑ کو کی۔موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو کی اور اس شریعت کا اصل الاصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت دنیا میں قائم کرو اور دین کے متعلق جھگڑا اور تفرّقہ نہ کرو۔مشرک چونکہ خدائے واحد کے منبع سے آنے والی اس شریعت کو چھوڑ کر جو تمام مذاہب میں مشترک ہے متعدد معبودوں کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں اس لئے تمام شرائع کے اصولی طور پر اشتراک رکھنے اور ایک ہی منبع سے نکلنے کی یہ تعلیم جس کی طرف تم اُن کو دعوت دیتے ہو ان پر بہت گراں گزرتی ہیں۔

مذہبی رواداری کے اس پہلو کے ساتھ حضورؐ نے اس کے غلط استعمال کا تدارک بھی فرمایا اور دوسرے مذاہب سے اختلافات اور امتیازات کو بھی کھول کر بتادیا۔فرمایا:

"قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكَٰفِرُونَ ۔ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۔ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ۔ وَلَآ أَنَا۠ عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ۔ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ"

سنو اے کافرو! میں تمہارے طریق کے مطابق عبادت نہیں کرتا اور نہ تم میرے طریق کے مطابق عبادت کرتے ہو اور نہ میں ان کی عبادت کرتا ہوں جن کی تم عبادت کرتے چلے آئے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں۔یہ اعلان نتیجہ ہے اس بات کا کہ تمہارا دین تمہارے لئے ایک

طریق کار مقرر کرتا ہے اور میرا دین میرے لئے دوسرطریق کار مقرر کرتا ہے۔

نویں بات

مذہبی اختلاف کی صورت میں ہر مذہب والے کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی تبلیغ دوسرے لوگوں کو کرے کیونکہ جو شخص اپنے پاس کچھ خیر اور بھلائی رکھتا ہے اور طاقت رکھتے ہوئے بھی دوسروں کو اس سے محروم رکھتا ہے وہ انسانی ہمدردی کی اساسی، ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کا مجرم ہے۔اپنے موقف کو دوسروں تک پہنچانے کی اجازت انسان کے اساسی حقوق میں سے ہے مگر مذہبی عدم رواداری کی بنا پر تبلیغ کے حق کو بھی غلط رنگ میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی احسن رنگ میں تبلیغ فرمائی اور اپنے متبعین کو بھی یہ تعلیم دی۔

اُدعُ الیٰ سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالّتی هیَ احسن۔

کہ تم لوگوں کو دانائی اور اچھی نصیحت کے ذریعہ اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ اور اختلافی معاملات میں اس طریق سے بحث کرو جو سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔

حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے تبلیغ کے حکم کے ساتھ حضور علیہ السلام نے یہ اجازت بھی دی کہ اگر سراسر ظلم کی راہ سے جانتے بوجھتے کوئی شخص زیادتی کرتا ہے تو اس کے جواب میں الزامی جواب کی گنجائش موجود ہے۔فرمایا:۔

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ

(العنکبوت: ۴۷)

یعنی اہل کتاب سے کبھی بحث نہ کرو مگر اعلیٰ اور مضبوط دلیل کے ساتھ سوائے ان لوگوں کے جو اُن میں سے ظلم کرنے والے ہوں۔(ان کو الزامی جواب دے سکتے ہو) اور ان سے کہو کہ اختلاف اور جھگڑے کی کوئی ضرورت نہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو تم پر نازل ہوا ہے اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اس ضمن میں حضورؐ نے مسلمانوں کو بھی یہ تاکید فرمائی کہ مذہبی اختلاف اور باہمی تبلیغ کو لڑائی

جھگڑے اور فساد کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور غیر مذاہب والوں کو بار بار اس امر کی طرف توجہ دلائی۔ لاحُجّۃ بیننا وبینکم ہمارے تمہارے درمیان جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ تبلیغ اور بات ہے جھگڑا اور بات ہے۔ فرمایا:

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ۔

(آل عمران:۲۱)

کہ اگر وہ لوگ تم سے جھگڑیں تو تم جھگڑا کرنے کے بجائے یہ کہہ دو کہ مَیں نے اور میرے سچے متبعین نے اپنے وجود کو مع اس کی تمام طاقتوں کے خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ اہل کتاب اور امیوں کو کہہ دو کہ جھگڑا کرنے کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم بھی اپنے آپ کو خدا کو سونپ دو اگر وہ ایسا کریں تو وہ ہدایت پا گئے اگر وہ نہ مانیں تو تمہارا کام ان سے جھگڑنا نہیں صرف اُن کو پیغام پہنچا دینا ہے۔

دسویں بات

حضور علیہ السلام نے مذہبی رواداری کے قیام کے لئے ایک ایسی آواز بلند کی جس کی کوئی مثال حضور کی بعثت سے پہلے مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ حضورؐ نے مذہبی اختلافات کے باوجود مشترکہ باتوں کی بنیاد پر غیر مذاہب کو دعوتِ اتحاد دی۔ فرمایا:

قُلْ يٰأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّٰهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ۔

(آل عمران ۶۴)

کہ اے اہل کتاب بے شک ہمارے درمیان اختلافات ہیں لیکن ہم سب عقیدۃً ایک بنیادی مشترک بات کے مدّعی ہیں اور وہ توحید ہے۔ پس آؤ ہم اس نقطہ پر جو ہم دونوں کے درمیان مساوی حیثیت رکھتا ہے آجائیں۔ فان تولّوا پھر اگر وہ ایسی منصفانہ تجویز سے منہ پھیر لیں۔ فقولوا اشھدوا بانا مسلمون تو اے مسلمانو ان کو کہہ دو کہ ہم نے صلح کی پیش کش کر دی ہے۔

گیارھویں بات

مذہبی عدم رواداری کا ایک اہم باعث وہ کیفیت ہے جس کو اردو زبان میں کنویں کے مینڈک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔بعض اقوام وطبقات اپنے محدود دائرہ میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سننے سمجھنے اوران پر تدبّر کرنے کی ان کو توفیق نہیں ملتی۔مذہبی عدم رواداری کا علاج قرآن شریف نے معنوی اور ظاہری لحاظ سے دنیا میں سفر بتایا ہے۔فرماتا ہے:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔

(الحج:٤٦)

یعنی کیا یہ لوگ دنیا میں سفر کیوں نہیں کرتے تا کہ ان کو ایسے دل حاصل ہوجائیں جو عقل سے کام لینے والے ہوں۔ایسے کان مل جائیں جو دوسروں کے موقف کو سن سکیں کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ نابینائی ظاہری آنکھوں کی نابینائی نہیں بلکہ دل کی نابینائی ہے۔

بارھویں بات

مذہبی عدم رواداری کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے مذہبی مخالفین میں جو حقیقی خوبیاں اور اچھائیاں پائی جاتی ہیں ان کا بھی منکر ہوجاتا ہے۔حضور علیہ السلام نے جہاں غلط قسم کی رواداری سے بچتے ہوئے مخالفین کی کمزوریوں اور غلطیوں کو خود ان کی اصلاح اور بھلائی کی خاطر حکمت اور مصلحت کے ساتھ بیان کیا وہاں اُن کی خوبیوں کا بھی اقرار کیا ہے۔فرمایا:

لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ۔ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ۔ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ۔

(آل عمران ١١٤ تا ١١٦)

کہ سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں۔ انمیں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے عہد پر قائم ہیں وہ رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کو پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ وہ اللہ پر اور آنے والے دن پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کی ہدایت کرتے ہیں۔ بدی سے روکتے ہیں۔ نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ نیکوں میں سے ہیں۔ ایسے لوگ جو نیکی بھی کریں۔ اس کی نا قدری نہیں کی جائے گی۔ اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

تیرھویں بات

ایک وقت میں مسیحی پادریوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تلوار کے روز سے اسلام پھیلایا۔ اب یہ مسئلہ جماعت احمدیہ کے لٹریچر اور تقاریر کے ذریعہ خوب واضح ہو چکا ہے اور اس جگہ اس بات پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنے مذہبی مخالفین کے خلاف جنگیں کلیۃً دفاعی نوعیت کی تھیں۔ قرآنِ شریف کی یہ آیت پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جارحیت کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔ قرآن شریف فرماتا ہے:

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔

(التوبہ: ۱۴)

کہ اے مومنو کیا تم اس قوم سے بھی لڑنا نہیں چاہتے جنہوں نے قسم کھا کر صلح کے معاہدات کئے اور پھر ان کو توڑ ڈالا اور پہلے خدا کے رسول کو مکّہ سے نکالا تھا اور اب مدینہ سے بھی نکالنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ پہلی دفعہ جو جنگ شروع ہوئی اس کی ابتداء تمہاری طرف سے نہیں ہوئی تھی بلکہ خود انہوں نے حملہ کرنے میں پہل کی تھی کیا ایسے لوگوں سے تمہارے لڑنے میں کوئی ضابطہ اخلاق وقوانین حائل ہوسکتا ہے یا کیا تم ان سے ڈرتے ہو اگر تم مومن ہو تو اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

حضور علیہ السلام نے کبھی جارحانہ حملہ نہیں کیا اور دشمن جب بھی جارحانہ حملہ کے بعد صلح کی طرف مائل ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صلح کو ترجیح دی۔ اس ضمن میں صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضورؐ کی سیرت کا جو عظیم پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ مذہبی رواداری کی تاریخ میں عدیم المثال ہے۔ یو

ں سمجھئے کہ اسلام اور کفر کی کشمکش رواں دواں تھی۔حضور علیہ السلام ایک ساتھی کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔مدینہ میں آپؐ کی کچھ جمعیت قائم ہوئی۔اردگرد کے قبائل سے کچھ معاہدات ہوئے۔چھوٹی سی اسلامی حکومت قائم ہوئی اور تیزی سے بڑھنے لگی۔مکّہ کا استعمار جس کی بنیادیں مذہبی، معاشی اور ظاہری طاقت کے ذریعہ استحصال پر مبنی تھیں مدینہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو برداشت نہ کرسکا۔پہلا بڑا معرکہ بدر میں ہوا۔جس میں مکہ کی طاقت کی ریڑ کی ہڈی توڑ دی گئی۔مکہ کے جگر گوشے اپنے کیفر کردار کو پہنچے اور مکہ کی لیڈر شپ دبدبہ اور رعب وطاقت رکھنے والے بہادر مخالفوں کے ہاتھ سے نکل کر جوڑ توڑ اور سازش کے ماہر دماغوں کے پاس چلی گئی۔اس سیاست نے عرب کے سارے قبائل کو اپنی سازش کے جال میں لے کر مدینہ پر حملہ آور کرادیا جو جنگِ احزاب کے نام سے معروف ہے۔مگر اللہ تعالیٰ کے فضل نے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کی بے پناہ قربانیوں کی شکل میں ظاہر ہوا اس حملہ کو ناکام بنادیا۔اب عرب دو حصوں میں بٹ گیا۔مکہ کی طاقت کے مقابلہ میں مدینہ کی طاقت بڑھتی چلی گئی۔قحط نے مکہ کی حالت کو اور بھی کمزور کردیا۔سارے عرب کی آنکھیں اب مکہ اور مدینہ کی کشمکش پر تھیں۔ایک طرف صدیوں کا مذہبی، معاشی اور سیاسی تفوق تھا دوسری طرف خدا کا رسولؐ اور اس کے جاں نثار۔عرب کے قبائل اس کشمکش میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فتح کو آپؐ کا معیارِ صداقت بنا کر آخری نتیجہ کے منتظر تھے۔

اس کیفیت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا کہ آپؐ مکہ میں عمرہ کررہے ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خواب کو پورا کرنے کے لئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے ذوالقعدہ کا مہینہ تھا جو عرب کے مسلّمہ چار حرام مہینوں میں سے تھا۔ان مہینوں میں مکہ والے عرب کے بین القبائل ضابطہ قوانین کی رو سے دشمن کو بھی مکّہ میں آنے سے نہیں روک سکتے تھے اور لڑائی قطعاً منع تھی۔مگر اہلِ مکہ کی سفاہت اور جہالت غالب آگئی۔اپنی جھوٹی غیرت کی وجہ سے وہ ہتھیار بند ہو کر حضور علیہ السلام کو روکنے پر تُل گئے۔انکا یہ فعل عرب کے مسلّمہ ضابطہ،قوانین اور اخلاق

کی کھلم کھلا توہین کے مترادف تھا۔ حضور علیہ السلام اپنے صحابہؓ سمیت مکّہ سے نو میل کے فاصلہ پر رک گئے۔ مگر اس وقت پکے ہوئے پھل کی طرح آپؐ کی گود میں گرنے کے لئے تیار تھا۔ گزشتہ جنگوں میں ناکامی اور لمبے قحط سے مکہ والوں کا دفاع بالکل کمزور پڑ چکا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اپنی حکمت سے نقل وحرکت فرمائی۔ خالد بن ولید جیسے تیز نظر کمانڈر کو جو مکہ والوں کے گھڑ سوار دستہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قافلہ کی جاسوسی کے لئے نکلا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد کا صرف اس وقت علم ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قافلہ کی گرد اس دستہ پر پڑی۔ مکہ والوں نے مجبور ہوکر احابیش قوم کے لوگوں سے مکہ کے دفاع کی درخواست کی۔ احابیش نے مکہ کے گرد پوزیشن لے لی مگر اپنے گھر بار عورتوں، بچوں مال مویشی کو اس طرح بے حفاظت چھوڑ گئے کہ حضور علیہ السلام آسانی سے ایک دستہ ان کی طرف روانہ کر کے احابیش کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ جنگ کے ہر نقطۂ نظر سے حضور علیہ السلام کی پوزیشن مکہ والوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھی صحابہؓ کے جوش وخروش کا عجیب عالم تھا ان کی تلواریں میانوں میں تڑپ رہی تھیں۔ گزشتہ سترہ سال سے مکہ والوں کے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا مگر حضور علیہ السلام نے جنگ کے ذریعہ فتح کو جو اب یقینی ہو چکی تھی صلح پر قربان کیا۔ اور مکہ والوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ لکھا جانے لگا۔ یہ نظارہ بھی عجیب تھا مکہ والے سخت احساسِ مغلوبی اور شکست کے باوجود معاہدہ کی ہر شرط پر تحکم اور تعصب کا مظاہرہ کرنے لگے۔ عہد نامہ کی ہر دفعہ میں انہوں نے اپنے مفاد کو مقدم رکھا اور مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ظاہری نظر میں مسلمانوں نے گِر کر صلح کی۔ کفار کے نمائندہ نے معاہدہ پر بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم کے الفاظ لکھے جانے کے خلاف ضد کی۔ محمد رسول للہ کے الفاظ کٹوا کر محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھوائے۔ مکہ صرف نو میل تھا اور عمرہ کرنا مسلمانوں کا عرب کے دستور کے مطابق جائز حق تھا مگر قریش نے اپنی جھوٹی عزت کی اظہار کے لئے معاہدہ میں یہ شرط لکھوائی کہ مسلمان اس وقت بغیر عمرہ کئے واپس مدینہ چلے جائیں اور مسلمانوں کے لئے یہ نہایت تکلیف دہ

شرط معاہدہ میں درج کرائی کہ مدینہ کا جو شخص کفر اختیار کر کے مکہ جانا چاہے اس کو ایسا کرنے کا اختیار ہوگا۔مگر مکہ کا جو مسلمان قریش مکہ کی بے پناہ اذیتوں سے بچ کر مدینہ چلا جائے۔اس کو مدینہ سے واپس کرنا حضورؐ کی ذمہ داری ہوگی۔کفار کا اس شرط پر اصرار حد درجہ غیر منصفانہ اور مکہ کے مسلمانوں کا مستقبل تاریک کرنے والا تھا۔مگر حضور علیہ السلام نے کفار مکہ کی ہر ضد کو قبول کیا اور جنگ پر صلح کو ترجیح دی۔ابھی معاہدہ زیر تحریر تھا اور آخری دستخط نہیں ہوئے تھے کہ کفار مکہ کا نمائندہ سہیل کا اپنا بیٹا ابو حندلؓ مسلمان ہو چکا تھا۔بیڑیوں میں بندھا ہوا مکہ سے فرار ہو کر اسلامی قافلہ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔سہیل نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ معاہدہ کے مطابق اس کو مکہ واپس کیا جائے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ابھی معاہدہ کی تکمیل نہیں ہوئی۔معاہدہ پر عمل اس کی تکمیل کے بعد شروع ہوا کرتا ہے مگر سہیل نے ابو جندلؓ کی واپسی کے بغیر مزید معاہدہ تحریر کرنے سے انکار کر دیا۔ابو جندلؓ نے اسلامی قافلہ کے درمیان اپنے آپ کو زمین پر پھینک کر بلند آواز سے پکارا اور فریاد رسی چاہی۔یہ ایک ایسا مشکل امتحان ایک شدید ابتلا تھا کہ جس میں اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گزارا اور آپؐ ثابت قدمی سے قائم رہے۔مسلمانوں کی آنکھوں سے خون اُتر رہا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو جندلؓ کو واپس کرایا اور صلح کے قیام کی خاطر یہ اذیت ناک قلبی اور جذباتی دُکھ برداشت کرنا گوارا فرمایا۔مسلمانوں کے سینے اس وقت بھٹی کی آگ کی طرف بھڑک رہے تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ۱۴ سو ساتھی صحابہ میں سے تیرہ سو ننانوے (۱۳۹۹) اس معاہدہ کو ذلت آمیز اور توہین آمیز سمجھ رہے تھے۔ان کو مکہ ایک مرے ہوئے شکار کی طرح سامنے نظر آ رہا تھا اگر اس وقت ان کو اجازت مل جاتی تو شاید مکہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔حضور علیہ السلام تو خدا کے مقدس نبی اور سید الانبیاء تھے اگر اس کیفیت میں آپ کی بجائے دنیا کی تاریخ کا کوئی بڑے سے بڑا اور محبوب سے محبوب لیڈر بھی ہوتا تو ایک منٹ کے لئے اپنے ساتھیوں کے اس جلال اور غضب کے سامنے نہ ٹھہر سکتا۔وہ لمحہ اس کی قیادت بلکہ زندگی کا آخری لمحہ ہوتا۔مگر حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کی پرواہ نہ کی۔اس فتح کی طرف

توجہ نہ دی جو سامنے نظر آرہی تھی۔ان مظالم کو اس وقت مدنظر نہ رکھا جو مکہ کے کمزور مسلمان مردوں،عورتوں اور بچوں پر توڑے جارہے تھے ظاہر نظر میں ذلت آمیز نظر آنے والی شرطوں کو قبول کیا اور صلح کو ترجیح دی۔کہاں ہیں وہ غیر مسلم مصنّف جو حضور علیہ السلام پر جارحانہ جنگوں کا الزام لگاتے ہیں۔کیا دنیا کی تاریخ سے قوت وطاقت حاصل ہوتے ہوئے پھر مذہبی رواداری کی کوئی ایسی مثال پیش کرسکتے ہیں؟

کفار مکہ نے اس معاہدہ کو اپنی فتح سمجھا صحابہؓ اس معاہدہ کو ظاہری نظر میں اپنی توہین سمجھتے تھے مگر عرش پر خدا فرمارہا تھا:

"إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۔ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۔ وَيَنصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيزًا"

نتائج نے خدا کے اس ارشاد کی تصدیق کی۔صلح حدیبیہ کس رنگ میں اسلام کی سربلندی اور سرفرازی کا باعث ہوئی۔معاہدہ کی جو دفعہ مشرکین مکہ نے اپنے زعم میں مسلمانوں کی اہانت کے لئے اصراف کرکے رکھوائی تھی خود انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منّت کرکے منسوخ کروائی اور **جلد ہی صلح حدیبیہ کا نتیجہ مکہ کی عظیم الشان اور پُرامن فتح کی صورت میں نکلا۔**

چودھویں بات

اب میں اس آخری بات پر مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ ہمارے سید ومولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنوں سے مذہبی مخالفوں سے رواداری کا ایک عظیم پہلو وہ درد بھری دعائیں ہیں۔وہ ہمدردی وہ غم خواری، وہ جاں نثاری ہے جو مخالفوں کے لئے آپؐ سے ظہور میں آئی۔مخالف آپؐ کو پتھر مارتے۔آپؐ ان کی ہدایت کے لئے سوز و درد میں ڈوبی ہوئی دعائیں کرتے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس شعر کے اول مصداق ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

"ہم نے مرنا بھی دل میں ٹھہرایا"

سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش کردہ اصولوں میں سے بعض کو میں پیش کرچکا ہوں اور

اس تعلیم کے احسن واکمل ہونے کا اقرار اپنے تو کرتے ہی ہیں لیکن کہتے ہیں نہ کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔غیروں نے بھی آپ ؐ کی سیرت اور تعلیمات کے اس پہلو کو نہ صرف سراہا بلکہ اسکے متعلق نہایت خوبصورت انداز میں لکھا بھی۔ چنانچہ معروف مصنف Godfrey Higgins اپنی نہایت بلند پایہ تصنیف Apology for Mohammad میں لکھتا ہے:۔

Nothing is so common as to hear the Christian priests abuse the religion of Mohammad for its bigotry and intolerance.Wonderful assurance and hypocrisy!Who was it that expelled the Moriscoes from Spain because they would not turn Christians? Who was that murdered the millions of Mexico and Peru,and gave them all away as slaves because they were not Christians?What a contrast have the Mohammadans exhibited in Greece! for many centuries the Christians have been permitted to live in the peaceable possession of their properties,their religion,their priests,bishops,patriarchs and churches.........

(124-Godfrey Higgins Apology for Mohammad,p123)

ترجمہ:اس بات سے زیادہ عام طور پر کوئی بات سننے میں نہیں آتی کہ عیسائی پادری محمد ؐ کے مذہب کو اس کے تعصب اور غیر رواداری کی وجہ سے گالیاں دیتے ہیں۔عجیب یقین دہانی اور منافقت ہے یہ! کون تھا جس نے سپین سے ان مسلمانوں کو جو عیسائی ہو چکے تھے بھگایا تھا کیونکہ وہ عیسائی نہ بنے تھے؟ اور کون تھا جس نے میکسیو اور پیرو میں لاکھوں لوگوں کو قتل کر دیا تھا اوران کو غلام بنالیا تھا کیونکہ وہ عیسائی نہ تھے اور کیا ہی عمدہ اور مختلف نمونہ تھا جو مسلمانوں نے یونان میں دکھایا۔صدیوں تک عیسائیوں کو ان کے مذہب ،ان کے پادریوں ،لاٹ پادریوں اور

راہبوں اوران کے گرجا گھروں کو اپنی جاگیروں میں پُرامن طور سے رہنے دیا۔

اسی طرح معروف تاریخ دان ڈیون پورٹ Davenport لکھتا ہے کہ :۔

"It may be affirmed with certain truth that if western princes had been lords of Asia instead of Saracens and Turks they would not have tolerated Mohammadanism as Mohammadans have tolerated Christianity, since they persecuted with the most relentless cruelty, those of their own faith whom thy deemed heterodox."

(Davenport An Apology for Mohammad and the Koran p-84)

یعنی یہ بات یقینی طور پر کامل سچائی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر مغربی شاہزادے مسلمان مجاہدین اور ترکوں کی جگہ ایشیا کے حکمران ہوتے تو مسلمانوں کے ساتھ اس مذہبی رواداری کا سلوک نہ کرتے جو مسلمانوں نے عیسائیت کے ساتھ کیا۔ کیونکہ عیسائیت نے تو اپنے ان ہم مذہبوں کو نہاتے تعصب اور ظلم کے ساتھ تشدد کا نشانہ بنایا جن کے ساتھ ان کے مذہبی اختلاف تھے۔

Ruth Cranston کا بیان ہے کہ:۔

" Thirteen hundred before the Atlantic Charter Incorporated freedom of religion and freedom of hear,Moahammad made treaties with the Jewish and Christian tribes he had conquered and gave them freedom of religious worship and local self government."

اٹلانٹک کا منشور جس میں مذہبی آزادی اور خوف سے آزادی کو شامل کیا گیا ہے، سے تیرہ

صدیاں بیشتر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مفتوح یہودی اور عیسائی قبائل سے ایسے معاہدے کر چکے تھے جس میں انہیں عبادت کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کی مکمل آزادی دی گئی تھی۔

ان سب حوالوں سے ایک منصف مزاج بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیم میں کس قدر مذہبی رواداری کو دخل تھا کہ غیر بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔یہی ہے مذہبی رواداری کا وہ آفاقی تصور جو اسلام نے اس وقت پیش کیا جب نہ تو کسی Atlantic Treaty کا تصور تھا نہ کسی اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا اور نہ ہی Magna Carta کی تریسٹھ شقیں جو Baroons کو توحقوق دیتی تھیں لیکن دوسروں کے حقوق غصب کرتی تھیں۔اور نہ ہی روسو کا معاہدہ عمرانی (Social Contract) بلکہ یہ وہ آفاقی تعلیم تھی جو خدائے لاشریک نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری اور اس وجود باجود نے اس تعلیم کو اپنی ذات میں جاری کر کے یہ دکھادیا کہ یہی وہ تعلیم ہے جس پر آئندہ بنی نوع انسان کی بقا موقوف ہے۔

دین اسلام میں قرابت داروں کی اہمیت اور اُن کے حقوق

قرابت دار سے مراد وہ لوگ ہیں جو والدین اور اولاد کے علاوہ ہوتے ہیں۔اس میں وہ رشتہ دار شامل ہوتے ہیں جو والدین کی طرف سے ہوتے ہیں۔ایسی رشتہ داری میں والدین کے بھائی بہن اور دیگر قریبی عزیز شامل ہوتے ہیں۔رشتہ داروں سے تعلق قائم کرنے اور اُن کے حقوق کی ادائیگی کو صلہ رحمی کہتے ہیں۔اور اُن سے تعلق توڑنے اور ان کے حقوق کی طرف توجہ نہ کرنے کو قطع رحمی کہتے ہیں۔کہتے ہیں اوّل خویش بعد درویش۔اگر قرابت داروں سے ہی انسان کا تعلق اچھا نہیں تو ایسے شخص سے عام بنی نوع انسان سے حسن سلوک کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اسلام اگر چہ ایک عالمگیر مذہب ہے اور اسکے ماننے والے یعنی مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تاہم خونی رشتہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔رشتہ دار سے محبت اور باہمی رابطہ ایک قدرتی بات ہے۔خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی طرف مائل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے عین مطابق اپنے خونی رشتہ کو قائم رکھنے اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کی حسین اور منفرد تعلیم دی ہے۔اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کو بھی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے مگر دین اسلام میں جس طرح اس موضوع کے متعلق ہدایات پائی جاتی ہیں وہ ہر لحاظ سے جامع اور لامثل ہیں۔چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَاعۡبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَالۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَمَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ﴿۳۷﴾

(سورۃ النساء آیت:37)

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور قریبی رشتہ

داروں سے بھی۔اور یتیموں اور محتاجوں (سے) اور نزدیکی ہمسائے اور اجنبی پڑوسی اور ہم مجلس اور مسافر (سے)، اور جن کے تم مالک ہو چکے ہو، (ان سے نیکی کیا کرو)، بیشک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو تکبّر کرنے والا (مغرور) فخر کرنے والا (خودبین) ہو،

اسی طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں قرابت داروں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٧﴾

اور قرابت دار کو اس کا حق دے اور مسکین کو بھی اور مسافر کو بھی مگر فضول خرچی بند کر۔

(سورۃ بنی اسرائیل آیت:27)

اسی طرح اللہ تعالیٰ قریبی رشتہ داروں کے حقوق کی بجاآوری کے تعلق سے مزید فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩١﴾

(سورۃ النحل آیت:91)

اللہ تعالیٰ تمہیں عدل، احسان اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ

(سورۃ النساء:2)

اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس کے نام کے ساتھ تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحمی رشتوں کے حق بھی ادا کرو۔

قارئین! قرآن مجید میں بار بار متعدد مقامات پر رشتہ داروں سے حسن سلوک اور انکے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس بار بار کی تاکید سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان کو اس امر کی طرف کتنی توجہ دلائی گئی ہے اور اسلام میں اسکی کتنی اہمیت ہے۔اگر تمام مسلمان قرآن مجید کے ان احکامات کی روشنی میں اپنے قرابت داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور ان کے حقوق کی طرف خصوصی توجہ دیں اور اُن کی خبر گیری کرتے رہیں اور امیر رشتہ دار اپنے

غریب رشتہ داروں کا حق بخوبی ادا کریں تو دنیا میں غربت اور افلاس کا خاتمہ بہت جلد ہو جائے گا اور یقینا مسلمان اس نیک کام کے ذریعہ اللہ کی خوشنودی بھی حاصل کرنے والاے بنیں گے۔لیکن افسوس کہ آج اس کے برخلاف لوگ رشتہ داروں سے معمولی باتوں پر ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر دعا اور سلام تک بھی چھوڑ دیتے ہیں اور صاحب حیثیت رشتہ دار اپنے غریب رشتہ داروں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ اہل قرابت کا حق ہوتا ہے نیز والدین کے بعد اہل قرابت ہی سب سے پہلے ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں۔نیز یہ کہ جو لوگ مالدار ہوں اور صاحب حیثیت ہوں انکے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے غریب اور یتیم رشتہ داروں کی مالی مدد کریں۔چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس امر کی تاکید کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ:۔

قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

(سورۃ البقرہ)

یعنی فائدہ کی جو چیز بھی تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے ہے۔

بانیٔ اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک بڑا مقصد رشتوں کے تقدس اور انسانیت کے حقوق کا قیام بھی تھا۔(مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۱۴۹) چنانچہ آپؐ نے اپنے ماننے والوں کو صلہ رحمی کی بہت تاکید کی۔آپؐ نے فرمایا کہ ’’**رِحم کا لفظ جس سے رحمی رشتے وجود میں آتے ہیں دراصل اللہ کی صفت رحمان**‘‘ سے نکلا ہے۔اگر کوئی شخص ان رشتوں کا خیال نہیں رکھتا اور قطع رحمی کا مرتکب ہوتا ہے تو رحمان خدا اس سے اپنا تعلق کاٹ لیتا ہے، جو ان رشتوں کے حق ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے اپنا تعلق جوڑتا ہے۔

(بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ)

اس ارشاد نبویؐ میں یہ خوبصورت تعلیم مضمر ہے کہ رحمی رشتوں کا لحاظ رکھنے والوں کے حق میں خدا کی صفت رحمانیت (بن مانگے عطا کرنا) پوری شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ ایسے لوگ جو اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا نہیں کرتے اُن کے رزق سے برکت اٹھ

جاتی ہے نیز فرمایا کہ رحمی رشتوں کو کاٹنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''جو شخص پسند کرتا ہے کہ اُس کے رزق میں کشادگی ہو اور اُس کی عمر دراز ہو اُسے چاہئے کہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرے۔''

(بخاری و مسلم)

دنیا میں کونسا ایسا شخص ہوگا جو عمر دراز اور رزق میں کشادگی کا طالب نہ ہوگا پس اپنے رزق میں برکت اور وسعت اور اپنی عمریں لمبی کرنے کا کیا ہی آسان اور فطرت کے عین مطابق نسخہ ہمارے محبوب آقا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے تجویز فرمایا ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

عن جبیر رضی اللہ عنہ بن مطعم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنة قاطعٌ

(بخاری و مسلم)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قطع رحم کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

امام نوویؒ نے اس ارشاد گرامی کی یہ مراد بیان کی ہے کہ جو شخص یہ جاننے کے باوجود کہ قطع رحم کرنا یعنی ناتے داری کا حق ادا نہ کرنا حرام ہے، نہ صرف یہ کہ بغیر کسی سبب و عذر کے قطع رحم کرنے کو حلال بھی جانے تو وہ جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ یا یہ مراد ہے کہ قطع رحم کرنے والا نجات یافتہ اور اولین لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع رحم کرنے والوں کو سخت وعید سناتے ہوئے فرمایا کہ قطع رحم کرنا ایک ایسا گناہ ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَا مِنْ ذَنْبٍ اَحْرٰی اَنْ یُعَجِّلَ اللّٰہُ لِصَاحِبِہِ الْعُقُوْبَۃَ فِی الدُّنیا مع مَا یُدَّخِرُ لَہُ فی الاٰخرۃِ

مِنَ الْبَغْيِ وَ قَطِيْعَةِ الرَّحِمِ

(رواہُ الترمذی وابوداوٗد)

کوئی گناہ اس بات کے زیادہ لائق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ارتکاب کرنے والے کو دنیا میں بھی اس کی سزا دے اور مُرتکب کو آخرت میں بھی دینے کے لئے اس سزا کو اُٹھا رکھے، ہاں دو گناہ بے شک اس بات کے لائق ہیں، ایک بغاوت کرنا اور دوسرا قطع رحم کرنا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے رشتہ داروں سے احسن سلوک کرتا ہے مگر جواب میں وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اور بعض دفعہ تو اُسے نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی نیکی کا جواب بدی سے دیتے ہیں۔ اسلام ان حالات میں صبر و تحمل کی تعلیم دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ برائیوں کا جواب نیکی سے دینا اور رشتہ داری کے تعلقات کو قائم رکھنا باعثِ ثواب ہے اور انسان کے بلند کردار کی نشاندہی کرتا ہے اس سلسلہ میں بخاری شریف کی یہ حدیث ہمارے لئے مشعل راہ ہے:۔

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جو بدلہ میں رشتہ داری کا لحاظ کرتا ہے وہ مکمل درجہ کی صلہ رحمی کرنے والا نہیں۔ کمال درجہ کی صلہ رحمی یہ ہے کہ جب دوسرے رشتہ دار اس کے ساتھ تعلق توڑ دیں تو یہ اُن کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے اور اُن کا حق دے۔''

اسی طرح حدیث میں یہ واقع بھی درج ہے کہ:

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ میں اُن سے تعلق جوڑتا ہوں وہ توڑتے ہیں۔ میں احسان کرتا ہوں وہ بدسلوکی کرتے ہیں میرے نرمی اور حلم کے سلوک کا جواب وہ زیادتی سے دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ ایسا کرتے ہیں جیسا کہ تم نے بیان کیا تو تم گویا ان کے منہ پر خاک ڈال رہے ہو یعنی یہ ان پر احسان کر کے انہیں شرمسار کر کے رکھ دینے کے مترادف ہے اور اللہ کی طرف سے تمہارے لئے ایک مددگار فرشتہ اُس وقت تک مقرر رہے گا جب تک تم اپنے حسن سلوک کے اس نمونہ پر قائم رہو گے۔

(مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۰۰، مطبوعہ بیروت)

اسلام ہمیں یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ ہمارے رشتہ دار چاہے کسی بھی مذہب، اعتقاد اور رنگ و نسل کے ہوں ہمیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے اور کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں رکھنا چاہئے ۔ چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں کہ میری والدہ جو کہ مشرکہ تھیں میرے لئے اداس ہو کر محبت سے ملنے مدینہ آئیں ۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں ان کے مشرک ہونے کے باوجود اُن سے حسن سلوک کروں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں ضرور اُن سے حسن سلوک سے پیش آ ؤ ۔

(بخاری کتاب الادب باب صلۃ الوالد المشرک)

صلہ رحمی کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوہ حسنہ بھی ہمارے سامنے ہے ۔ رسول کریمؐ کے اکثر رحمی رشتہ داروں نے دعویٔ نبوت پر آپؐ کی مخالفت کی مگر آپؐ فرماتے تھے کہ بے شک قریش کی فلاں شاخ میرے دوست نہیں رہے، دشمن ہو گئے ہیں مگر آخر میرا ان سے ایک خونی رشتہ ہے، میں اس رحمی تعلق کے حقوق بہر حال ادا کرتا رہوں گا ۔

(بخاری کتاب الادب)

چنانچہ جب بھی اہل مکہ کو رسول اللہ کی مدد کی ضرورت ہوئی ۔ آپؐ نے ان سے احسان کا سلوک فرمایا ۔ مکہ میں جب قحط پڑا تو وہ رحمی رشتہ کا واسطہ لے کر آئے تو آپؐ نے نہ صرف بارش کے لئے دعا کی جس سے قحط دور ہو گیا بلکہ مدینہ سے فوری امداد بھی بھجوائی ۔

(بخاری کتاب التفسیر سورۃ الروم)

رشتہ داروں سے حسن تعلق کے متعلق اسلامی تعلیم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسلام ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں پر مال خرچ کرنے کا دُگنا ثواب ملتا ہے ۔ یہ تعلیم اور کسی مذہب نے نہیں دی اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جہاں اُسے زیادہ منافع ملنے کی امید ہو وہاں وہ زیادہ خرچ کرتا ہے ۔ اس طرح اسلام نے ہمیں رشتہ داروں پر خرچ کرنے کی ترغیب دلائی ہے ۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ وحی نازل ہوئی :۔

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ

(سورۃ آل عمران:93)

یعنی تم کامل نیکی کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک تم اپنی محبوب شئے (چیز) اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔
اس خدائی وحی کو سنتے ہی آپؐ کے صحابہ نے اپنی محبوب چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنی شروع کر دیں۔ حدیث میں ذکر ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ کے پاس ایک باغ تھا جو آپ کو بہت پسند تھا۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں یہ باغ اللہ کی راہ میں فقیروں اور مسکینوں میں خرچ کرنا چاہتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرا اجر ثابت ہو گیا اور تُو اسے قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر دے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مسکین کو صدقہ دینا ایک نیکی ہے اور مستحق رحمی رشتہ دار کو صدقہ دینا دوہری نیکی ہے۔

(ترمذی کتاب الزکوۃ باب ماجاء فی الصدقۃ الی ذی القرابۃ)

ایک دفعہ اُمّ المومنین حضرت میمونہؓ نے ایک لونڈی آزاد کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس بارے میں بتایا تو آپؐ نے فرمایا اگر تم اپنے ننہال کو (جو مستحق تھے) یہ لونڈی دے دیتی تو تیرے لئے بہت زیادہ اجر کا موجب ہوتا۔

(ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب فی صلۃ الرحم)

اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ رشتہ داروں سے صلہ رحمی اور حسن سلوک سے پیش آنا انسان کے گناہوں کی معافی کا ایک خاص ذریعہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہوا ہے کیا میری توبہ کی بھی کوئی صورت ہوسکتی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا تمہاری خالہ ہے؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا پھر اس سے حسن سلوک کرو۔ یہی عمل تمہارے لئے گناہوں سے معافی کا ذریعہ بن جائے گا۔

(ترمذی کتاب البر والصلۃ)

پس مسلمانوں کے لئے کیا ہی آسان نسخہ پیارے نبیؐ نے تجویز فرمایا ہے یعنی رشتہ داروں

سے حسن سلوک کر کے مسلمان نہ صرف خدا کی خوشنودی حاصل کر کے اپنے لئے اجرعظیم حاصل کریں گے بلکہ اپنے گناہوں کو معاف بھی کروائیں گے۔ضروری نہیں کہ رشتہ دار صرف مالی مدد کے ہی مستحق ہوں اور صرف مال ہی کے ذریعہ انکی مدد کی جائے بلکہ ہر مشکل وقت میں اپنی طاقت اوراستعداد کے مطابق ہمیں انکی مدد کرنی چاہئے۔اگر کوئی رشتہ دار دینی یا اخلاقی طور پر غلط راستہ پر چل رہا ہے تو ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ دعاؤں اور پیار ومحبت کے ساتھ ہمیں اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب آپ ؐ کواعلانیہ تبلیغ کا حکم دیا تھا تو کہا کہ سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں اور قبیلہ کو تبلیغ کر۔

پس اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ اگر کوئی عزیز رشتہ دار بے راہ روی کا راستہ اختیار کر کے اپنی دنیا وآخرت خراب کر رہا ہو یا غلط عقائد کی پیروی کر رہا ہو تو تعاون اور ہمدردی کا تقاضا ہے کہ اُسکی اصلاح کی کوشش کی جائے۔قرابت داروں سے احسان کا سلوک کرنا اور انکی بھلائی چاہنا ایک ضروری عمل ہے اور اسکے بغیر کوئی بھی شخص مومن ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا کیونکہ حضرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

(بخاری)

یعنی خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے،تم میں سے کوئی شخص سچا مومن نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہیں کرتا جو وہ اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہے۔

اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر مسلمان سے اس بات کی توقع رکھتا ہے اور اسے تاکید کرتا ہے کہ جو بات وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی بات وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی پسند کرے یہ نہ ہو کہ اپنے لئے تو اسکا پیمانہ اور ہو اور دوسروں کے لئے اور۔ایک اور حدیث اس بات کی تائید کرتی ہے۔آپ ؐ نے فرمایا کہ تمام مسلمان آپس میں ایک انسانی جسم کے اعضاء کا رنگ رکھتے ہیں۔جس طرح جسم کے کسی ایک عضو کے دُکھنے سے سارا جسم درد میں مبتلاء ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے دکھ سے ساری قوم میں بے چینی اور بے کلی پیدا ہو جانی چاہئے

والدین کے حقوق

حقوق العباد میں سب سے مقدم والدین کے حقوق ہیں۔اسلام نے والدین کے حقوق کی طرف خاص اہمیت دی ہے اور اولاد کو تاکیدی نصیحت کی ہے کہ وہ والدین کے تمام حقوق انہیں دیں اور ان کے ساتھ احسان کا سلوک کریں۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے ساتھ والدین کے ساتھ احسان کی بھی تاکید فرمائی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۴
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝۲۵

(سورۃ بنی اسرائیل:24,25)

تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ اُس کے علاوہ اور کسی کی عبادت نہ کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان کا سلوک کرو۔اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اُف تک نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب و احترام سے بات کرنا۔اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور اُن کے لیے یہ دعا کرنا کہ اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی۔

اس آیت کریمہ میں غیر اللہ کی عبادت کی سخت ممانعت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے۔اور حقیقتاً اسی نے بچہ کو وجود عطا فرمایا ہے اور والدین اس کی ایجاد کا ظاہری ذریعہ بنے ہیں۔اسی لئے قرآن کریم کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق کا بھی ذکر فرمایا ہے۔اور بڑھاپے میں انہیں اُف بھی نہ کہنا اسلئے فرمایا کیونکہ بڑھاپے میں خدمت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔یہ خدمت کی سعادت بڑی نیک بخت اولاد کا کام ہے۔اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اُس وقت اپنے بوڑھے والدین کی خدمت گزاری اور فرمابرداری سے جی نہ ہارے اور ان کے لئے دعائے مغفرت کرے۔قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملایا ہے اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (سورۃ

لقمان:۱۵) یعنی میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا بھی احسان مند رہو۔ یہ اسلئے فرمایا کیونکہ دنیا میں والدین ہی بچہ کی شروع سے ہر طرح کی پرورش اور تربیت کرتے ہیں۔ اور خاص طور پر ماں تو حمل کے زمانہ سے ولادت تک طرح طرح کی مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کرتی ہے اور پھر اپنا دودھ پلاتی ہے اور ہر طرح سے اسکا خیال رکھتی ہے اور خود پریشانیاں برداشت کرتی ہے۔ اسلئے فرمایا کہ پروردگارِ عالم کی کے بعد والدین کی فرماں برداری کرنا فرض ہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے والدین کے ان احسانات کی وجہ سے جو وہ اولاد پر کرتے ہیں، مسلمانوں کو بار بار خصوصی طور پر اپنے والدین کے حقوق کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان کی خدمت کی تلقین کی ہے۔ بہت ساری احادیث ہیں جن میں والدین کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ آنحضرتؐ نے تین مرتبہ فرمایا کہ رَغِم انفہٗ مٹی میں ملے اسکی ناک، مٹی میں ملے اسکی ناک، مٹی میں ملے اسکی ناک۔ جس نے اپنے بزرگ والدین میں سے ایک یا کو پایا لیکن انکی خدمت کر کے جنت نہ حاصل کرسکا۔

(مسلم کتاب الادب)

اللہ تعالیٰ کی خوشی والدین کی خوشی میں ہے۔

عَنْ عبدِ اللّٰہِ بنِ عمرٍؓ و قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رَضی الرَّبِّ فی رَضِیَ الوالِدِ وسَخَطُ الرَّبِّ فی سَخَطِ الْوَالِدِ۔

نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشی والدین کی خوشی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔ (ترمذی)

ایک اور حدیث ہے کہ ابی امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

هُمَا جَنَّتُكَ اَوْ نَارُكَ (ابن ماجہ)

فرمایا تیری جنت اور دوزخ وہی دونوں ہیں۔

یعنی اگر تُو انہیں راضی رکھے گا تو جنت کا مستحق بنے گا اور اگر ناراض رکھے گا تو جہنم کا سزاوار

ہوگا۔پس والدین کے حقوق کے تعلق سے ایسے تاکیدی ہدایات اور کسی مذہب یا دنیاوی قانون نے نہیں دئے یہ صرف اسلامی تعلیمات ہی کی امتیازی شان ہے جس نے ماں کے قدموں کے تلے جنت قرار دی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ: جو سعادت مند لڑکا اپنے والدین کو مہربانی کی نظر سے دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی ہر نظر پر حج مبرور لکھتا ہے۔صحابہؓ نے عرض کیا اگرچہ روزانہ سو مرتبہ دیکھے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بڑی اور پاک ہے (بیہقی)

اسی طرح حضورؐ نے فرمایا کہ ''**ماں کی دعا اولاد کے حق میں بہت تیزی سے قبول ہوتی ہے**'' اور ایک جگہ ارشاد ہے کہ ماں کی خدمت کرو کیونکہ اُس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔اس قسم کی اور بھی بہت ساری حدیثوں میں والدین کی خدمت اور ان کی فرمابرداری کی سخت تاکید ہے۔اور یہ اسی لئے ہے کیونکہ والدین نے ہمارے آرام کے لئے بہت ساری تکالیف برداشت کی ہیں۔اور وہ ہر وقت ہماری تعلیم اور تربیت کے دلی خواہش مند ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین بچپن میں ہی وفات پا چکے تھے۔اسلئے آپؐ کو بذات خود ان کی خدمت کا موقعہ میسر نہ آسکا۔لیکن آپؐ کی سیرت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپؐ اپنے والدین کے رشتہ داروں اور سب تعلق رکھنے اولے افراد کا بے حد احترام کرتے تھے خواہ انکا مذہب کوئی بھی ہو۔حضرت ابو طالبؓ نے آپؐ کی پرورش کی۔آپؐ ان کا بہت احترام کرتے اور ان کی اولاد سے بھی بڑی محبت کا سلوک فرماتے۔حضرت علیؓ کو آپؐ نے اپنی کفالت میں رکھا تھا۔اسی طرح آپؐ اپنی رضاعی والدہ حضرت حلیمہؓ سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔چنانچہ عہد نبوت میں جب وہ آپؐ سے ملنے آئیں تو آپؐ میری ماں! میری ماں کہتے ہوئے ان سے لپٹ گئے اور ان کے لئے اپنی چادر بچھا دی۔نیز آپؐ اپنے رضاعی والد حارث بن عبد العزی کے ساتھ بھی انتہائی عزت واحترام سے پیش آتے تھے۔چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ:

الوالدُ اوسطُ ابوابِ الجنۃِ فان شئت فحافظ علی الباب او ضیّع

(رواہ الترمذی وابن ماجہ)

جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ باپ ہے۔ تیرا جی چاہے تو اسکی حفاظت کر اور اگر چاہے تو اس کو ضائع کر دے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے میں نے عرض کیا کہ بہترین عمل کون سا ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے: فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد؟ فرمایا ماں باپ سے اچھا برتاؤ کرنا۔ میں نے عرض کیا پھر کونسا عمل فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن قیسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد پر جانے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے اُس سے پوچھا کہ کیا تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے کہا ہاں زندہ ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ انہی کی خدمت میں جہاد کا ثواب موجود ہے

(بخاری۔مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ میں ہجرت کی بیعت کرنے آیا ہوں۔ جب میں چلا ہوں تو ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا فوراً واپس جاؤ اور ان دونوں کو جس طرح رُلایا ہے اسی طرح انہیں ہنساؤ۔ (ابوداؤد)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا جو شخص رزق کی کشادگی اور عمر کی زیادتی کا خواہشمند ہو اس کو چاہئے کہ صلۂ رحمی کرے اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

(مسند احمد)

اسی طرح مشہور حدیث ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ میرے نیک سلوک اور اچھے برتاؤ کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ سائل نے پوچھا پھر کون؟ آپؐ نے پھر فرمایا تمہاری ماں اور اسی طرح تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا۔ پھر سائل نے چوتھی مرتبہ پوچھا کہ ماں کے بعد کون؟ تو آپؐ نے

فرمایا تمہارا باپ۔(بخاری ومسلم)

اسی طرح ترمذی کی ایک حدیث سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا انسان کے بہت سارے گناہوں کا کفارہ ہے۔اور حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ والدین کی نافرمانی گناہِ عظیم ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ہر گناہ کے بدلہ میں عذاب اور ہر جرم پر گرفت کو مؤخر کیا جا سکتا ہے لیکن ماں باپ کی نافرمانی کرنے والے کا گناہ ایسا سخت ہے کہ اس کا مواخذہ مرنے سے پہلے بھی کیا جاتا ہے۔(حاکم)

بخاری کی ایک حدیث ہے کہ منجملہ کبائز کے ایک گناہ یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین پر لعنت کرے۔اسی طرح حدیث میں کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دینا اپنے ہی ماں باپ کو گالی نکالنے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔اسلامی تعلیم یہ ہے کہ والدین کی نافرمانی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔

والدین کی اطاعت ہی تمام اخلاق و ادب کی چیز ہے۔انکی فرمانبرداری اور سچے دل سے خدمت گزاری کرنا تمام لوگوں میں ہر دل عزیز بننے کا بھی ذریعہ ہے۔والدین کی اطاعت کرنے والے شخص کی صحبت کو باعثِ فخر سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے والدین کے قبر کی ہر جمعہ کو زیارت کی اس کے گناہ معاف کئے گئے ۔اور یہ اسلئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ من رضی عنہ والدہ فانا عنہ راضٍ ۔یعنی جس شخص سے اسکے ماں باپ راضی ہوں گے اس سے میں بھی راضی ہوں۔آج اس دور میں بلکہ ہمیشہ ہی سے بعض انسان اپنی بیوی کو والدہ پر فضیلت دے کر والدین کی خدمت صحیح ڈھنگ سے نہیں کرتے اور اس طرح والدہ سے زیادہ بیوی کی خدمت کرتے ہیں۔اسلام نے اس عمل کی سخت مخالفت کی ہے اور سکھلایا ہے کہ ہمیشہ والدین کو بیوی پر فضیلت دینی چاہئے۔چنانچہ رسول کریمؐ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی بیوی کو والدہ پر فضیلت دیتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں اور اس شخص کے فرائض ونوافل کچھ قبول نہیں کئے جاتے۔غرض یہ کہ فضیلت تو

بہر حال والدہ کو ہی ہے۔ اگر اولاد مکمل طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے والدین اور بیوی کے حقوق ادا کریگا تو یقیناً ان کا گھر امن کا گہوارا ہوگا جس میں کسی قسم کا کوئی گھریلو جھگڑا نہیں ہوگا۔

باپ کی خواہش کا احترام کرو

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا۔لیکن میرے والد محترم حضرت عمرؓ اس کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس عورت کو طلاق دے دو میں نے انکار کر دیا۔ پھر جب وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ سے اس ساری بات کا ذکر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ: اس عورت کو طلاق دے دو۔

(ترمذی۔ابوداؤد)

ماں کے حقوق زیادہ ہیں

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ اولاد پر ماں کا حق بہر حال باپ کے حق سے زیادہ ہے۔اور اسکے ساتھ حسن سلوک کرنا اور اسکی دیکھ بھال کرنی زیادہ ضروری اور واجب ہے۔اور اگر ایسی صورت پیش آجائے جس میں بیک وقت دونوں کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہو جائے مثلاً ماں باپ کے درمیان کسی وجہ سے ان بن یا جدائی ہو تو ایسی صورت نکالی جائے کہ تعظیم واحترام میں تو باپ کے حقوق کو فوقیت دو اور خدمت گزاری اور امداد میں ماں کے حقوق کو فوقیت دو۔ ماں باپ کے حقوق کی فہرست بہت طویل ہے، بلکہ اگر انکے مرتبہ اور درجہ کو دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اولاد اگر پوری زندگی بھی ان کے حقوق کی ادائیگی میں صرف کر دے تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے انکے تمام حقوق ادا کر دئے ہیں۔ تاہم اسلام نے کچھ ایسی چیزیں بیان کر دی ہیں جو زیادہ اہمیت کی حامل ہیں اور جن کا لحاظ ہر صورت میں ہونا چاہئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کی فضیلت اس طرح پر بھی قائم فرمائی ہے کہ اولاد کی تعلیم

وتربیت کے معاملہ میں ماں کو بہ نسبت باپ کے زیادہ ذمہ دار قرار دیا ہے اور اسکے نتیجہ میں ماں کو جنت ساز بتایا۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں:

الجنة تحت اقدام الامھات

یعنی جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماں کی مامتا کا بہت خیال فرماتے تھے۔ایک دفعہ فرمایا جو شخص ماں اور اس کی اولاد میں جدائی ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کے پیاروں سے جدا کر دیگا ۔حضرت عبداللہؓ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کسی ایک جگہ کے قیدی لائے جاتے تو ایک گھرانے کے سپرد کرتے تا کہ ان کے بچے ان سے جدا نہ ہوں

(ابن ماجہ کتاب التجارات باب النہی عن التفریق)

لیکن بائبل میں ماں کی عزت اور فرمانبرداری کے متعلق کیا تعلیم ہے؟ قارئین خود ہی ملاحظہ فرمائیں۔متی کی انجیل میں لکھا ہے کہ:

”جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہے میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور میری بہن اور ماں ہے۔“

(متی باب 12 آیت:50-46)

باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کی اہمیت

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انَّ من ابرِّ البِرِّ صلة الرجُلِ

اھل ودابیہ بعدان یُّولّی

(رواہ مسلم)

یعنی حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: سب سے اعلیٰ نیکیوں میں سے ایک اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے مرنے کے بعد یا اس کی غیر موجودگی میں اس کے دوستوں کے ساتھ احسان وحسنِ سلوک کرے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا باپ مر گیا ہو یا سفر میں گیا ہو تو اس کے دوستوں کے ساتھ احسان و مروّت کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک کا برتاؤ کرنا گویا اپنے باپ کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنا ہے۔ اور اس کا یہ عمل بہترین اور اعلیٰ نیکی میں شمار ہوگا۔

والدین کو تکلیف پہنچانا حرام ہے

اسلام کی یہ امتیازی تعلیم ہے کہ اس نے سختی کے ساتھ انسان کو اپنے والدین کے تمام حقوق ادا کرنے کی تلقین کی ہے گو دیگر مذاہب میں بھی یہ تعلیم ہے مگر جس خوبی اور کمال کے ساتھ اسلام نے اسے بیان کیا ہے اسکی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ مردوزن کو اسلام نے جو حقوق عطا کئے ہیں ان میں سے والدین کا حق ایک نہایت ہی ضروری حصہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ:

عن المغیرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انّ اللہ حرّم علیکم عقوقُ الامھات و وأد البنات، و منع وھاتِ و کرِہ لکم قیل و قال و کثرۃ السئوال و اضاعۃ المال

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر اس امر کو حرام قرار دیا ہے کہ ماں کی نافرمانی کر کے اس کا دل دکھایا جائے، لڑکیوں کو زندہ دفنا دیا جائے اور بخیلی اختیار کی جائے۔ نیز قیل وقال، سوال کی زیادتی اور مال کے ضیائع کو تمہارے لئے مکروہ قرار دیا ہے۔

(بخاری شریف)

اولاد کے مال میں والدین کا حق

انسان کے لئے سب سے مقدم اس کے ماں باپ ہوتے ہیں کیونکہ اولاد کے پاس جو بھی ہوتا

ہے وہ سب ماں باپ کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ ہی میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ کوئی بھی مذہب ایسا نہیں جس نے اولاد کے مال میں ماں باپ کا حق تسلیم کیا ہو۔ تورات میں بے شک ایسے احکام پائے جاتے ہیں کہ ماں باپ کا ادب کرو۔ مگر اولاد کے مال میں اُن کا حق نہیں رکھا۔ یہ قرآن کریم ہی ہے جس نے اولاد کے مال میں والدین کا حق رکھا ہے اور بڑا اہم حق رکھا ہے۔ قرآن کریم نے والدین کو اولاد کے ورثہ کا حقدار تسلیم کیا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں جب اولاد زیادہ ہو تو ماں باپ کو اولاد سے زیادہ حق ملتا ہے۔ یہ ایک ایسی تعلیم ہے جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جس نے ماں باپ کے ایسے حقوق مقرر کئے ہوں، یہ تو سب کہتے ہیں کہ والدین کی عزت کرو مگر تمام باتیں صرف زبانی جمع خرچ تک محدود ہوتی ہیں۔ پس یہ اسلامی تعلیمات ہی کا امتیاز ہے کہ اس نے اولاد کے مال میں والدین کو حق قائم کر کے اُن کے مرتبہ کو تسلم کیا ہے۔

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۲)

اولاد کے حقوق

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝۷۵

(سورۃ الفرقان:75)

اور وہ لوگ جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں میں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا

اولاد کے لئے ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے۔ حتی کہ انبیاء نے بھی طلب اولاد کے لئے دعا مانگی ہے۔ حضرت زکریاؑ نے یہ دعا مانگی تھی:

رَبِّ هَبْ لِيْ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاءِ ۝

(آل عمرآن)

اے میرے رب! تُو میرے لئے اپنی جانب سے نیک اولاد عطا فرما۔ یقیناً تُو ہی دعاؤں کا سننے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نیک اولاد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ جسے آنکھوں کی ٹھنڈک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام نے جہاں اولاد کو والدین کے حقوق ادا کرنے کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے وہیں دوسری طرف والدین پر اولاد کے بھی بعض حقوق متعین فرمائے ہیں اور انہیں ادا کرنے کی انہیں تلقین کی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت جاہلیت کے اس دور میں ہوئی جب ہر قسم کے انسانی حقوق پامال کئے جا رہے تھے۔ اولاد اور بچوں کے حقوق کا بھی یہ حال تھا۔ کچھ بچے افلاس کی وجہ سے قتل کر دئے جاتے تھے اور بعض قبائل میں تو لڑکی کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا۔ رسول کریمؐ نے آکر اولاد کے عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا حق بھی قائم کیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ

یعنی اپنی اولاد کی بھی عزت کیا کرو

(ابن ماجہ کتاب الادب باب برالوالد)

نیز فرمایا کہ ان کی عمدہ تربیت کیا کرو۔ اسی طرح فرمایا کہ:۔ والد کا اولاد کے لئے حسنِ تربیت سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا۔

(مسند احمد جلد ۴ ص ۷۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ اسلام کی اس ننھی پود کو آپؐ روحانی اور جسمانی دونوں پہلوؤں سے تندرست دیکھنا چاہتے تھے۔ حضورؐ نے بچوں کی بہتری اور بھلائی کے لئے بچوں کے والدین کو یہ نصیحت فرمائی کہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے ان کے لئے دعائیں کیا کرو۔ پھر یہ بھی آپؐ کا احسان اور شفقت ہے کہ حکم دیا کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کا عقیقہ کرو جو کہ ایک قسم کا صدقہ ہے تا کہ بچہ تکالیف سے محفوظ رہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب قوم میں بچوں سے محبت کی بہت کمی تھی بلکہ بعض لوگ اس کو خوبی کی بجائے ایک عیب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک دیہاتی جس کا نام اقرعؓ بن حابس تھا اس نے دیکھا کہ آنحضورؐ اپنے ایک نواسے

حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگا کہ میرے دس بیٹے ہیں میں نے ان میں سے کبھی کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آنحضورؐ نے فرمایا:-

من لا یرحم لا یرحم

یعنی جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

(مسلم، ۴: ۱۸: ۳ حدیث ۱۱۹۱)

پھر رسول کریمؐ نے حسن تربیت کے لئے یہ پُرحکمت تعلیم فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اولاد کی نعمت عطا فرماتا ہے تو اسے چاہئے کہ سب سے پہلے وہ شخص کسی دیندار اور نیک آدمی سے اُس بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہلوائے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ بچے کی تربیت اور اسے دیندار بنانے کا عمل آج ہی سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں حدیث میں آتا ہے کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ وُلِدَ لَهُ مَوْلُودٌ فَأَذَّنَ فِيْ أُذُنِهِ الْيُمْنٰى وَأَقَامَ فِي الْيُسْرٰى لم تَضُرَّهُ أُمُّ الصِّبْيَانَ

اس ارشاد کے ذریعہ دراصل آپؐ نے یہ پیغام دیا کہ آغاز سے ہی بچوں کے کان میں اللہ اور رسول کی باتیں پڑنی چاہئیں اور آغاز سے ہی تربیت کا سلسلہ شروع کر دینا چاہئے۔

آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ آپؐ سفر سے واپس تشریف لاتے تو راستہ میں جو بچے آپؐ کو ملتے ان کو اپنے ساتھ سواری میں آگے پیچھے بٹھا لیتے۔ اپنے نواسوں حسنؓ اور حسینؓ سے حضورؐ کو بہت محبت تھی۔ ان کو دیکھنے بکثرت حضرت فاطمہؓ کے تشریف لے جاتے۔ آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ خدایا مجھے ان بچوں سے محبت ہے تُو بھی ان سے محبت کر اور ان سے محبت کرنے والوں سے محبت کر۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضورؐ کے پاس کوئی پہلا پھل آتا تو پھلوں میں برکت کی دعا کرتے اور پھر پہلے وہ پھل مجلس میں موجود سب سے چھوٹے بچے کو عطا فرماتے۔

(مسلم کتاب الحج حدیث 474)

راہ چلتے بچے مل جاتے تو آپؐ ان کو سلام کرتے بچے آپؐ کے گرد جمع ہو جاتے آپؐ ان سے

پیار اور محبت کی باتیں کرتے ۔ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور دعاؤں سے نوازتے ۔ایک دفعہ بچوں کو دیکھ کر فرمایا:

''تم بے شک ماں باپ کو بخیل بناتے ہو۔ بزدل بھی بناتے ہو لیکن تم جنت کی خوشبو بھی ہو''

(ترمذی ابواب البر والصلہ)

آپؐ کے اسوہ حسنہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں بچوں کے آرام کا خاص احساس ہونا چاہئے ۔چنانچہ جب کوئی بچہ روتا تو آپؐ بے چین ہوجاتے تھے۔آپؐ فرماتے ہیں: **بعض دفعہ ارادہ کرتا ہوں کہ نماز لمبی پڑھاؤں۔ پھر میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز مختصر کردیتا ہوں**

(ترمذی ابواب الصلوٰۃ)

اسلام نے اولاد کا سب سے پہلا حق تو یہ قرار دیا ہے کہ **اولاد کو ادب سکھاؤ**۔حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: ایک شخص کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ساڑھے تین سیر غلہ یا کھجوریں وغیرہ صدقہ دینے سے بہتر ہے۔(ترمذی)

اسی طرح حضرت ایوب بن ابی موسیٰ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: ایک باپ کا اپنے بیٹے پر ادب سکھانے سے بڑھ کر اور کوئی احسان نہیں ہے۔(ترمذی)

دنیا میں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ لوگ لڑکوں کی پیدائش پر خوش ہوتے ہیں اور لڑکیوں کی پیدائش کے وقت ناخوش ہوتے ہیں ۔یہ مشرکانہ اور جاہلانہ رسم ہے اور اسلام نے اس سوچ کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے۔قرآن حکیم میں اس حماقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ

(سورۃ النحل)

یعنی اور جب ان میں سے کسی کے ہاں لڑکی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو غم کی وجہ سے ان کا منہ کالا ہوجاتا ہے اور غصہ میں بھر جاتا ہے۔

یہ حقیقت میں ان لوگوں کی نادانی اور ایمان کی کمی ہے ورنہ لڑکا ہو یا لڑکی دونوں کا خالق خدا ہے اور دونوں ہی رحمت کا سبب بنتے ہیں ۔اسلام نے لڑکیوں کے حقوق دلانے کے لئے بہت

احسن تعلیمات دنیا کے سامنے پیش کیں۔ آنحضورؐ نے لڑکیوں کی بہتر پرورش اوران کے حقوق کی نگہداشت پر زیادہ زور دیا۔ اسلام سے زیادہ اور کسی مذہب نے لڑکیوں کے حقوق کے لئے اس قدر پرزور آواز نہیں اٹھائی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان کی پرورش کرے اوران کا کفیل ہو اس کے لئے جنت واجب ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر کسی کی دو بیٹیاں ہوں فرمایا دو والے کے لئے بھی یہی بشارت ہے۔ عرض کیا گیا کہ اگر کسی کی ایک ہی بیٹی ہو فرمایا ایک والے کے لئے بھی یہی خوشخبری ہے۔ اسی طرح آپؐ نے فرمایا لڑکی کے بے دین رہ جانے سے چار آدمی پکڑے جائیں گے۔ اسکا باپ، بھائی، خاوند اور بیٹا۔ عرب میں لوگ لڑکیوں کو ورثہ سے محروم کر دیتے تھے۔ اسلام نے ان کا حق مقرر فرما کر ان پر احسان کیا ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں بھی بھورن ہتیا یعنی دختر کشی کی نہایت ہی غلیظ رسم رائج ہے جس کے تحت لوگ لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیتے ہیں۔ اسلام نے اس کے سدّ باب کے لئے بھی کوشش کی اور ایسی حسین تعلیم دی کہ اگر لوگ اسکی پیروی کریں تو وہ کبھی بھی لڑکیوں کو کمتر نہ سمجھیں

بھرون ہتھیا (دختر کشی)

اس برائی کو دنیا سے دور کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ یہ برائی بہت ہی خطرناک ہے اور انسان اور انسانیت کے لئے زہر قاتل ہے۔ اگر فوری اِن کا ازالہ کا راستہ ہم نے نہیں اپنایا تو ڈیناسور کی طرح ایک وقت آئے گا کہ انسان صفحہ ہستی سے نابود ہو جائے گا۔

بانئ اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے رحمت تھے خصوصًا طبقہ نسواں کے لئے اِس زمانے میں پیدا ہوئے جبکہ دنیا میں چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ خصوصًا عرب کا علاقہ تو جہالت کے عمیق ترین گڑھے میں پڑا تھا اور لڑکیوں کی پیدائش کو قابل افسوس خیال کیا جاتا تھا۔ (سورۃ النحل) لیکن افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج کی اس مہذب دنیا میں بھی جبکہ ہر طرف علم کا دور ہے، عورت ذات سے اس قدر ظلم وستم کیا جاتا ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے

ہی اسکو ختم کیا جاتا ہے۔لڑکی پیدا ہونے کی خبر سے باپ کی حالت شرم اور ذلت کے احساس سے ناگفتہ بہ ہوجاتی ہے۔اور ماں اس کی پیدائش کو ایک جرم سمجھتی ہے۔اور چھپائے پھرتی ہے۔

عجیب اور فکر والی بات ھیکہ جس کی گود میں پرورش پا کر اور جسکی پیٹ سے پیدا ہو کر مرد جیسی ایک مضبوط ہستی کام کے قابل بن جاتی ہے اسی کی پیدائش کو منحوس سمجھا جاتا ہے اور دنیا میں آنے سے پہلے اسکو ختم کیا جاتا ہے۔اور اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو ماں جیسا عظیم سایہ ختم ہوجائے گا بہن جیسی بڑی پیاری نعمت ختم ہوجائے گی۔بیٹی جیسا پیارا وجود مٹ جائے گا۔نہ کہیں ماں ہوگی نہ کہیں بہن نہ بیٹی نہ محبت سے سرشار بیوی۔مردوں کو سوچنا چاہئے اور غور کرنا چاہئے کہ عورت کے ختم ہونے کا مطلب نسلِ انسانی کا دنیا سے مٹ جانا ہے۔

بانئ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اکمل المومنین احسنھم خلقاً وخیارھم لنسائِھم"

کہ جس قدر انسان اپنی بیوی سے محبت اور پیار کا سلوک کرتا ہے اتنا ہی اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے۔

ایک جگہ فرمایا کہ جنّت صرف مردوں کے لئے ہی وقف نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس میں برابر کی حصہ دار ہیں۔

اسلام نے عورت کو ذلت کے مقام سے اٹھا کر عزت کے مقام پر فائز فرمایا اور اہل دنیا جو اسکی پیدائش کو اپنے لئے ذلت سمجھتی تھی آنحضرتؐ نے عورت کے بارہ میں تین اصلاحات نافذ فرما کر اس مظلوم کے وقار کو بلند فرمایا۔

(۱)۔اوّل معاشرتی اصلاح جس میں مردوں کو آگاہ کیا کہ ہمیشہ عورت کے ساتھ عمدہ سلوک سے پیش آؤ۔ وعاشروھن بالمعروفکہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔اگر ماں کے قدموں کے نیچے جنت بتائی تو دو بیٹوں کی تربیت کر کے اُن کی شادی کر دینے والے کے متعلق فرمایا کہ اُسے آنحضرت صلعم کے ساتھ جنت میں مقام ملیگا اس طرح جس طرح دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔

(۲)۔ دوم تمدنی اصلاحات جن میں عورت کے اختیارات کو وسیع فرمایا۔ عورت کو بھی وہی حقوق عطا کئے جو مردوں کو حاصل ہیں۔ اور وارثت میں اپنے باپ بیٹے اور خاوند کے مال کی حقدار بنایا۔ اور عورت کو اپنے مال کا مالک قرار دیا۔

(۳)۔ روحانی اصلاحات۔ روحانیت کے بارے میں فرمایا کہ اے عورتو تمہاری روح کا بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے۔ جیسا کہ مردوں کا۔ ایک مومن عورت اعمال صالحہ کی پابندی سے اسی طرح خدا کا قرب پا سکتی ہے جس طرح ایک مومن مرد پاتا ہے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا پر یہ واضح کیا کہ عورت کی پیدائش کسی بھی لحاظ سے مرد کی پیدائش سے کم نہیں ہے۔

آج اسلام کی اس حسین تعلیم کو جماعت احمدیہ خلافت کے زیر سایہ دنیا کے ہر ملک میں عام کر رہی ہے۔

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد میں بھی عدل کرنے کی نصیحت فرمائی ہے اور سب بچوں کو برابر حقوق دینے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے

’’ایک دفعہ ایک صحابی نے اپنے بیٹے کو کوئی قیمتی تحفہ دیا اور اپنی بیوی کی خواہش پر رسول کریمؐ کو اس پر گواہ بنانے کے لئے حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس سے پوچھا کہ کیا سب بچوں کو ایسا ہی تحفہ دیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا پھر ظلم کی اس بات پر میں گواہ نہیں بن سکتا۔‘‘

(بخاری کتاب الھبۃ)

پھر زمانہ جاہلیت میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اولاد باپ کا حق ہے کیونکہ وہ اُس کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے اور یہ جائز سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی چاہے تو اپنی اولاد کو بیچ ڈالے یا چاہے تو اُسے مار ڈالے۔ چنانچہ لڑکیوں کو مارنے کا بعض قبائل عرب میں رواج تھا اور وہ لڑکیوں کو اپنی جھوٹی عزت کے نام پر زندہ درگور کر دیتے تھے۔ حضورؐ جب اس قسم کو کوئی واقعہ سنتے تو سخت غمگین ہو جاتے تھے اور اس ظلم سے سختی سے منع فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح اولاد کو فروخت کردینے کا بھی

رواج تھا۔ اسلام نے اس پر پابندی لگادی اور سختی سے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ تم لڑکیوں کا قتل کروگے اور بغیر حساب کتاب کے چھوڑ دئے جاؤ گے کیونکہ وہ تمہارے نطفہ سے پیدا ہوئی تھی بلکہ قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ کیوں تم نے اسکا قتل کیا۔ (سورۃ التکویر)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اپنا نمونہ یہ تھا کہ آپؐ نے کبھی تربیت کی خاطر بچوں کو سزا نہیں دی۔ بلکہ محبت اور دعا کے ذریعہ ہی ان کی تربیت کی۔ ہمیشہ اولاد بلکہ زیر تربیت بچوں کے لئے بھی دعا کرتے تھے کہ:

''اے اللہ میں ان سے محبت کرتا ہوں تُو بھی ان سے محبت کر'' (بخاری کتاب المناقب)

آپؐ نے مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات قائم کردی کہ بچیوں کی پیدائش باعثِ رحمت ہے۔ آپؐ بچیوں سے شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہجرت کے موقعہ پر انصار کی چھوٹی چھوٹی بچیاں اشعار پڑھ کر آپؐ کا مدینہ میں استقبال کررہی تھیں۔ آپؐ نے ازراہ شفقت فرمایا ''بچیو! تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ انہوں نے عرض کیا جی ہاں یارسول اللہ! فرمایا میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔''

(سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی)

اہل عرب اپنے بچوں کو چومنا اوران سے لاڈ پیار کرنا پانی سرداری کے منافی سمجھتے تھے۔ مگر آپؐ نے ہمیشہ اس رسم بد کی مذمت فرمائی۔ آپؐ اپنے بچوں کو گود میں اٹھالیتے ،بعض اوقات کندھوں پر بٹھالیتے ،سواری پر ہوتے تو اپنے آگے یا پیچھے انہیں سوار کرلیتے ،انکی پیشانی چومتے اورانہیں خیر و برکت کی دعا دیتے۔

(البخاری، ۲: ۴۴۳، باب ۲۲)

آنحضورؐ کی یہ محبت صرف مسلمان بچوں کے لئے ہی نہیں تھی۔ آپؐ تو سب کے لئے رحمت مجسم تھے۔ چنانچہ ایک غزوہ میں مشرکین مکہ کے چند بچے بھی جھڑپ میں مارے گئے۔ آپؐ بہت آزردہ ہوئے۔ کسی نے عرض کیا کہ وہ تو مشرکین کے بچے تھے۔ فرمایا مشرکین کے بچے تم سے

بہتر ہیں۔خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ اسلام کی یہ منفرد تعلیم ہے کہ اس نے بچوں کے ساتھ خواہ وہ دشمنوں کے ہی کیوں نہ ہوں احسان کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور اسکا سبب یہ بیان کیا ہے کہ وہ معصوم ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ:

''ہر جان خدا کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔ بعد میں اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

(بخاری ابواب التفسیر)

اسکے مقابل پر تورات میں جارحانہ حملوں کے بعد عورتوں اور بچوں کو اسیر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔(گنتی باب 31 آیت:9)

الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت باپ اولاد سے حسنِ سلوک اور حسنِ تربیت کے لئے بہترین اور خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے جو ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپؐ کے ایک صحابی حضرت انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ:۔

''میں نے رسول کریمؐ سے بڑھ کر بچوں کے ساتھ شفقت کرنے والا اور کوئی نہیں دیکھا۔''

(بیہقی)

بچوں سے حسن سلوک کی یہ تعلیم اور انکے حقوق کا اس قدر تفصیلی تذکرہ اور کسی بھی مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ یہ محض اسلام ہی کی امتیازی شان ہے۔ دیگر مذاہب میں تو بعض ایسی تعلیمات بھی پائی جاتی ہیں جن کے مطابق بچوں کے ساتھ زیادہ پیار نہیں کرنا چاہئے۔ یہ تعلیم جہاں انسانی فطرت کے مخالف ہے وہیں بچوں کی تربیت کے لحاظ سے بھی درست نہیں اور اسلام اسکی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ ہندو مذہب کی مقدس کتب میں درج ہے کہ:

''بچوں سے لاڈ نہیں کرنا چاہئے بلکہ تنبیہہ ہی کرتے رہیں۔''

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش باب ۲ دفعہ ۱۲۰)

اسی طرح بائبل میں ہے کہ: باپ اپنی بیٹی کو لونڈی ہونے کے لئے بیچ سکتا ہے۔

(خروج باب 21 آیت:7-8)

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اولاد کے حصے میں برابری کا سلوک نہیں کیا ہے اور لڑکیوں کو لڑکوں کی نسبت کم حصہ دے کر ان پر زیادتی کی ہے اور انکے حقوق پامال کئے ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات کی طرح یہ تعلیم بھی پُر حکمت ہے۔ اس حکمت کا ذکر کرتے ہوئے امام الزمان حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:

''تمہاری اولاد کے حصے کے بارے میں خدا کی وہ وصیت ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا کرو۔ یہ اسلئے کہ لڑکی سسرال میں جا کر ایک حصہ لے لیتی ہے پس اس طرح سے ایک حصہ ماں باپ کے گھر سے پا کر، اور ایک حصہ سسرال سے پا کر اس کا حصہ لڑکے کے برابر ہو جائے گا۔''

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۰۲)

سچ تو یہ ہے کہ ورثہ کے متعلق جس قدر اسلام نے اولاد کو حقوق دلائے ہیں، اسکا چھوٹا سا حصہ بھی دیگر مذاہب نے نہیں دلایا۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت مرزا بشیر الدین محمودؓ بیان فرماتے ہیں:۔

''اسی طرح ورثہ کے احکام ہیں۔ ورثہ کے متعلق دوسرے مذاہب کی یہ تعلیم ہے کہ جائیداد کا باپ مالک ہے، وہ جسے چاہے اپنی جائیداد دیدے۔ مگر اسلام کہتا ہے ورثہ میں سب کا حق ہے۔ یہ درست نہیں کہ تم سب مال اور جائیداد ایک کو ہی دے دو۔ اسی وجہ سے اسلام نے ہر ایک کے الگ الگ حصے مقرر کئے ہیں جو ہر ایک کو ملنے ضروری ہیں جو ان حصوں کو بلا وجہ توڑے وہ گنہگار رہتا ہے۔ اس کے برخلاف عیسائی ممالک میں عام طور پر جائیداد کا صرف بڑا لڑکا ہی وارث ہوتا ہے۔۔ بہرحال اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ سب اولاد کو اپنی جائداد سے حصہ دو اور کسی کو اُس کے جائز حق سے محروم نہ کرو۔ اس طرح اسلام نے نہ صرف اولاد کے حقوق کو محفوظ کر دیا بلکہ اُن کے جذبات کا بھی تذکیہ کیا ہے۔''

(تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ ۳۲۴)

اسلام نے بیٹیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص خیال رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹیوں کی حسن پرورش اور تعلیم وتربیت کرنے والوں کے لئے یہ خوشخبری عطا فرمائی ہے کہ: جو شخص تین بچیوں کی احسن رنگ میں پرورش کرتا ہے اور تعلیم وتربیت سے ان کو مذین کرتا ہے اور اچھا رشتہ دیکھ کر انکی شادی کر دیتا ہے تو اس کے لئے جنت واجب ہے۔

(ابوداؤد کتاب الادب)

پس اسلام کے نزدیک بیٹوں کو بیٹیوں پر کسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور جو حقوق اسلام نے اولاد کو دئے ہیں وہ پہلی کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتے۔

آخر پر خاکسار امام الزمان سیدنا حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود ومہدی علیہ السلام کے اقتباسات کے ساتھ اپنے مقالہ کے اس حصہ کو ختم کرتا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:۔

’’پس جب تک اولاد کی خواہش اس غرض کے لئے نہ ہو کہ وہ دیندار اور متقی ہو اور خدا تعالیٰ کی فرمانبردار ہو کر اس کے دین کی خادم بنے، بالکل فضول بلکہ معصیت اور گناہ ہے اور باقیات الصالحات کی بجائے اس کا نام باقیات السیئات رکھنا جائز ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں صالح اور خداترس اور خادم دین اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو اس کا کہنا بھی نرا ایک دعویٰ ہی دعویٰ ہوگا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت میں ایک اصلاح نہ کرے۔ اگر خود فسق وفجور کی زندگی بسر کرتا ہے اور منہ سے کہتا ہے کہ میں صالح اور متقی اولاد کی خواہش رکھتا ہوں تو وہ اپنے دعویٰ میں کذاب ہے صالح اور متقی اولاد کی خواہش سے پہلے ضروری ہے کہ وہ خود اپنی اصلاح کرے اور اپنی زندگی کو متقیانہ زندگی بنا دے تب اس کی ایسی خواہش ایک نتیجہ خیز خواہش ہوگی اور ایسی اولاد حقیقت میں اس قابل ہوگی کہ اس کو باقیات الصالحات کا مصداق کہیں۔ اگر یہ خواہش صرف اس لئے ہو کہ ہمارا نام باقی رہے اور وہ ہمارے املاک واسباب کی وارث ہو یا وہ بڑی نامور اور مشہور ہو اس قسم کی خواہش میرے نزدیک شرک ہے۔‘‘

(ملفوظات جلد دوم)

''بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اولاد کے متعلق کچھ مال چھوڑنا چاہئے۔ مجھے حیرت آتی ہے کہ مال چھوڑنے کا تو ان کو خیال آتا ہے مگر یہ خیال ان کو نہیں آتا کہ اس کا فکر کریں کہ اولاد صالح ہو طالح نہ ہو۔ مگر یہ وہم بھی نہیں آتا اور نہ اس کی پرواہ کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے لوگ اولاد کے لئے مال جمع کرتے ہیں اور اولاد کی صلاحیت کی فکر اور پرواہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی اولاد کے ہاتھوں سے نالاں ہوتے ہیں۔ اور اس کی بداطواریوں سے مشکلات میں پڑ جاتے ہیں اور وہ مال جو انہوں نے خدا جانے کن کن حیلوں اور طریقوں سے جمع کیا تھا آخر بدکاری اور شراب خوری میں صرف ہوتا ہے اور وہ اولاد ایسے ماں باپ کے لئے شرارت اور بدمعاشی کی وارث ہوتی ہے۔''

(الحکم 10 نومبر 1905ء)

''حضرت داؤد علیہ السلام کا قول ہے کہ میں بچہ تھا جوان ہوا اور اب بوڑھا ہوگیا۔ میں نے متقی کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا کہ اسے رزق کی مار ہو اور نہ اس کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ تو کئی پشت تک رعایت رکھتا ہے۔ پس خود نیک بنو اور اپنی اولاد کے لئے ایک عمدہ نمونہ نیکی اور تقویٰ کا ہو جاؤ۔ اور اس کو متقی اور دیندار بنانے کے لئے سعی اور دُعا کرو۔ جس قدر کوشش تم ان کے لئے مال جمع کرنے کی کرتے ہو اس قدر کوشش اس امر میں کرو۔''

(ملفوظات جلد 8 صفحہ 109)

''وہ کام کرو جو اولاد کے لئے بہترین نمونہ اور سبق ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے اول خود اپنی اصلاح کرو۔ اگر تم اعلیٰ درجہ کے متقی اور پرہیز گار گنے جاؤ گے اور خدا تعالیٰ کو راضی کرلو گے تو یقین کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کرے گا۔''

(الحکم 10 نومبر 1905ء)

حقوق کا غلط استعمال

یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان کو اسکا حق بغیر کسی رکاوٹ کے ملنا چاہئے لیکن دوسری طرف اس بات کا بھی خیال کرنا چاہئے کہ حقوق کی آڑ میں اس کا غلط استعمال نہ ہو اور نہ ہی حقوق لینے کے لئے ناجائز طریق استعمال کئے جائیں۔ آج کل دنیا میں ہم حقوق حقوق کا شور چاروں طرف سے سن رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو تو جیسے حقوق منوانے کے علاوہ کوئی اور کام ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ قوسم برباد ہو تو بیشک ہوا کرے، ملک دشمنوں کے قبضے میں چلا جائے تو بالکل پرواہ نہیں لیکن حقوق کا مطالبہ ہر شخص کی زبان پر ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کسانوں کے حقوق ،مزدوروں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، طلباء کے حقوق غرض حقوق ہی حقوق کا شور ہے۔ نیز یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ بے شمار انجمنیں، سیاسی پارٹیاں اور نام نہاد فلاحی ادارے ہر ملک میں لوگوں کو بیوقوف بنا کر ان سے روپے بٹورتے اور اپنی بلڈنگیں بنواتے ہیں اور انہیں ہر آن نئے نئے چکمے دیتے رہتے ہیں کہ ہم تمہارے حقوق کے پاسبان ہیں۔ ہمارے ساتھ تعاون کرو تو تمہیں تمہارے حقوق ہم ضرور دلوائیں گے۔ لیکن حقوق کے ساتھ ساتھ ایک اور لفظ بھی کبھی کبھی سننے میں آتا ہے اور وہ ہے فرائض کی ادائیگی جس کی طرف ہنگامہ کرنے والوں کا دھیان کبھی نہیں جاتا حالانکہ حقوق وفرائض دونوں لازم وملزوم ہیں اور ان دونوں کو جدا نہیں کیا جاسکتا ورنہ معاشرہ کا توازن بگڑ جائے گا۔

حقیقت یہی ہے کہ اگر حقوق کا نعرہ لگانے والے اتنا ہی زور فرائض کی ادائیگی پر دیں تو معاشرہ میں امن اور خوشحالی کا دور دورہ ہوسکتا ہے۔ آج کل کالجوں میں یہ وبا عام ہے کہ ذرا سی بات ہوئی اور حقوق حقوق کے نعرے لگاتے ہوئے لڑکے سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور پھر توڑ پھوڑ، گھیراؤ جلاؤ اور فتنہ وفساد کا وسیع۔ ہنگامہ شروع ہوجاتا ہے حتیٰ کہ حکومت کی مشینری بھی اسے کنٹرول کرنے میں عاجز آجاتی ہے۔ ایسے لوگ اس طرف بالکل دھیان نہیں دیتے کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں اور کیا یہ سب ایک مسلمان کے کام ہیں۔ اور کیا وہ ملک کا نقصان نہیں کر رہے۔

حرف آخر

سب سے قبل تو اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے کہ محض اسکے فضل اور احسان کی بدولت خاکسار اپنی اس حقیر کوشش کو مکمل کر پایا ہے اور حسب توفیق اس مقالہ میں اسلامی تعلیمات کے امتیازات کو مختصراً تحریر کر پایا ہے۔ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ

ان تمام حوالہ جات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مردوزن کے حقوق کے تعلق سے دنیا کا کوئی بھی مذہب اسلام کی تعلیمات کی برابری نہیں کرسکتا اور کرے بھی کیسے جب ان میں سے کوئی بھی مذہب اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہا ہے اور ان کی آسمانی کتب اب انسانی تحریف کے باعث محض غلطیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہیں کیونکہ اسلام کو چھوڑ کر باقی تمام مذاہب ایک مختص زمانہ اور ایک خاص علاقہ کے لئے ہی تھے، اور اسلام یونی عالمگیر مذہب کے آنے کے بعد ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انکی حفاظت کا کوئی عہد بھی نہیں کیا تھا لیکن اسلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد تا قیامت ہے کہ وہ اس کی حفاظت کریگا اور قرآن کریم کو انسانی تحریف سے محفوظ رکھے گا۔

پس ان اگر کہیں نجات ہے تو صرف اسلام میں ہے۔ اور اگر حسین وخوشحال معاشرہ جس میں ہر طبقہ کے انسان کو اسکے جائز حقوق ملتے ہوں، کی بنیاد کے لئے کوئی لائحہ عمل ہے تو وہ صرف و صرف اسلام ہی کے پاس ہے اور کسی مذہب کے پاس نہیں لیکن اس لائحہ عمل کا حقیقی فائدہ تبھی ہوگا جب ہم اسلام کو محض قولی رنگ میں قبول نہیں کریں گے بلکہ اس کی ہر ایک تعلیم کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ کیونکہ صرف مسلمان کہلانے سے اور محض قرآن کریم کے الفاظ خوش الحانی کے ساتھ پڑھ پڑھنے سے ہم حقیقی اسلامی معاشرہ قائم نہیں کر سکتے۔

پس آج ہی سے بلکہ ابھی سے ہم سب کو یہ قصد کرنا چاہئے کہ ہم قال اللہ اور قال الرسول کے مطابق اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں کے تمام جائز حقوق ادا کریں گے اور اپنی زندگیوں کو اِن تعلیمات کے مطابق ڈھالیں گے اور حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی بھی کامل طور پر بجا

آوری کرنے والے بنیں گے اور اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ اگر ہم دوسروں کے حقوق ادا نہیں کریں گے تو اُن سے کس طرح یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے حقوق ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار اپنے اس مقالہ کو اختتام کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے کہ:۔

اے رحیم وکریم خدا۔ ہم نے تیرے برگزیدہ رسول حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی منادی کو سنا اور اس پر ایمان لائے اور تیرے پیارے رسول کے حکم کے مطابق آخری زمانہ میں آنے والے مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام کو بھی قبول کیا اور اُس تک تیرے رسول کا سلام پہنچایا۔

اے اللہ ہم سب کو اپنی نعمت عظمیٰ یعنی اسلام پر کماحقہٗ عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور ہمیں اسلام کے تمام احکامات پر عمل کرتے ہوئے ایک حسین و پُرامن معاشرہ کو قائم کرنے کی توفیق دے۔ نیز وہ لوگ جو ابھی تک تیرے آخری دین اور آخری شریعت سے محروم ہیں اور تعصب کے پردے ان کی نگاہوں پر پڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ اسلام کا حسین چہرہ نہیں دیکھ پا رہے، اے اللہ ان کے دلوں کو بھی کھول دے اور ان کو ہدایت کے اس آخری اور کامل چشمہ سے سیراب کرے تا کہ دنیا میں جو بدامنی اور بےچینی پھیلی ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے اور دنیا اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے سلامتی اور سکون کی جا بنے۔ آمین ثم آمین

محمد کاشف خالد

ولد مولوی عطاء الرحمٰن صاحب خالد

مجلس خدام الاحمدیہ قادیان، حلقہ دار السلام کوٹھی

فون نمبر:- 8699360396

kashifqdn@gmail.com

www.deathofjesus.tk